جلد دوم | شمارهٔ اول
جنوری سنہ ۱۹۳۸ء | اسفندار سنہ ۱۳۴۷ف

مجلّہ طیلسانین

مجلس علمیہ طیلسانین عثمانیہ کا سہ ماہی رسالہ

زیر ادارت

ناشر

مجلس علمیہ طیلسانین عثمانیہ گھانسی بازار
حیدرآباد دکن

مجلّۂ طیلسانین

۱۷۲۰۵

۱۔ یہ مجلس علمیہ طیلسانین عثمانیہ کا سہ ماہی علمی و ادبی رسالہ ہے، جو جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر مطابق بہمن، اردی بہشت، امرداد، آبان میں شایع ہوگا۔

۲۔ اس رسالے میں طیلسانین عثمانیہ کے علمی و ادبی مضامین، بلند پایہ نظمیں، اور وہ تحقیقی مقالات بھی بالاقساط شایع ہونگے جو جامعہ عثمانیہ کی ام اے اور ام یس سی کی ڈگریوں کیلیے قبول کیے گئے ہیں۔ نیز انجمن طیلسانین عثمانیہ کی علمی سرگرمیوں کی روداد بھی پیش کی جائیگی۔

۳۔ مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور دل آزار تنقیدیں کسی صورت قابل اشاعت متصور نہ ہونگی۔

۴۔ رسالے کی ضخامت کم سے کم (۱۲۵) صفحے ہوگی۔

۵۔ سالانہ چندہ پیشگی خریداران بلدہ سے ۱۲/ اور خریداران اضلاع سے ۱۲/ بشمول محصول ٹپہ۔

۶۔ زرِ چندہ اور تمام مضامین نظم و نثر معتمد کے نام بھیجے جائیں اور دیگر امور کیلیے منتظم اعزازی سے مراسلت کی جائے۔

مجلّہ طیلسانین

فہرست

مطبوعہ

مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس
حیدر آباد دکن

اداریہ

اس نمبر سے مجلۂ ہذا کی دوسری جلد شروع ہو رہی ہے اور جیسا کہ سابقہ اشاعت میں ظاہر کیا گیا تھا کہ مجلے کو صوری اور معنوی، دونوں حیثیتوں سے جاذبِ نظر اور مفیدِ عام بنانے کی کوشش جاری ہے۔ اس نمبر میں ادبی اور تاریخی مضامین کے علاوہ لاسلکی پیام رسانی پر جو عہدِ حاضر کی ایک حیرت انگیز اور بہت ہی کارآمد ایجاد ہے، مولوی فیض محمد صاحب صدیقی کا ایک دلچسپ اور سلیس مقالہ بھی شایع کیا جا رہا ہے۔ اس قسم کے مضامین آیندہ اشاعتوں میں بھی شایع ہوتے رہیں گے جو اُمید ہے کہ دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔

گزشتہ اشاعتوں میں "کلامِ فانی" پر جو تنقیدی مضمون مسلسل شایع ہوا ہے اس نے بعض حلقوں میں بہت ہی بے چینی پیدا کر دی۔ اگرچہ مجلسِ ادارت کی طرف سے بار بار اس کا اظہار ہوتا رہا کہ اس کا مقصد محض ادبی نقد و نظر ہے۔ شاعر کی اور خوبیوں پر پردہ ڈالنا یا ان سے انکار کرنا مقصود نہیں۔ لیکن بعض "پرستارانِ فانی" نے بجائے اس کے کہ اس تنقید کا جواب دیتے، مجلے پر بے تکے اور مہمل اعتراضات کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ ایک صاحب نے بڑی جرأتِ رندانہ سے کام لے کر اخبارِ "پیام" میں یہ اعتراض فرمایا کہ مجلے کے مضامین اور خصوصاً اس کے اداریے کی زبان بہت مشکل اور ادق ہوتی ہے، اور یہ کہ اس میں غلطیوں کی بھرمار ہوتی ہے"۔ ہم اس قسم کے واہی تباہی حملوں کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتے البتہ اتنی گزارش

ضرور کریں گے کہ ہر مضمون کی زبان اور انداز بیان جداگانہ ہوتا ہے۔ علمی مضامین "لیلیٰ کے خطوط" یا "مجنوں کی ڈائری" یا "ہندی کلام" نہیں ہوتے۔ ان کی زبان میں علمیت اور سادگی ضروری ہے۔

جنوری سے "ادارۂ ادبیات" نے ایک عام پسند رسالہ "سب رس" کے نام سے ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور کی نگرانی اور صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش کی ادارت میں جاری کیا ہے۔ ادارۂ مذکور کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا ان صفحات میں قبل ازیں بھی ذکر کیا جاچکا ہے۔ امید ہے کہ یہ نئی کوشش بھی ملک کے عام علمی مذاق کو بہتر بنانے میں کامیاب ثابت ہوگی۔

جنوری کے اوائل میں مسلم کلچر سوسائٹی کے زیر اہتمام ہندوستان کے شاعر اعظم سر اقبال کی سالگرہ کا جلسہ بہت ہی شاندار پیمانے پر منایا گیا۔ حضرت ولی عہد شہزادۂ برار نے اپنی ادب نوازی سے بہ نفس نفیس اجلاس اوّل کی صدارت فرمائی۔ دوسرا اجلاس حیدرآباد کے مشہور علم دوست اور شعر نواز امیر مہاراجہ سر کشن پرشاد یمین السلطنت کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ان دونوں اجلاسوں میں حیدرآباد کے ذی علم نوجوانوں نے مضامینِ نظم و نثر کے ذریعے شاعرِ اعظم کا خراجِ تحسین ادا کیا۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ قابلِ شکریہ ہیں کہ ان کی ان تھک کوشش سے یہ جلسے بہت ہی کامیاب رہے۔

طیلسانیٔ عثمانیہ سے

رحمت کے سحاب آئے خس و خاشاک پہ برسے
خالی ہی رہی روح تری نورِ سحر سے
نالے ترے واقف نہ ہوئے بامِ اثر سے
ہستی کو جلا سوزِ دلِ اہلِ نظر سے

تو کرمکِ شب شعلۂ بیباک نہیں ہے
تیرا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

کیا چہرۂ فطرت پہ بھی ڈالی ہیں نگاہیں؟
کس وقت گلستاں میں مہکتی ہیں ہوائیں؟
دیکھی ہیں کبھی صبح کے سورج کی شعاعیں؟
ہنگامِ سحر بھی کبھی مانگی ہیں دعائیں؟

گر صبحِ سعادت کا پیمبر نہیں ہوگا
اونچا کبھی دنیا میں ترا سر نہیں ہوگا

افلاک پہ چھائی ہیں گہربار گھٹائیں
بادل سے سدا برق دکھاتی ہیں ادائیں
ہر روز مچلتی ہیں طربناک ہوائیں
سو پیار کرن لیتی ہے غنچوں کی بلائیں

درِ بخششِ فطرت کا کبھی بند نہیں ہے
افسوس یہ ہے تو ہی غرض مند نہیں ہے

گونگے کے مقدر میں نہیں لطفِ فصاحت
معذور کی قسمت رہی محرومِ ذہانت
پتھر کو عطا ہو نہ سکا جوہرِ الفت
جو شے کہ ہوا دل اُن کو عطا قدرتِ فطرت

بے ذوقِ نمو غنچہ کبھی کھل نہیں سکتا
گر پیاس نہ ہو آبِ بقا مل نہیں سکتا

فہرستِ شجاعاں میں ترا نام نہیں ہے — فطرت کا ترے واسطے انعام نہیں ہے
تو مرغِ قفس مرغِ لبِ بام نہیں ہے — تیرے لیے حسنِ سحر و شام نہیں ہے

نصرت کا صلہ صرف بہادر کے لیے ہے
آسایشِ ساحل تو شناور کے لیے ہے

گر اپنے مصائب پہ نظر کر نہ سکے گا — تو اپنی شبِ غم کی سحر کر نہ سکے گا
دنیا کے تلاطم میں بسر کر نہ سکے گا — زنہار مہم قوم کی سر کر نہ سکے گا

ہے خوفِ سفر دل میں تو منزل میں چلا جا!
ڈرتا ہے اگر لو سے تو محمل میں چلا جا!

غمگیں نہ ہو، ادبار کی چھٹ جائیں گے بادل — میلی نہ ہو آنکھ اور نہ ابرو پہ پڑے بل
اقدام تو کر دہر میں پڑ جائے گی ہلچل — مفتاحِ درِ عیش ہے تدبیرِ مسلسل

تفریقِ شب و روز کوئی بات نہیں ہے
تقویمِ دلاور میں کوئی رات نہیں ہے

اک تیر کی مانند بلاؤں سے نکل جا! — سیماب صفت جلد ہر اک سانچے میں ڈھل جا!
بدلی ہے زمانے کی فضا تو بھی بدل جا! — طوفاں کی دوا یہ ہے کہ موجوں کو نگل جا

ٹھوکر جو لگے راہ میں خاموش نہ چل دے!
گر امن کا طالب ہے تو فتنوں کو کچل دے!

سید سکندر علی وجد

بی اے (عثمانیہ) ایچ سی ایس

گولکنڈہ کی عظمت

"یہ مضمون گذشتہ کانفرنس طیلسانئین جامعہ عثمانیہ میں پڑھا گیا تھا"

گولکنڈہ کی دو سو سال کی تاریخ ہے۔ دکن کی اور ہمسر سلطنتوں کے ساتھ پندرھویں صدی کے آخری عشرہ میں اس کی داغ بیل پڑی تھی اور سترھویں صدی کے اواخر میں اس کا رشتۂ حیات منقطع ہوا۔ یہ تلنگانہ کی سلطنت تھی اور اس طرح یہ ہندوستان کے عظیم الشان تمدنی مرکزوں اور شاہراہوں سے اس قدر دور تھی کہ اس کا بہت سوں کو علم نہیں تھا اور اب بھی ہندوستان کی تاریخ لکھنے والے بادل ناخواستہ اس کا ذکر کردیتے ہیں اور بہ مشکل اس کو تاریخ ہند کے ایک گوشہ میں جگہ دیتے ہیں۔ وسط ایشیا کے تاجر صرف ہیروں کی وجہ سے اس کو یاد کرلیتے تھے۔ باہر کے سیاح سرراہے اس کے کھنڈر دیکھنے کے لیے آجاتے ہیں۔ حیدرآباد کے رہنے والے اس سلطنت کو زروجواہر کے ان دفینوں کی وجہ سے یاد کرلیتے ہیں جن کو قطب شاہوں نے اڑے وقت کے لیے اندوختہ کیا تھا لیکن گہری نظر سے دیکھا جائے تو سلطنت گولکنڈہ آندھرا دیش کی بہت بڑی سلطنت تھی۔ اس کی وہ تاریخ ہے جس کے ہر مدوجزر میں تمدن کی بڑی حقیقتیں پوشیدہ ہیں یہ وہ سلطنت تھی جس کا خوشگوار تمدن دو سو سال تک تلنگانہ کے رہنے والوں کو گرویدہ کیے ہوئے تھا اور مغربی سیاحوں کی آنکھیں چکاچوند ہو جاتی تھیں۔ اس کے کھنڈروں میں نہ صرف زروجواہر کے دفینے ہیں بلکہ قیمتی تمدن کی نشانیاں بھی ہیں۔ اطالوی سیاح توی نے گولکنڈہ کا نظارا فروز مرقع کھینچکر لکھا تھا کہ "یہ ہے وہ گولکنڈہ جو تین صدیوں تک ہندوستان کا عجوبہ بنا ہوا تھا"

گولکنڈہ کی سلطنت بڑے آب و تاب کے ساتھ قائم کی گئی تھی اور اس کی تعمیر میں وہ نصب العین شامل تھا جو ایک متمدن سلطنت کے لیے ضروری ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس سلطنت کی تاسیس اور تعمیر ایسے ہاتھوں سے ہوئی تھی جو دنیا کے بڑے تاریخ ساز تھے اور بہت بڑی خاندانی روایات کے ساتھ تلنگانہ میں آئے تھے۔ سلطان قلی قطب شاہ اس سلطنت کا بانی ہے جس کو اہل گولکنڈہ "بڑے ملک" کے مقبول عام نام سے یاد کرتے تھے۔ اس کے ذاتی اوصاف یعنے بلند پایہ علمیت اور تجربہ کے ساتھ خاندانی اعزاز و وجاہت بھی شامل تھی۔ ترکستان کے مشہور قراقونیلس قبیلہ سے اس کا تعلق تھا جس نے جہاں شاہ اور سکندر ثانی جیسے جلیل القدر حکمران پیدا کیے تھے۔ خود سلطان قلی کے باپ دادا ہمدان کے والی رہ چکے تھے اور اس طریقہ سے سلطنت کی خاندانی روایات اس کے شامل حال تھیں۔ اس کے علاوہ سلطان قلی پہلے بہمنیوں کی عظیم الشان سلطنت کا حلقہ بگوش رہ چکا تھا جو اپنے بلند پایہ تمدن سے دنیا کو گرویدہ کئے ہوئی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ جس وقت سلطان قلی بیدر آیا تھا اس سلطنت کا سفینۂ حیات بڑے سخت منجدھار میں تھا تاہم اس سلطنت نے ہندوستان کی تاریخ میں اپنے خوشگوار تمدن کے ایسے گہرے نقوش چھوڑے ہیں جو کبھی محو نہیں ہو سکتے۔ تمام قطب شاہی سلاطین اس تمدن کے خوشہ چیں تھے۔ سلطان قطب شاہ نے اپنے فیاض مربی محمود شاہ بہمنی کے دربار سے حکمرانی کے بہت سے تجربے سیکھے تھے اور ظاہر ہے کہ دکن کے لیے جس خاص سرمایۂ سیاست کی ضرورت تھی وہ صرف بہمنی دربار سے حاصل ہو سکتا تھا۔ سیاست کے اس زرین سرمایہ کے ساتھ سلطان قلی قطب شاہ تلنگانہ میں پہلے صوبہ دار کی حیثیت سے آیا تھا اور اس شخص کے لیے جو آیندہ تلنگانہ کا بادشاہ ہونے والا تھا یہ صوبہ داری مفید تھی۔ جب سلطنت قائم ہوئی تو اس کے لیے وہ اسلوب اختیار کیا گیا جو اسکے جغرافیہ اور قدرتی خصوصیات کے مناسب تھا حکومت کی ضبط و تنظیم کی گئی۔ لایق ارباب بست و کشاد مامور کیے گئے اور قلعۂ گولکنڈہ کو سلطنت کا مرکز بنایا گیا اور جہاں تک زمانہ اجازت دے سکتا تھا سلطنت کو جغرافی حدود تک پہنچانے کی کوشش کی گئی۔ اور قلیل مدت میں جدید رعایا کی اس قدر دلجوئی کی گئی کہ اہل تلنگانہ سلطان قلی قطب شاہ کو اپنا بادشاہ

سمجھنے لگے تھے جو سلطنت گولکنڈہ کا خاص امتیاز ہے۔ یعنے شروع ہی سے اس کی بنیاد رعایا پروری اور مذہبی و قومی رواداری پر رکھی گئی تھی۔ اس تمام پیش رفت میں سلطان قلی قطب شاہ کی پختہ کاری ظاہر ہے لیکن اس کے ساتھ اس کا جذبۂ وفاداری بھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونا چاہیئے۔ جب تک سلطان محمود شاہ بہمنی زندہ تھا اس وفادار صوبہ دار نے خودمختاری کا اعلان نہیں کیا حالانکہ بہمنی سلطنت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر شمال کے تمام صوبہ دار خودمختار ہو رہے تھے اور خود سلطان قلی کو بھی خودمختاری کی ترغیب دیتے تھے لیکن سلطان قلی نے اپنے مربی کی زندگی تک خودمختاری کی جراءت نہیں کی۔ مسجد صفا کا کتبہ سلطان قلی کی وفاداری کی بڑی یادگار ہے جس کو پڑھنے کے بعد اس کی وفاشعاری میں ذرہ برابر شبہ نہیں ہو سکتا۔ نیز فرشتہ نے لکھا ہے کہ جب بریدیوں کی ناعاقبت اندیشی اور بے وفائی نے محمود شاہ بہمنی کو اس قدر جکڑ دیا کہ وہ اپنی روزمرّہ ضروریات کے لیے محتاج ہو گیا تو سلطان قلی گولکنڈہ سے پانچ ہزار ہون بادشاہ کی خدمت میں بھیجتا تھا۔ اس سے زیادہ اس کی وفاداری کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے؟

سلطنت کی داغ بیل ڈالنا ہی سب کچھ نہیں ہے بلکہ اہل ملک کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کا سامان پیدا کرنا اور ملک میں تمدنی ذخائر جمع کرنا سلطنت کا حقیقی نصب العین ہوتا ہے۔ ابراہیم قطب شاہ اور محمد قلی قطب شاہ جو گولکنڈہ کے معمار ہیں اس کام کے لیے ودیعت تھے۔ گولکنڈہ کی تاسیس ہو چکی تھی، اب اس سلطنت کو ارتقائے تمدن کی شاہراہوں پر ڈالنا تھا۔ ابراہیم قطب شاہ نے ارتقائے تمدن کا ایک خاکہ تیار کیا اور اس کے راستے ڈالدیئے۔ اس کے لایق جانشین محمد قلی قطب شاہ نے اس کی تکمیل کی۔ زراعت کا انتظام کیا گیا۔ پانی کے خزانے بنائے گئے جو تمام تلنگانہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ شہروں کی تعمیر کر کے اہل تلنگانہ کی تمام ذہنی اور اخلاقی قوتیں ایک جگہ جمع کر دی گئیں تاکہ اس سرچشمہ کی سوتیں ملک کے تمام طول وعرض میں پھیل سکیں۔ مسجدیں بنائی گئیں اور مدرسے قائم کیے گئے۔ باغ و عمارات کے ذریعہ فنون لطیفہ کی اس قدر خدمت کی گئی کہ اس کی ہندوستان میں بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ مغربی سیاح اس حقیقت کی شہادت دیتے ہیں۔ سلطان محمد قطب شاہ کا عہد اس دور ترقی کا تتمہ تھا۔

سلطان محمد نے اپنی پاکیزہ زندگی اور زہد و تقویٰ سے اس سلطنت کو چار چاند لگا دیئے تھے۔
یہ عجیب خوشگوار اتفاق تھا کہ سلطان محمد کی شادی محمد قلی قطب شاہ کی مشہور بیٹی حیات بخشی بیگم سے ہوئی تھی جو گولکنڈہ کی ہیروئن ہے۔ یہ ایسا مبارک سنجوگ تھا کہ اس کی برکتیں برسوں تک اہل گولکنڈہ کو فیضیاب کرتی رہیں۔ حیات بخشی بیگم نے نہ صرف خاندانی فرائض انجام دیئے بلکہ اپنے شوہر کے انتقال کے بعد ۴۰ سال تک گولکنڈہ کی سیاسی رہنمائی بھی کی اور گرتی ہوئی سلطنت کو بچایا۔ ۱۶۲۶ء کے بعد جب سلطان محمد کے ساتھ دکن کے تمام رہبر دنیا سے رخصت ہو گئے اور مغلوں کی گھٹائیں چوطرف سے چھانے لگیں تو قطب شاہی خاندان کی یہ ہیروئن تنہا گولکنڈہ کے لیے سینہ سپر تھی۔ جب ۱۶۵۶ء میں اورنگ زیب کی فوجوں نے گولکنڈہ کا محاصرہ کر لیا اور تمام ارباب سیاست بے دست و پا ہو کر رہ گئے تو اسی ہیروئن نے گولکنڈہ کو بچانے کی کوشش کی تھی۔ یہ اورنگ زیب کے کیمپ میں آگئی اور محاصرین سے مردانہ وار گفتگو کر کے بیچ بچاؤ کیا۔

اگرچہ عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن قطب شاہ کا عہد سیاسی اعتبار سے بہت ہمت شکن ہے کیونکہ اس دور میں خود گولکنڈہ کا اخلاقی انحطاط اور کچھ مغل حکومت کی بیجا دست درازیوں سے تمام سیاسی زمینیں خشک اور دماغ معطل ہو کر رہ گئے تھے لیکن اس کے باوجود گذشتہ روایات فنا نہیں ہوئیں۔ تمدنی کام برابر ہوتا رہا۔ اس افراتفری کے زمانہ میں جبکہ ۱۶۵۶ء شہنشاہ اورنگ زیب کی فوجوں نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا تھا گولکنڈہ نے اپنی روایتی خودداری اور الوالعزمی ہاتھ سے جانے نہیں دی۔ مغل افواج کے مقابلہ میں اہل قلعہ نے اس قدر دل کھول کے مدافعت کی کہ شہنشاہی طاقت کے باوجود قلعہ کی تسخیر کے لیے آٹھ مہینوں سے زیادہ لگ گئے اور تسخیر بھی اس طرح ہوئی تھی کہ چند بیوفاؤں نے قلعہ کے دروازے کھول دیئے تھے لیکن اس حوصلہ فرسا ماحول میں بھی گولکنڈہ میں اکثر افراد ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنی روایتی وفاداری کے لیے اپنی عزیز جان سے بھی دریغ نہیں کیا۔ گولکنڈہ کے محاصرے کے ساتھ دکن کے ہیرو عبدالرزاق لاری کا نام ہمیشہ یادگار رہے گا جس نے اپنے بادشاہ ابوالحسن قطب شاہ کے لیے ہر قسم کی قربانی کی۔ رات کی تاریکی میں جب دشمن قلعہ میں گھس آئے تو عبدرزاق دیوانہ وار دشمن کی تلوار پر دل ہر گر گیا جب تک اس کے ہوش و حواس برجا تھے

تا جان دارم نثار راہ ابوالحسن خواہم نمود"[1] کی دل ہلا دینے والی آواز دور دور تک سنائی دیتی تھی اور سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ اس انتشار میں جبکہ قلعہ کے اندر ہر طرف بدحواسی طاری ہوگئی ابوالحسن قطب شاہ کا اطمینان قلب ایک حیرت انگیز واقعہ ہے۔ جب شہنشاہی افسر اعتبار خاں اور روح اللہ خاں اس کو گرفتار کرنے کے لیے آئے تو انھوں نے حیرت سے دیکھا کہ ابوالحسن اپنی شاہی نشست پر بیٹھا ہوا ہے اور اس کے چہرہ سے ذرہ برابر پریشانی ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ اس نے پوری دلجمی کے ساتھ گفتگو کی، اپنے تمام معمولات پورے کیے اور اتفاق یہ ہے کہ اس اثنا میں اس کے کھانے کا وقت بھی آگیا تو حسب عادت کھانے میں شرکت کی گئی اور دسترخوان پر دوست و دشمن سب بٹھائے گئے اور گفتگو کے دوران میں ان مغل افسروں نے پوچھا کہ کیا بات ہے کہ آپ اس قدر خاطر جمع معلوم ہوتے ہیں۔ ابوالحسن نے کہا کہ پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ خدا نے مجھے یہ عزت دی تھی وہ اس کو واپس لینا چاہتا ہے۔ قدرت کے اس فیصلہ کے مقابلہ میں ہر شخص کو سر تسلیم خم کرنا چاہیئے۔[2] اگرچہ انھیں مغل افسروں نے ہندوستان میں ایسے بے شمار بدقسمت تاجداروں کو گرفتار کیا تھا لیکن یہ بلند کردار سوائے گولکنڈہ کی دیواروں کے کسی جگہ نہیں پائے گئے۔ جس طرح سلطنت گولکنڈہ کی تاسیس ایک بلند پایہ اخلاق کی روشنی میں ہوئی تھی اسی طرح اس کا خاتمہ بھی خودداری اور اولوالعزمی کا سچا مظاہرہ تھا۔

قطب شاہ بہت بڑے تمدن کے شمع بردار تھے۔ ان تاجداروں نے نہ صرف ترکستان اور بیدر کے تمدنی ذخائر سے اپنا سرمایہ حاصل کیا تھا بلکہ اس کو تلنگانہ کے نئے ماحول میں مقامی عناصر کے ساتھ کچھ اس طرح مرکب کیا تھا کہ یہ ایک نئی چیز معلوم ہوتی تھی۔ ان لوگوں نے اس بات کو بہت جلد سمجھ لیا تھا کہ ان کی سلطنت تلنگانہ میں ٹھیٹ ترکستانی اور بہمنی نہیں ہو سکتی بلکہ اس میں مقامی عناصر بھی اس طرح شامل ہونے چاہئیں کہ یہ اس سرزمین کی

---

[1] ۔ خافی خاں، جلد دوم صفحہ ۳۶۲۔
[2] ۔ " " " ۳۶۷۔

خصوصیات کا پورا جواب دے سکے۔ سچ پوچھو تو سلطنت گولکنڈہ کا سرمایۂ افتخار یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو تلنگانہ کی قومی خصوصیات کے ساتھ کچھ اس طرح پیوست کر دیا کہ نصف صدی کے بعد یہ ایک آندھرا راجدھانی معلوم ہونے لگی اور شاہان قطبیہ آندھرا راجگان معلوم ہوتے تھے۔ چونکہ گولکنڈہ کی سلطنت صرف تلنگانہ کے حدود پر قائم تھی جس میں ایک جغرافیہ اور ایک قوم تھی اس لیے قطب شاہی حکومت کے لیے اس ملک کی خصوصیات اور جذبات کی صحیح پیمایش کر کے اس کی تمدنی تعمیر کرنا آسان تھا۔ اس ملک میں انھوں نے ہر قسم کی تعمیر کی۔ سچی بات یہ ہے کہ قطب شاہی خاندان کا تلنگانہ میں آنا اس ملک کے لیے آیۂ رحمت ثابت ہوا۔ اس کے یہاں آنے سے تلنگانہ کے جسد مُردہ میں زندگی کی ایک رو دوڑ گئی۔ اس خاندان نے آندھرا قوم کو آگے بڑھایا۔ ان کی زبان کو ترقی دی اور اس میں بہت بڑا ادب پیدا کیا اور تمدنی ترقی کے تمام راستے کھول دیئے اور غالباً یہ تلنگانہ کا سُنہری زمانہ تھا۔

حکومت کی ضبط و تنظیم میں گو سلطنت بہمنی کا چربہ اُتارا گیا تھا لیکن مقامی حالات کا بھی پورا لحاظ تھا۔ سلطنت کا وقار مرکزی حکومت کے رُعب داب سے ہوتا ہے۔ قطب شاہی دربار جو بادشاہ اور اس کے وزراء اور اُمراء پر مشتمل ہوتا تھا عجیب شان رکھتا تھا۔ بادشاہوں کا جلوس جبکہ اُمراء و وزراء ہم رکاب ہوتے تھے اور اس کے ساتھ فوجوں کی قطاریں ہوتی تھیں خاص کیفیت پیدا کرتا تھا۔ باہر کے لوگ اس کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتے۔ مغربی سیاح شاہی دربار اور جلوس کی شان و شوکت کو اس قدر دلچسپی اور حیرت سے بیان کرتے ہیں کہ یہ چیز کہیں ان کے مشاہدہ میں نہیں آئی اور یہ گولکنڈہ کے لیے خاص تھی۔ اہل حیدرآباد کو وہ رُعب اور نظّارہ بھی یاد ہے جبکہ بادشاہ شاہ نشین پر بیٹھتے تھے اور تمام قطب شاہی افواج قلعہ کے مشرقی دروازہ سے داخل ہو کر شاہی سلام کی عزت حاصل کرتی تھیں۔ گولکنڈہ کا سیاسی وقار اس بات میں تھا کہ قطب شاہی سلاطین اپنی سلطنت کی کارکردگی اور اس کے رکھ رکھاؤ کا پورا لحاظ رکھتے تھے۔ وہ خود بھی قابل پڑھے لکھے تھے اور اس کے علاوہ وہ اپنی پوری مردم شناسی صرف کر کے سلطنت کی رہنمائی کے لیے بہترین ارباب حل و عقد جمع کرتے تھے۔ گولکنڈہ کے وزراء کی بھی ایک بہت بڑی فہرست ہے جس میں غیر معمولی قابلیت کے افراد تھے۔ حضرت مومنؒ استرآبادی

اور حضرت حسین شاہ ولیؒ کی علمی اور عملی قابلیت نہ صرف دکن میں مشہور تھی بلکہ مشرقی ممالک میں ان کے چرچے تھے۔ ان وزراء نے گولکنڈہ کی ذہنی اور مادی ترقی میں جو حصہ لیا ہے اس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔

غالباً قطب شاہوں کی یہ اخلاقی اور سیاسی عظمت ان الفاظ سے ظاہر ہوتی ہے جو سلطان محمد قطب شاہ کی تخت نشینی کے وقت کہے گئے تھے۔ اس مبارک تخت نشینی کے وقت حضرت مومنؒ استر آبادی نے جو سلطنت کے پیشوا تھے ایک قصیدۂ تہنیت پڑھا تھا جو ان تمام ترقیوں کا خلاصہ ہے:-

با محبت باز بستم عہد و پیمانِ نوی	کہنہ جامے می فشانم پیش جانانِ نوی
سرمہ شد خاکِ تلنگانہ ز فرخ پائے تو	اے فدائے خاکِ پایت ہر زمان جانِ نوی
گر صفاہاں نو شد از شاہجہاں عباس شاہ	حیدر آباد از نو شد شاہا صفاہانِ نوی

یہ ہم بھول جاتے ہیں کہ قطب شاہی خاندان بھی کبھی علم کا سچا پرستار تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ بیجاپور کے ساتھ ساتھ اس خاندان نے بھی علمی اور ادبی سرمایہ میں بیش بہا اضافے کیے تھے۔ یوں تو اس خاندان کے تمام سلاطین ذی علم تھے۔ فارسی کے اچھے عالم اور شاعر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے گولکنڈہ کی سلطنت قائم ہوئی تھی تلنگانہ میں علم کی بساط بچھ گئی، یہاں دور دور سے آکر علماء جمع ہونے لگے۔ بہمنی سلطنت کی طرح گولکنڈہ بھی اہل علم کی پناہ گاہ بن گیا۔ لیکن اس خاندان کے آخری چار سلاطین دنیائے علم و ادب کے مشاہیر ہیں جنھوں نے علم و ادب کی غیر معمولی سرپرستی کی۔ یہ سرپرستی نہ صرف فارسی زبان اور تلنگی کی ترقی کا باعث ہوئی بلکہ ان کی علم نوازی نے ایک طرف مقامی زبان تلنگی کو فروغ دیا تو دوسری طرف اردو ادب کی بنیاد بھی ڈالی۔ ابراہیم قطب شاہ کو علمی خدمت سے اس قدر گہرا شغف تھا کہ اس نے دنیائے ادب میں ایک ہلچل پیدا کر دی تھی۔ فارسی کے ساتھ تلنگی زبان کی سرپرستی اس کا طغرائے امتیاز تھا۔ اس نے مدرسے قائم کئے تھے جہاں طلباء کو وظیفے اور انعامات دیئے جاتے تھے۔ علماء و شعراء

لہ۔ تاریخ قطب شاہی صفحہ ۱۴۰۔

شاہی محل میں رکھے جاتے تھے۔ محمد قلی قطب شاہ کی علمی شہرت اس سے بھی زیادہ ہے۔ یہ حکمران جس طرح اپنی تعمیر کاری کے لیے مشہور ہے اس سے زیادہ اس کو علمی سرپرستی کی عزّت حاصل ہے۔ یہ بہت بڑا شاعر تھا اس کی شاعری فارسی، اُردو اور تلنگی پر حاوی ہے۔ ہر زبان میں اس کے دیوان موجود ہیں۔ اُدبا جانتے ہیں کہ اس کے اصناف سخن کی گہرائی اور لطافت بڑے بڑے استادوں کو محو حیرت کر دیتی ہے۔ چار مینار کی تعمیر ہوئی تو اس پر بھی مذہبی ضروریات کے ساتھ تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا۔ سلطان محمد قطب شاہ کی زندگی تمام تر علمی خدمت کے لیے وقف تھی۔ اس نے اپنی خاندانی روایت اور اعلیٰ ذوق سے پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ شاعروں اور ادیبوں کی مخلصانہ سرپرستی کی تھی۔ وہ خود بھی شاعر تھا۔ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں اس کے دیوان موجود تھے۔ اگرچہ عبداللہ قطب شاہ کا عہد حکومت مغلوں کے سیلاب کی وجہ سے ہمیشہ منتشر رہا اس وقت یہ توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ اس عہد میں بھی کوئی علمی کام ہو گا لیکن حیرت کی بات ہے کہ وہ علم کی رو بند نہیں ہوئی۔ عبداللہ کو بھی علم کا اچھا ذوق تھا یہ خود بھی شاعر تھا۔ اس کے بھی فارسی اور اُردو میں دیوان موجود ہیں اور عجیب چیز یہ ہے کہ اس کے عہد میں اُردو سلطنت کی مستند زبان بن گئی تھی اور اُردو میں بڑا مواد جمع ہو گیا تھا۔ ابوالحسن قطب شاہ کو سیاسی حیثیت سے بہت بدقسمت ہے لیکن اس کا ادبی ذوق اس کو قید میں بھی شعر گوئی کے لیے مجبور کرتا تھا۔ اگرچہ اس کا کوئی دیوان نہیں ہے لیکن مختلف اشعار ہر جگہ ملتے ہیں اور جب تک وہ برسر حکومت رہا اس نے مقدور بھر علم کی سرپرستی کی۔

ان بادشاہوں کی علم دوستی کا نتیجہ یہ تھا کہ گولکنڈہ اور حیدر آباد میں بے شمار علم و ادب کے خوشگوار حلقے بن گئے تھے۔ دیوان لکھے گئے، تاریخیں لکھی گئیں۔ فلسفہ و منطق پر کتابیں تیار ہوئیں۔ حضرت میر مومنؔ استر آبادی کا استادانہ کلام جو سلطنت کی ہر تقریب پر کہا گیا تھا۔ اب بھی بہت سوں کے زباں زد ہے۔ دکھنی شاعروں کی ایک طویل فہرست ہے جو ایک مستقل مضمون کی طالب ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کے عہد کے شاعر وجہی کو دنیائے اُردو کبھی نہیں بھول سکتی جس نے اپنے مختلف اصناف سخن سے گولکنڈہ کی علمی فضا مسحور کر رکھی تھی۔ اس کی نظمیں سب رس

اور قطب مشتری دکھنی ادب کے شہ پارے ہیں۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد کے شاعر غواصی اور ابن نشاطی اُردو کے بڑے محسن ہیں جو شاہی دربار کی آؤ بھگت سے اپنے کمال کو دنیا کے سامنے پیش کرتے تھے۔ غواصی کا طوطی نامہ اور ابن نشاطی کی پھول بن ادبی بلند پردازی کا بہترین مواد ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ بیجاپور کے مقابلہ میں گولکنڈہ کی علمی خدمات اور ادبی سرمائے زیادہ مستقل اور پائیدار ثابت ہوئے۔ بیجاپور کے خاتمہ کے بعد یہاں کے تمام علمی چراغ گل ہوگئے اور علمی دنیا میں بیجاپور کا کہیں نام نہیں سنائی دیتا۔ لیکن یہ غالباً قطب شاہوں کے بلند حوصلے تھے کہ گولکنڈہ کے زوال کے بعد ان کی علمی روایت باقی رہیں۔ اگرچہ مغلوں کے سیلاب سے گولکنڈہ ویران ہوگیا اور علما و شعرا ملک کو خیرباد کہہ کر ہندوستان کے مختلف حصوں میں نکل گئے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ ٹوٹا ہوا گھر پھر کبھی نہیں جڑے گا۔ لیکن دکن کی خوش قسمتی سے چالیس سال کے بعد ہی سلطنت آصفیہ قائم ہوگئی اور اس کی بدولت گولکنڈہ کی تمام علمی روایتیں محفوظ ہوگئیں۔

اگرچہ قطب شاہوں کی سیاست اور علم نوازیاں ایک افسانہ ہوکر رہ گئیں لیکن ان کے تعمیر کئے ہوئے شہر و عمارات ان کی یاد تازہ کرنے کے لیے اس وقت موجود ہیں۔ پہلے خود گولکنڈہ کو آباد کیا گیا تھا۔ اس میں تمام شہری ضرورتیں بہم پہنچائی گئی تھیں۔ یہ اتنا بڑا شہر ہوگیا تھا کہ دکن کا مشہور مورخ خافی خاں لکھتا ہے کہ "از وسعت آں بہ مرتبہ نقل می نمایند تا پنجاہ ہزار سوار اندرون حصار می گنجند۔ عمارتہائے عالی و دلنشین تا حصار داشت۔" لیکن قطب شاہوں کی بلند خیالی اور گولکنڈہ کی بڑھتی ہوئی آبادی اس بات کی مقتضی تھی کہ قلعہ سے باہر وسیع رقبہ میں ایک بڑے شہر کی تعمیر کی جائے۔ دریائے موسیٰ کی خوشگوار وادی اس کے لیے منتخب کی گئی یہ آندھرا دیش کی مبارک گھڑی تھی جبکہ سنہ ۱۵۹۱ء میں شہر بھاگ نگر کی بنیاد رکھی گئی۔ محمد قلی قطب شاہ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے اس کی بنیاد رکھی تھی اس کا مرکز تقل دریافت کرکے چار مینار کی سی سڈول عمارت قائم کی گئی جس کا دنیا میں کوئی جواب نہیں ہے۔ وہ عجیب دلفریب منظر تھا کہ موضع چچلم کے چھوٹے بڑے معمار تلنگی گیتوں کے کورس میں چار مینار کی تعمیر کرتے تھے اور اس کا مسالا جمع کرتے تھے۔ یہ ایسی خوش آیند تقریب تھی کہ اہل حیدرآباد کو برسوں تک یاد تھی۔ اس سڈول عمارت کو شہر کے بیچ میں تعمیر کرکے

چاروں طرف سیدھی سڑکیں بنائی گئیں۔ سڑکوں کے دونوں طرف بے شمار عمارتیں نکالی گئیں اس کے علاوہ مدارس، شفاخانے، مساجد اور حمام بنائے گئے اور مسافروں کے لیے کاروان سرائیں تعمیر کی گئیں۔ غرض اس شہر میں وہ تمام عمرانی ضرورتیں بہم پہنچائی گئیں جو ایک متمدن شہر کے لیے ضروری ہے۔ یہ قرون وسطیٰ کا اکیلا شہر تھا جس میں زمانۂ حال کی خصوصیتیں پائی جاتی تھیں۔ اس شہر کی کشش لوگوں کو دور دور سے کھینچ لاتی تھی اور محو حیرت کرتی تھی جو سیاح یورپ سے ہندوستان کی سیاحت کے لیے آتے تھے وہ بھاگ نگر کو دیکھنے کے لیے ضرور آتے تھے۔ برنیر، ٹیورنیر اور تھیونو کے سیاحت ناموں سے معلوم ہوتا ہے کہ باہر کے لوگ بھاگ نگر سے کس قدر متاثر تھے۔ حالانکہ یہ سیاح شمال کے عظیم الشان شہنشاہی شہروں کو دیکھ کر آتے تھے جن سے مغل سلطنت کی پوری عظمت ٹپکتی تھی۔ اس کے باوجود شہر حیدرآباد کی تعریف کرنا بہت کچھ حیرت انگیز ہے۔ مورخ فرشتہ نے جس کے زمانہ میں شہر حیدرآباد کی تعمیر ہوئی تھی لکھا تھا۔ "شہرے کہ در شمالی ہندوستان شرقاً و غرباً، جنوباً و شمالاً مثل آں در لطافت و صفا ہرگز یافت نمی شود"[1]، حالانکہ یہ اکبر و جہانگیر کا عہد ہے جبکہ آگرہ اور لاہور جیسے شہنشاہی شہر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود تھے اور ان کی شہنشاہی عظمت کی دور دور تک شہرت تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس نوخیز شہر بھاگ نگر کی آن بان ان سے کہیں بڑھی ہوئی تھی۔ عہد عالمگیری کا مورخ کہتا ہے کہ "خوشنمائے آں شہر، لطافت، آب و ہوائے آں سرزمین و حسنہائے نمکین آں سبز فام و سیر حاصلی آں مرز و بوم اگر پردازم از سر رشتۂ سخن باز میمانم"[2] شہنشاہ اورنگ زیب کا خاص مورخ محمد ساقی جو شہنشاہ کے ساتھ تسخیر گولکنڈہ کے وقت موجود تھا حیدرآباد کی ان الفاظ میں تعریف کرتا ہے۔ "آرامگاہے است بر قطعہ زمین و بہشت راحت جسم و آرام جاں، آبادی وسیع تر از احاطۂ خیال، عمارات رفیع تر از پایۂ اندیشہ، رطوبت ہوا و عذوبت ورد انی چشمہا شادابی سبزہ بہ مرتبہ کہ پنداری

---

[1] تاریخ فرشتہ، مقالہ سوم روضۂ چہارم صفحہ ۱۷۳۔

[2] خافی خاں جلد دوم صفحہ ۳۶۸۔

گل و سبزه ایں سرزمین را آب و رنگ زمرد و لعل است"۔ حالانکہ عالمگیری عہد میں ہندوستان کے شہنشاہی شہروں کی جو حالت تھی وہ سب جانتے ہیں۔ آگرہ و لاہور کے علاوہ شاہجہاں آباد کی دنیا میں شہرت تھی۔ ان سیاحوں کا جو شاہجہاں آباد میں رہ کر آئے تھے حیدرآباد کی اس طرح تعریف کرنا اس شہر کی عظمت کا سچا ثبوت تھا۔ اس زمانہ میں خود اہل حیدرآباد بھی یہ سمجھتے تھے کہ حیدرآباد کے مقابلہ میں ہندوستان کے شہنشاہی شہر بے حقیقت ہیں حیدرآباد کی تعریف میں ایران کے شہروں کی مثال دی جاتی تھی شاہجہاں آباد کا کسی نے نام نہیں لیا۔ چنانچہ سلطان محمد قطب شاہ کی تخت نشینی کے وقت حضرت میر مومنؒ استرآبادی نے اپنے قصیدۂ تہنیت میں کہا تھا ؎

چوں صفاہان نو شد از شاہ جہاں عباس شاہ   حیدرآباد از تو شد شاہا صفاہان نوی

آندھرا سرزمین میں ایسے عظیم الشان شہر کی تعمیر ایک بہت بڑا تمدنی انقلاب تھا۔ اس شہر کی تعمیر سے آندھرا دیس کے تمام طول و عرض میں ایک تمدنی لہر دوڑ گئی۔ اس سرزمین کا جتنا تمدن ہے وہ کچھ تو قدیم سلطنت آندھرا کا دیا ہوا ہے اور باقی قطب شاہوں کا عطیہ ہے۔ اس زمانہ میں بھی حیدرآباد آندھرا کا واحد شہر ہے جو ہندوستان کے بڑے شہروں میں شمار ہوتا ہے۔

قطب شاہوں کا تعمیری کام بھی بڑی عظمت کا حامل ہے۔ قطب شاہوں نے جس ذوق اور سلیقہ سے اپنی عمارتیں بنائی ہیں وہ ان کے عظیم الشان تمدن کی رہنمائی کرتی اور بتاتی ہیں یہ لوگ بہت بڑے تمدن کے پرستار تھے۔ ان کا پاکیزہ ذوق اور بلند خیالی ان کی تمام عمارتوں سے ظاہر ہے۔ عمارتوں پر لاکھوں روپیے اور بڑی محنت صرف کی گئی۔ بعض عمارتیں ایسی بنائی گئیں جو کئی عہدوں میں جاکر تیار ہوئیں۔ اگرچہ ان عمارتوں کے بنانے والے جانتے تھے کہ یہ ان کی مختصر زندگی میں ختم نہ ہوسکیں گی لیکن ان کی بلند خیالی اس بات کو گوارا نہیں کرتی تھی کہ کوئی چیز ان کے حوصلے سے کم بنے۔ چارمینار اور مکہ مسجد تو ایسی عمارتیں ہیں جو دنیا کے عجائبات میں شمار کی جاسکتی ہیں۔ ان کی رفعت و عظمت کا دنیا میں کوئی جواب نہیں۔ مکہ مسجد دنیا کی بہت بڑی

لہ۔ مآثر عالمگیری صفحہ ۳۰۲۔

عمارت ہے۔ سلطان محمد قطب شاہ نے اپنے مقدس ہاتھوں سے اس کی بنیاد رکھی تھی۔ رنگیا مستری اور فیض اللہ بیگ انجنیر نے اس کا کام شروع کیا تھا لیکن ۷۷ سال میں یہ کام ختم ہوا اور یہ اس وقت پایۂ تکمیل کو پہنچا جبکہ اورنگ زیب کی عملداری قائم ہوئی تھی۔ ہزاروں آدمیوں نے اس پر کام کیا ہے۔ اس کی اکیلی محراب جو صرف ایک پتھر سے تراشی گئی ہے پانچ سال میں تیار ہوئی تھی اور پانچ ہزار آدمیوں نے اس پر کام کیا تھا جس وقت فرانسیسی سیاح ٹیورنیر گولکنڈہ آیا تھا ابھی یہ مسجد نا تمام تھی! اسی نامکمل مسجد کو دیکھ کر اس نے کہا تھا کہ اگر یہ پوری ہو جائے تو دنیا میں سب سے بڑی اور ایشیا میں سب سے بہترین عمارت ہوگی[۱]۔ اگر اورنگ زیب کی کفایت شعاری سنگ راہ نہ ہوتی تو آج اس کے مینار سلطان محمد کی حقیقی بلند خیالی ظاہر کرتے لیکن اس کوتاہی کے باوجود حیدرآباد کا یہ "بیت العتیق" قطب شاہوں کی اصل عظمت کو یاد دلاتا ہے! اس وقت دنیا میں کوئی ایسی عمارت نہیں ہے جو ہزاروں ہون کے خرچ کے ساتھ ۷۷ سال کی طویل مدت میں جا کر ختم ہوئی ہو۔ آج بھی حیدرآباد میں یہ واقعہ سب کو یاد ہے کہ زہد و تقویٰ کے بڑے دعوے کے ساتھ اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا۔ اس مقدس رسم تاسیس منانے کے لیے سلطنت کے تمام علماء وزہاد کو دعوت دی گئی کہ وہ سب اس میں شریک ہوں! اور اس مجمع سے کہا گیا کہ رسم تاسیس وہ شخص انجام دے جس کی نماز تہجّد بھی قضا نہیں ہوئی۔ یہ قطب شاہی خاندان کی امتیازی شان ہے کہ اس پورے مجمع میں صرف بادشاہ ہی ایسے تھے جو اس معیار پر پورے اُترے تھے۔ خود سلطان محمد نے یہ کہتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے سنگ بنیاد رکھا تھا کہ "بارہ سال کی عمر سے میری نماز تہجّد بھی قضا نہیں ہوئی ہے۔" چنانچہ اہل مذہب اس بات کا دعوے کرتے ہیں کہ بادشاہ کی یہ معصومیت اس وقت بھی اس مسجد کے در و دیوار سے ٹپکتی ہے اور ۲۴ گھنٹوں میں کبھی یہ مسجد عبادت گذاروں سے خالی نہیں رہتی۔ اسی وجہ سے اس زمانے کے ایک شاعر نے کہا تھا ؎

طوافِ خانۂ اشرف گرت میسر نیست
بیا بہ کعبۂ ملک دکن عبادت کن

---

[۱] سفرنامہ ٹیورنیر جلد اصفحہ ۱۲۴۔

قطب شاہوں کی حقیقی عظمت ان کے محلات سے ظاہر ہوتی تھی ۔ اپنے دو سو سال کی تاریخ میں قطب شاہوں نے اتنے قصر اور محلات بنائے تھے جو دنیا کے کسی شاہی خاندان نے نہیں بنائے۔ خود گولکنڈہ کے اندر جو سلطنت کا بڑا مستقر تھا بے شمار محل بنائے گئے تھے ۔ اِس وقت یاد رکھنے کے لیے اگر چند کے نام گنائے جائیں تو الٰہی محل، محمدی محل و حیدر محل وہ تھے جن پر کئی لاکھ ہون صرف ہوئے تھے ۔ مشک محل اپنی خاص نوعیت کے اعتبار سے علیحدہ شہرت رکھتا تھا۔ اور گولکنڈہ کی ایک تاریخ کے الفاظ ہیں "مثل آں قصر ہا بر روئے زمین بنا نشدہ" سلطان محمد قطب شاہ نے خود کئی محل تعمیر کیے تھے ۔ اس کا بنایا ہوا امان محل اکیلا بہت بڑی تفصیل کا محتاج ہے۔ محل کی آرائش اور اس کے ساتھ جو باغ محمد شاہی بنا تھا اس کی دلچسپیاں سلطان محمد کے حقیقی ذوق کو ظاہر کرتی تھیں ۔ اس کی تعریف میں ایک شاعر نے کہا تھا کہ ؎

وہ چہ باغے کز لطافت ہست چوں باغ جناں وہ چہ قصرے کوز رفعت با فلک بوسد درش

اگر چہ زمانہ کی ستم ظریفی اور مغل حملہ آوروں کی بے دردی نے ان کا خاتمہ کر دیا کئی محل ایسے ہیں کہ جن کا نام و نشان باقی نہیں رہا صرف تاریخوں اور سیاحت ناموں کے صفحات پر ان کے نام دکھائی دیتے ہیں ۔ اس وقت جو باقی رہ گئے ہیں وہ بھی فنا ہو رہے ہیں لیکن ان کے بوسیدہ در و دیوار سے قطب شاہوں کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ عمارتوں کا مسلسل وسیع دالان اور اونچے سقف پانچ پانچ اور سات سات منزلوں تک ان کی بلندی، بادشاہوں اور بادشاہ بیگموں کی رہائش کا شاندار انتظام اور شاہ نشیں کا رُعب الفاظ سے ظاہر نہیں کیا جا سکتا ۔ ان تمام تعمیروں کے ساتھ آب رسانی کا انتظام زیادہ حیرت انگیز ہے۔ تمام محلوں کے اندر نلوں کا جال بچھا ہوا تھا ۔ بلند دیواروں اور چھتوں پر بھی پانی پہنچایا گیا ۔ چھتوں پر بھی پانی کے چشمے بنائے گئے تھے۔

جب شہر بھاگ نگر کی تعمیر ہوئی تو شاہی حکومت اور سلطنت کے کاروبار کے لیے اس نو خیز شہر میں بھی متعدد محل بنائے گئے ۔ منجملہ ان کے داد محل جو معدلت گستری کا مرکز تھا بذات خود ایک مستقل مضمون کا طالب ہے ۔ اس کی رفعت اور شاہی نشست جہاں بادشاہ جلوس کر کے داد خواہوں کی فریاد سنتے تھے ۔ اب بھی بہت سوں کو یاد ہے اور باہر کے

سیاح بڑی دلچسپی اور اچنبے کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے اردگرد شاہی سکونت کے متعدد محلات تھے جو بہت کچھ تفصیل کے محتاج ہیں۔ کمان سحر باطل شاہی دولت سرا کا دروازہ تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہاں ایک قیمتی طلائی دروازہ تھا جس کو حیدرآباد کی تسخیر کے بعد مغل اپنے ساتھ لے گئے۔ اس دروازہ کے مقابل کالی کمان کے پاس نوبت بجتی تھی اور ان دونوں کمانوں کے درمیان شاہی حفاظت کے لیے فوجیں کھڑی ہوتی تھیں اور شاہی رعب و داب میں اضافہ کرتی تھیں۔ ندی کے کنارے ندی محل اور چار محل کے نام سے شاندار قصر بنائے گئے تھے جو دور سے نظر آتے تھے اور دریائے موسیٰ کی روانی کے ساتھ ایک پُرکیف منظر پیدا کرتے تھے۔ گوشہ محل جو سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں تیار ہوا تھا اس کے باقیات اب بھی موجود ہیں۔ اس کے عظیم الشان حوض سے اس محل کی عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ خود مغل بھی جو شاہجہانی عمارات کے رہنے والے تھے قطب شاہی محلات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ گولکنڈہ کی تسخیر کے بعد جب شہنشاہ اورنگ زیب حیدرآباد میں داخل ہوئے تو شہنشاہ نے قطب شاہی محلات کی رفعت اور ذوق تعمیر کو دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا تھا۔ نعمت خان عالی نے جو شہنشاہ کے ہمراہ رکاب تھا عرض کیا کہ بلند ہمت بودند عمارتہائے بلند ساختند"۔ شہنشاہ کی حیرت اور نعمت خان عالی کا جواب قطب شاہی عظمت کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے۔ غالباً مغلوں کو قطب شاہی تمدن کا پہلے سے اندازہ نہیں تھا۔ عینی مشاہدہ نے ثابت کر دیا کہ قطب شاہ بلند ترین تمدن کے حامل تھے۔ جب شہنشاہ کا چھوٹا بیٹا شاہزادہ محمد کام بخش حیدرآباد کا گورنر بنایا گیا تو اس نے قطب شاہی محلات کو چھوڑ کر اپنی سکونت کے لیے علحیدہ مکان تعمیر کر لیا تھا جس کو شہنشاہ اصراف سمجھتے تھے لیکن شاہزادہ نے جواب دیا تھا کہ قطب شاہی محلات میں رہنا اس سے زیادہ اصراف ہے۔ قطب شاہی محلات اس قدر وسیع اور پُرعظمت ہیں کہ ان کی کما حقہٗ پرداخت تو کجا ان میں چراغ جلانا مشکل ہے[1]۔ ایک تیموری شہزادہ کے

---

[1] ۔ گلزار آصفیہ صفحہ ۵۳۔

یہ الفاظ جو شاہجہانی محلات کا رہنے والا تھا بہت معنی خیز ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ قطب شاہی تمدن مغلوں کے معیار سے کہیں بلند تھا۔

ایسے پاکیزہ تمدن کا بالآخر مغل حملہ آوروں کے ہاتھ سے برباد ہونا ایک دردناک سانحہ تھا اور اہل گولکنڈہ کا اس بربادی پر خون کے آنسو بہانا ایک قدرتی بات تھی۔ عبدالرزاق اور اس کے اہل خاندان برسوں تک روتے رہے اور اس المناک نظارہ سے باہر والوں کے قلوب بھی بے چین ہو کر رہ گئے۔ نعمت خان عالی جو فاتح فوج کے ساتھ حیدرآباد آیا تھا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ گولکنڈہ کی اس افسوسناک بربادی پر جو اس کے آنکھوں کے سامنے ہوئی تھی ایک بہت ہی پُردرد مرثیہ کہا تھا جو اپنی درد بھری آواز میں ان مرثیوں سے کم نہیں ہے جو شیخ سعدیؒ نے زوال بغداد پر اور ابن رشد نے زوال اندلس پر کہے تھے :-

دریں ملکِ خراب امروز کس را نیست سامانے
چو گنج افتادہ اند اہل سفر در کنجِ ویرانے

بہ آں حد رسیدہ خلق را افلاس و ناداری
کہ معنی ہم ندارد ایں زماں حرفِ سخندانے

سپاہی ہم بہ میدانِ قناعت میکند جولاں
ز شمشیر و سپر دارد دمِ آبے لبِ نانے

دریں لشکر بمانم یا روم باخویش می سنجد
نماندہ در دکاں بقال را جز سنگ و میزانے

یکے گفتا خدا و ندا بحقِ اذ ح پیغمبر
برائے قلعۂ گولکنڈہ کن ایجاد طوفانے[1]

عبدالمجید صدیقی

---

[1] وقائع گولکنڈہ۔

عالمِ بے حس

عالمِ بے حس میں سوز و ساز لیکر کیا کروں
محفلِ خاموش میں آواز لیکر کیا کروں

جب زمین انقلاب انگیز ہی ملتی نہیں
آسمانِ تفرقہ پرداز لیکر کیا کروں

ہر طرف محصور ہیں کون و مکاں کی وسعتیں
بازوؤں میں قوتِ پرواز لیکر کیا کروں

ذوقِ نغمہ ہی نہیں سینوں میں اہلِ درد کے
تارِ جاں میں رس بھری آواز لیکر کیا کروں

ذرہ ذرہ اس جہاں کا ترجمانِ عشق ہے
دردِ الفت کا کوئی ہم راز لیکر کیا کروں

کوئی دل کی بات کھل کر مجھ سے کہتا ہی نہیں
سینۂ مضطر میں ذوقِ راز لیکر کیا کروں

اٹھ گئیں دنیا سے حسن و عشق کی بے تابیاں
دل میں عشق شاہدِ طنّاز لیکر کیا کروں

مجھ سے کترا کر چلی جاتی ہے موجِ زندگی
دل میں اک غم کا نوا پرداز لیکر کیا کروں

بزمِ جاں میں شمع و پروانہ کی بے تابی نہیں
سوز لیکر کیا کروں اور ساز لیکر کیا کروں

اس جہاں کے گوشے گوشے میں ہے آوازِ فرنگ
نغمہ ہائے بلبلِ شیراز لیکر کیا کروں

الغرض یہ فکر ہے اس خاکدانِ دہر میں
زیست کا انجام اور آغاز لیکر کیا کروں

عبدالقیوم خاں باقی ایم اے

تصوّریت

از دانشِ مبدا، و معادِ اشیا — بشنو سخنے کہ نشنوی جز از ما
عالم زِ ازل تا بہ ابد یک سخن است — گویندۂ آں خدا نیوشندہ خدا
(ظہیرا)

تعریف:-

تصوّریت وہ مابعد الطبعیاتی نظریہ ہے جو حقیقت کی وہی ماہیت قرار دیتا ہے جو نفس یا ذہن کی ہے۔

مادّیت نے کائنات کی اصل و بنیاد مادّہ کو قرار دیا تھا، تصوّریت نفس یا ذہن کو قرار دیتی ہے۔ مادّیت نے دنیا کی توجیہ کرتے وقت بقائے توانائی، فضا میں ذرّات مادّی کی حرکتوں اور میکانکی یا فاعلی علل پر سارا زور دیا تھا اور ذہن کو دائم التغیّر مادّہ ہی کی ایک صورت یا وصف یا نتیجہ خیال کیا تھا۔ تصوّریت اس کے برخلاف ذہن پر سارا زور دیتی ہے اور اس کو مادّے پر مقدّم قرار دیتی ہے اس کی رائے میں اگر تمہیں کائنات کی ابتدائی چیزوں کی تلاش ہو تو یہ تمہیں

---

[1] تصوریّہ کے ہاں خدا کے لیے مختلف اصطلاحات ہیں مثلاً افلاطون اس کو خیر کہتا ہے تو ارسطو محرّکِ اوّل، انکساغورث نوس یا ذہن، اسپنوزا جوہرِ مطلق، ہیگل تصوّرِ مطلق، نٹشے القوائے مطلق، شوپنہوار ارادۂ مطلق، ہارٹمن غیر شعوری ارادہ، فشنر روحِ کائنات، وُنٹ ارادۂ کلی۔ اور زمانۂ جدید کے اکثر تصوریّہ ذاتِ مطلق کہتے ہیں اور بے شمار فلسفی محض خدا۔

مادّے، حرکت اور توانائی میں نہیں بلکہ فکر، عقل، فہم، شخصیت، اقدار اور مذہبی و اخلاقی نصب العینوں میں ملیں گی یہی دراصل حقائق کائنات ہیں، یہی کائنات کا مایۂ خمیر ہیں! مادہ مادّی چیزیں اور مادّی قوتیں محض ثانوی حیثیت رکھتی ہیں، شاید یہ ذہن ہی کی خارجیت ہیں یا کسی ذہن کے لیے ایک مظہر یا ظہور یا نمود! غرض یہ کہ مادیت کہتی ہے کہ مادّہ حقیقی و اصلی شے ہے اور ذہن اس کا محض ایک نتیجہ یا لاحقہ اور تصوریت کا کہنا یہ ہے کہ ذہن حقیقی و اصلی شے ہے اور مادہ محض ثانوی چیز ہے اور ایک ظہور و نمود کی حیثیت رکھتا ہے۔

تصوّریت کے اسی مفہوم کو دو جملوں میں ادا کیا جا سکتا ہے جن میں سے ایک سلبی ہے اور دوسرا ایجابی۔

(۱) فطرت جو ہمیں بظاہر خود مکتفی نظر آتی ہے یہ محض ایک التباس ہے

فطرت کے خود مکتفی نظر آنے سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ ہمیں وہ ایک مستقل و غیر محتاج نظام نظر آتی ہے جس کے اپنے خاص قوانین ہیں جو سرمدی ہے، جس کے لیے نہ کسی خالق کی ضرورت ہے نہ خارجی مبدء کی جہاں سے وہ بروز کرتی ہو۔ لیکن حقیقت میں فطرت کا انحصار کسی دوسری شئی پر ہے، وہ قائم بالذات مستقل و غیر محتاج نہیں (یہ بات یاد رکھنے والی ہے کہ تصوریت "فطرت" کو "التباس" یا دھوکہ نہیں قرار دیتی جیسا کہ بعض دفعہ سمجھا گیا ہے۔ فطرتِ طبیعی خارجی وجود رکھتی ہے لیکن اس کا وجود انتہائی نہیں، یہ اپنے وجود میں کسی اور شئی کی محتاج ہے، اس کا خود مکتفی نظر آنا ایک قسم کا التباس ہے)۔

(۲) جس شئی پر فطرت مبنی و منحصر ہے وہ ذہن (روح، تصور) ہے

تصوّریت کے اس مفہوم کے لحاظ سے اس کو روحانیت یا ذہانیت (من ٹلزم) کہنا زیادہ مناسب ہو گا، لیکن چونکہ ان الفاظ کے فلسفہ میں اور معنی لیے جا رہے ہیں اس لیے ہم تصوّریت ہی کا لفظ استعمال کریں گے اور یہ بات صاف طور پر یاد رکھیں گے کہ کائنات کی انتہائی حقیقت اپنی ماہیت کے لحاظ سے وہی شئی ہے جو تصورات کا مایۂ خمیر ہے نہ کہ وہ جو مٹی اور پتھر کا۔ بالفاظ دیگر

اشیاء کا جوہر یا معین، وہ انتہائی ہستی جو دوسری تمام ہستیوں کی توجیہ کر سکتی ہے، اپنی باطنی ماہیت کے لحاظ سے ذہنی ہے۔ اور مادّہ حرکت و توانائی زمان و مکان سب اپنے وجود میں ذہن ہی کے محتاج ہیں۔

(یاد رکھو کہ خود ذہن کی ماہیت کے متعلق تصوّریہ کا آپس میں اختلاف ہے جس کی وجہ سے فلسفۂ تصوریت کی مختلف قسمیں پیدا ہو گئی ہیں جن کا مطالعہ ہم اس باب میں کرنے والے ہیں۔ بہرحال سارے تصوریہ اس امر پر متفق ہیں کہ کائنات کی فلسفیانہ توجیہ و تعبیر کے لیے ذہن یا روح ہی بنیادی یا حقیقی شئے ہے[1])۔

تصوریت کے مآخذ اولین بنی نوع انسان کے قدیم وجدانات ہیں۔ چنانچہ تاریخی اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ فلسفیانہ تصوریت نوع انسانی کے روحانی وجدانات میں عقل کو داخل کرنے کی کوشش کا نام ہے اور چونکہ یہ روحانی وجدانات اولاً مذہب میں پائے جاتے تھے۔ لہٰذا تصوریت اکثر مذہب کے ایک فلسفیانہ نتیجہ کے طور پر پیدا ہوئی ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں مذہب براہمہ و ویدانت تصوریت کی شکلیں ہیں۔ چین میں لوآئزی کا فلسفہ جس کی بنیاد چین کے قدیم لوآ والے عقیدہ پر ہے تصوریت کے مشابہ ہے۔ شمالی مذہب بدھ اپنی مابعد الطبعیات میں تصوریت بن گیا اور اس صورت میں سارے چین و جاپان میں پھیل گیا۔ یہودیت نے (زندہ جاوید یونانیوں کی مدد سے) فیلو اور میمونیدس کو پیدا کیا، اسی طرح عیسائیت نے بھی یونانی مدد سے اگسٹائن، ابیلارڈ، انسلم، ٹامس اکونیاس، ڈنس اسکوٹس وغیرہم کو جن میں سے بعض فلاطون اور ارسطو کی طرح ثنویت (یا کثرتیت) اور تصوریت کے درمیان مذبذب تھے۔

---

[1] ۔ تصوریت کی کوئی ایسی تعریف جو اس کی مختلف قسموں پر حاوی ہو پیش کرنی مشکل ہے۔ اسی لیے اکثر تصوریہ اس کی تعریف کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ پروفیسر کننگ ہام جنھوں نے تصوریت پر ایک نہایت سنجیدہ کتاب لکھی ہے (دیکھو دی ریالسٹک آرگومنٹ اِن ری سنٹ برٹش اینڈ امریکن فلاسفی) اس کی تعریف یوں کرتے ہیں "تصوریت وہ فلسفیانہ نظریہ ہے جو یہ بتلانے کی کوشش کرتا ہے کہ مادے یا حوادث کے زمانی، مکانی نظام کی انتہائی ماہیت پر غور کرنے کے لیے ہم منطقی حیثیت سے اس امر پر مجبور ہیں کہ ذہن یا روح کو کسی معنی میں اس کے لیے اساسی خیال کریں۔"

عصرِ جدید میں تصوریت نے شعورِ مذہبی سے مستقل و غیر محتاج طور پر ایک نئی قوت حاصل کرلی۔ اس کی بنیاد زیادہ تر اس جدید وجدان پر قائم ہے جو ڈیکارٹ، لائبنز، بالزش، بارکلے اور ان کے اتباع میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ تصوریت جیسے دقیق فلسفیانہ نظریہ کو ہم اسی وقت آسانی کے ساتھ سمجھ سکیں گے جب ہم ان اساسی وجدانات کو جاننے کی کوشش کریں جو فکرِ انسانی کی تاریخ میں تصوریت کو پیدا کرنے کا باعث ہوئے ہیں۔

تصوریت کے وجدانات:۔

ولیم ارنسٹ ہاکنگ جو ہارورڈ یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر اور موجودہ زمانہ کے ایک سربرآوردہ فلسفی اور حامی تصوریت ہیں، اپنی دلچسپ کتاب ٹائپس آف فلاسفی میں تصوریت کے ان وجدانات کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کا خلاصہ ہم یہاں پیش کر رہے ہیں۔[۱]

قوم کے یہ قدیم وجدانات ہم میں سے ہر شخص کو کسی نہ کسی وقت میسر آسکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ محض وجدان کسی فلسفہ کی کافی بنیاد نہیں قرار دیا جاسکتا، لیکن یہ بھی ایک مسلمہ امر ہے کہ کوئی سچا فلسفہ بغیر وجدان کے حاصل ہی نہیں ہوسکتا۔ مندرجۂ ذیل وجدانات پر غور کرنے اور خود ان کو حاصل کرنے کی کوشش فلسفۂ تصوریت کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں بہت مفید ہوگی۔

(۱) پہلا وجدان اس طرح ادا کیا جاسکتا ہے کہ دنیا کے یہ امور واقعات ظاہری اصلِ حقیقت نہیں مجاز ہیں؛ یہ تجربہ کی دنیا ظہور و نمود کی دنیا ہے، حقیقت پسِ پردہ نہاں ہے۔ انسان نے ہمیشہ اپنے نفس سے خطاب کرکے کہا ہے ؎

چشمِ تو گرفتارِ سپید ست و سیاہ　　　میدیدی کاش آنچہ می باید دید!

۱۔ دیکھو صفحہ ۲۵۱ تا ۲۵۴۔ یہ کتاب طلباء کے لیے مفید و دلچسپ ثابت ہوگی۔ ہم نے اس باب میں اس کتاب سے خوب استفادہ کیا ہے۔ اوپر کا بیان خلاصہ ہے ہاکنگ کی کتاب کے انیسویں باب کا جس کو آسان زبان میں پیش کیا گیا ہے۔

(۲) جس آسانی اور سہولت کے ساتھ یہ تجربہ کی دنیا ایک التباس بھی جا سکتی ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ انتہائی و آخری نہیں۔

چو موج حباب است کہ بر چہرۂ آب است

لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ دنیا ایک التباس یا دھوکہ ہے اور نہ تصوریت کی یہ تعلیم ہے کہ دنیا ایک التباس کا نام ہے۔ تصوریت یہ ضرور ثابت کرتی ہے کہ یہ دنیا خود مکتفی اور قائم بالذات نہیں، اس کا وجود عاریت ہے، دوسرے کا محتاج ہے۔ یہ "ضروری" نہیں "اضافی" وجود رکھتی ہے۔

ہر قوم کا ادب اور اس کی شاعری ان خیالات سے بھری پڑی ہے کہ دنیا ایک خواب ہے ع

ع یا گردے و شرارے و نسیمے و دمے است!

اے بے خبراں شکل مجسم ہیچ ست | ایں دائرہ و سطح مجسم ہیچ ست

خوش باش کہ در نشیمن کون و فساد | وابستۂ یکدمی و آنہم ہیچ ست (طوسی)

مجیر بیلقانی نے دنیا کی فنا پذیری کو کس بلیغ پیرایہ میں ادا کیا ہے ؎

گل صبحدم از باد بر آشفت و بریخت | وز حالت خود حکایتے گفت و بریخت

بد عہدی عمر بیں کہ خوں دل من | سر برزد و غنچہ کرد و بشگفت و بریخت!

یہ تمام لطیف تشبیہات و اشارات اس وجدان کے مظہر ہیں کہ دنیا کا وجود محض اضافی ہے، مطلق نہیں اور یہی تصوریت کا فلسفیانہ نقطۂ نظر ہے۔

(۳) ابتدائی تمدنوں میں "روحیت" (اینی مزم) کا عقیدہ عام طور پر پایا جاتا ہے اس عقیدے کی رو سے مظاہر فطرت کے علل ذہنی ہستیاں سمجھی جاتی ہیں۔ روحیت کا آغاز غور و خوص کے بعد نہیں ہوتا بلکہ یہ اہم فطری واقعات کے خلاف ذہنی ردّ عمل کے طور پر خود بخود پیدا ہوتی ہے۔ ہر جگہ دنیا کے آفات و مصائب پر دنیا کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار کیا جاتا ہے لیکن اس غیظ و غضب کے کوئی معنی نہیں اگر دنیا بیجان یا غیر ذی روح شئی ہو۔ کہا جاتا ہے کہ خوف خدا کے تصوّر کو پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ لیکن صاف بات ہے کہ جب تک کہ خوف پیدا کرنے والی شئی شخصیت سے متصف نہ کی جائے اور اس قابل نہ سمجھی جائے کہ وہ ہماری التجاؤں کو سن سکے، خوف خداؤں کو پیدا نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ولیم جیمس کہتا ہے کہ اگر تمام اقوام میں دعا ایک

جبلی شئے ہے تو اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ فطرت کو وجدانی طور پہ ارادہ کا اظہار سمجھا جاتا ہے۔

اس وجدان کو ہم وضاحت کے ساتھ اسی وقت محسوس کرتے ہیں جب ہم میں جذبات اپنی انتہائی قوّت کے ساتھ سرگرمِ عمل ہوتے ہیں مثلاً کسی محبوب کی موت یا بیماری یا کسی اور المناک حادثے کے وقت روح انسانی فطرت کے غلبہ و تسلّط سے آزاد محسوس کرتی ہے۔ لیکن بعض دفعہ یہ وجدان محض عقلی طور پر بھی اس امر کا انکشاف کرتا ہے کہ مادہ، حرکت، توانائی کے لیے ضرور ذہنی کفالت ہونی چاہیے یعنی کوئی شئے دنیا میں ابدی طور پر نہیں پائی جاسکتی اگر کسی ذہن کو اس کا علم نہ ہو یعنی جب تک کہ وہ معروضِ ذہن نہ ہو۔[1]

(۴) زمانۂ جدیدہ میں ایک ذہنی انقلاب رونما ہوتا ہے۔ ڈیکارٹ فرانس کا مشہورِ عالم فلسفی، فلسفۂ جدید کا آدم (۱۵۹۶ء تا ۱۶۵۰ء) بآوازِ بلند کہتا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ یقینی شئے واحد جو مطلقاً یقینی ہے، نفس انسانی ہے۔ ہر چیز کے وجود کے متعلق شک کیا جاسکتا ہے، لیکن ایک چیز تو یقینی ہے جس میں شک کرنا ناممکن ہے اور وہ یہ ہے کہ میں شک کرتا ہوں یا بالفاظِ دیگر میں سوچتا ہوں۔ یہ تو ایک متضادیات ہوگی اگر یہ کہا جائے کہ جو چیز سوچتی ہے، اس وقت جب کہ وہ سوچ رہی ہے موجود نہیں۔ ڈیکارٹ اسی بنا پر منطقی طور پر اس طرح استدلال کرتا ہے کہ شک کرنے کے لیے ایک ایک شک کرنے والی ذات ضروری ہے، سوچنے کے لیے ایک سوچنے والی شئے یا جوہر ذی فکر ضروری ہے۔ اسی بات کو وہ اپنے مشہور مقولہ میں اس طرح ادا کرتا ہے:۔ "میں سوچتا ہوں اس لیے میں ہوں" ڈیکارٹ کے بعد سے اس امر پر کافی بحث ہو چکی ہے کہ آیا ڈیکارٹ نے اس شئے کی ماہیت کو جس کے وجود کا اس کو اس قدر یقین تھا صحیح طور پہ بھی بیان کیا یا نہیں لیکن اتنی بات تو صحیح ہے کہ اعلیٰ ترین تیقن کا مقام ہمیں ذی فکر ذہن کے تجربہ ہی میں کہیں ملتا ہے۔

اس ایقان کے اظہار میں ڈیکارٹ عصرِ جدید کی نمایندگی کر رہا ہے۔ اس زمانہ میں اسی صداقت کا اپنے طریقہ سے اعادہ کیا جاتا ہے جس کو بہت پیشتر سرزمینِ ہند کے حکما نے دریافت کیا تھا کہ آتماں یا نفس مرکزِ کائنات ہے ع پنہاں او بہ عالمی چو جان اندر تن!

---

[1] ان جملوں کی توضیح آگے آئے گی۔

پہلے تین وجدانات گویا دنیا کے پیچھے ایک نفس کا انکشاف ہیں، جس طرح کہ ہم جنگل کی تنہائی میں یا پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر محسوس کرتے ہیں کہ باوجود اس عالم تنہائی وبیکسی کے ہم اکیلے نہیں، ہمارا کوئی ہمسایہ وہمنشیں وہمراہ ضرور ہے۔ چوتھا وجدان خود اپنی ذات میں دنیا کا انکشاف ہے: ہم ایک "جرم صغیر" نہیں ہم میں عالم اکبر منطوی ہے ظاہر ہے کہ یہ وجدانات مذہب کے وجدانات سے جدا ہیں۔ تاہم ان کے حامی ثنویت و وحدیت کے درمیان مذبذب رہے ہیں۔ ڈیکارٹ اور لاک اور کانٹ نے محسوس کیا کہ انھیں ذہن کے دائرہ سے خارج کسی شئی کو ماننا پڑے گا خواہ یہ مادّہ ہو یا کوئی ناقابل علم "شئی کماہی"۔ اسپینوزا اور شلنگ نے مادہ اور ذہن کی تحویل ایک بے ہمہ و ناقابل بیان جوہر میں کردی۔ صرف بارکلے، لائبنز، فشٹے اور ہیگل ہی میں ہم تصوریت کو اپنی پوری چمک دمک کے ساتھ پاتے ہیں۔

فلسفۂ جدید کو قابل فہم قرار دینے کے لیے دنیا کو نفس کے اس وجدان کی آنکھوں سے دیکھنا ضروری ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذہن اس لامحدود کائنات میں ایک حقیر و بے مایہ شئی ہے، تاہم ذہن خود ایک لامحدود شئی ہے جس میں ساری کائنات منعکس ہوتی ہے۔ یہی تضاد تصوریت کو اپنی جدید صورت عطا کرتا ہے۔

محبّت کی چھاؤں

ہم محبت کی چھاؤں میں سوتے تھے جب
خار بھی پھول معلوم ہوتے تھے جب
ابتدائے جنوں کی وہ اک بات تھی
وہ محبّت کی تاروں بھری رات تھی
دل کے تاروں سے مضراب ٹکرا گیا
آتشیں لے اٹھی کیف سا چھا گیا
حُسن کا وار جو تھا وہ بھرپور تھا
جس کو دیکھا نظر بھر کے وہ طُور تھا
دل کو اک بار سب دھو گئیں بجلیاں
میری رگ رگ میں حل ہو گئیں بجلیاں
دردِ دِل کا بہانہ بنی دل لگی
آنسوؤں کا فسانہ بنی دل لگی
پل کی پل میں بدلنے لگی زندگی
غم کے سانچوں میں ڈھلنے لگی زندگی
چاہ کا دن ڈھلا شام ہونے لگی
دل دھڑکنے لگا آنکھ رونے لگی

رات اور دن یونہیں آتے جاتے رہے
حسن اور عشق تکمیل پاتے رہے

مخدوم محی الدین ام اے

لاسلکی پیام رسانی

عہد حاضر میں لاسلکی ٹیلگرافی و ٹیلیفونی کا وجود زندگی کا ایک اہم جزو بن گیا ہے۔ گو آج سے چالیس سال قبل اس کا پتہ بھی نہ تھا لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بغیر اس کے گذر ممکن نہیں صبح سے شام اور شام سے صبح تک لاسلکی نشر کا تانتا بندھا رہتا ہے اور لاسلکی پیامات خشکی، سمندر اور بڑے بڑے براعظموں کو پار کر کے نور کی رفتار کے ساتھ آنِ واحد میں ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچ جاتے ہیں۔ ہم گھر میں، طیارے میں، جہاز میں، ریل گاڑی اور موٹر میں بیٹھے ہوئے، ایک معمولی آلے کی مدد سے جس کی حیثیت ایک چھوٹے سے صندوق سے زیادہ نہیں ہوتی، بلا کسی واسطہ اور بلا کسی توسط کے، دنیا کے تمام ریڈیو اسٹیشنوں کے دلچسپ اور مفید پروگراموں سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ ہمیں ہر ملک کے حالات ٹھیک اسی وقت معلوم ہوتے ہیں جبکہ وہ وقوع میں آتے ہیں۔ اس طرح سے لاسلکی نے دنیا کے تمام ممالک کو باہم اس طرح منسلک کر دیا ہے کہ گو ظاہری طور پر وہ ایک دوسرے سے بالکل جدا اور دور ہیں لیکن کاروباری نقطۂ نظر سے ایک دوسرے سے بیحد قریب ہیں۔ آج سے کوئی اکیس سال قبل پروفیسر جے۔ اے فلیمنگ نے کیا خوب کہا تھا کہ "بیس سال قبل اثیر کا عظیم الشان سمندر جو سوائے نور اور حرارت کے چند اثرات کے خاموش تھا، لاسلکی ٹیلگرافی کی موجوں سے اب اس میں ایک قیامت خیز تلاطم برپا ہو جائے گا۔" اس مشہور سائنس داں کی یہ پیش گوئی اب لفظ بہ لفظ پوری ہو گئی ہے چنانچہ آج ہم اثیر کے عظیم الشان سمندر کو شب و روز لاسلکی امواج سے متلاطم دیکھتے ہیں!

لاسلکی پیام رسانی ناگہانی انکشافات سے نہیں ہے بلکہ یہ ایک سنجیدہ اور باقاعدہ

تحقیق کا نتیجہ ہے۔ ریڈیم کی تحقیق بالکل ایک اتفاقی چیز تھی، لاشعاعوں کا انکشاف بھی اتفاق ہی پر مبنی تھا لیکن لاسلکی پیام رسانی کی نشو و نما اہم اور نازک ترین تجربات سے ہوئی۔ اس ابتدائی مہتم بالشان کامیابی کا سہرا جامعہ کیمبرج کے نوجوان پروفیسر جیمس کلارک میکسول (James Clarke Maxwell) اور ہنری ہرٹز کے سر ہے۔ کلارک میکسول نے ان برقی امواج کا پتہ لگایا جو لاسلکی پیام رسانی کی اساس ہیں لیکن یہ صرف چھوٹے طول موج کی موجیں پیدا کرسکا مگر ہرٹز نے اس میں یہ اضافہ کیا کہ بڑے طول موج کی موجیں پیدا کیں۔

اس کے بعد لندن کے ایک پروفیسر ڈی۔ ای ہیوز نے ۱۸۷۹ء میں ایک مکان سے بازو کے مکان میں انھیں موجوں کے ذریعہ ایک پیام بھیجا۔ سر ولیم کروکس نے اپنے تجربات کی بناء پر اس کام کو اور آگے بڑھایا اور ۱۸۹۲ء میں لاسلکی ٹیلگرافی کے امکانات کی پیش گوئی کی۔ اس نے لکھا کہ "نوری شعاعیں نہ تو دیواروں سے گذرسکتی ہیں اور نہ ہی، جیسا کہ ہم جانتے ہیں، لندن کے کہر میں سے۔ لیکن برقی اہتزازات جن کا طول موج ایک گز یا اس سے کچھ زیادہ ہو، ایسے واسطوں میں سے گذر سکیں گی جو ان کے لیے شفاف ہو"۔ یہیں سے لاسلکی ٹیلگرافی کی ابتداء ہوئی اور اس امر کا قوی امکان ہوگیا کہ بغیر تار، بغیر کھمبے، بغیر بحری تار غرض بلا کسی واسطے کے پیامات ایک مقام سے دوسرے مقام تک ارسال کئے جاسکتے ہیں۔

اس کے چار سال بعد یعنی ۱۸۹۶ء میں مارکونی نے لندن میں اپنا پہلا آلہ لاسلکی پیٹنٹ کرایا۔ اس دوران میں وہ اپنے کمرہ اور اپنے باپ کے باغ میں تجربے انجام دے رہا تھا اس سلسلہ میں اسے پتہ چلا کہ اگر پیامات کو طویل فاصلوں تک بھیجنا ہو تو ہوائیہ اور ارضی اتصال کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس کے بعد مارکونی نے انگلستان میں اپنے تجربات شروع کردئے اور سب سے پہلے سینٹ مارٹنس لے گرانڈ کے قدیم جنرل پوسٹ آفس سے کوئین وکٹوریہ اسٹریٹ کے سیونگ بینک ڈیپارٹمنٹ تک جو تقریباً ایک چوتھائی میل کا فاصلہ تھا، لاسلکی پیام روانہ کیا۔ بعد میں وہ سالسبری کے میدان میں جاکر ۲ میل تک پیام بھیجا اور پھر رودبار برسٹل کے اس کنارے سے اس کنارے تک پیام بھیجنے میں کامیابی حاصل کی۔ اسی طرح کی کوشش جنرل پوسٹ آفس کے انجینر

سر ولیم پریس Sir William Preece. نے بھی کی تھی لیکن اس کا طریقۂ عمل پیچیدہ اور ایک خاص فاصلہ تک محدود تھا۔

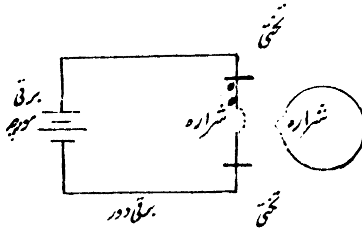
ان مسلسل کامیابیوں کے بعد مارکونی نے آئیل آف وہائٹ اور بورن متھ میں ایک ایک لاسلکی اسٹیشن بنایا، اس طرح سے ۱۴ میل کے فاصلہ تک پیامات کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ یہاں یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس زمانے میں مشہور سائنس داں لارڈ کیلون (Lord kelvin.) آئیل آف وہائٹ میں مقیم تھے۔ انھوں نے اپنے ایک دوست سر جارج اسٹوکس کے نام ایک لاسلکی پیام بھیجا اور ایک شلنگ اس کی اُجرت ادا کی۔ یہ پہلا معاوضہ تھا جسے مارکونی نے اپنی گراں قدر ایجاد کے سلسلہ میں حاصل کیا!

سنہ ۱۸۹۸ء میں ٹرینیٹی ہاوز کے عہدہ داروں کے ایما سے مارکونی نے ایسٹ گڈون روشنی جہاز Light ship. اور ساوتھ فورلینڈ کے روشنی گھر پر لاسلکی پیام رسانی کے آلات نصب کئے۔ ان دونوں کے درمیان ۱۸ میل کا فصل تھا۔ اتفاق سے تنصیب آلات کے چند ہی ہفتے بعد روشنی جہاز زبردست طوفان میں گھر گیا۔ ساکنانِ جہاز نے لاسلکی آلہ کی مدد سے روشنی گھر کو اس کی اطلاع دی جہاں سے امداد کے لیے متعدد حیات کشتیاں (Life boats.) روانہ کی گئیں۔ یہ لاسلکی پیام رسانی کے استعمال کی پہلی شاندار کامیابی تھی!!

اس کے بعد رُود بار انگلستان کے اُس پار تک پیامات روانہ کئے جانے لگے اور سنہ ۱۹۰۱ء میں مارکونی اس قابل ہوگیا کہ یورپ سے امریکہ تک پیامات بھیج سکے۔ اس کے ساتھ ہی ترقی کی رفتار بہت تیز ہوگئی اور لاسلکی ٹیلگرافی کے ساتھ ساتھ لاسلکی ٹیلیفون کا بھی انتظام ہوگیا اور اب نتائج اتنے خاطر خواہ ہیں کہ لاسلکی نشر ایک عام چیز ہوگئی ہے اور متمدن دنیا کا ہر گھر اس سے مستفیض ہو رہا ہے۔

میکسول نے ریاضیاتی طور پر برقی مقناطیسی امواج کے امکان کی بنیاد ڈالی لیکن وہ ابھی تجربہ کی منزل پر نہیں پہنچا تھا کہ موت نے اس کے منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ اور ہرٹز کو اس بات کا موقعہ ملا کہ تجربے کے ذریعہ اپنے پیشرو کے خیالات کو عملی جامہ پہنائے۔

ہرٹز نے برقی خانے کے مثبت اور منفی سروں سے دو تار ملائے اور ان آزاد سروں کے قریب تختیاں لگا کر ان پر دو سلاخیں لگائیں۔



سلاخوں کے سروں کو ایک دوسرے کے قریب رکھا تو ان کے مابین شرارہ پیدا ہوا۔ اس کے بعد اس نے دیکھا کہ قریب رکھے ہوئے دھاتی تار کے حلقے میں بھی اس کے سروں پر شرارہ پیدا ہوا حالانکہ ان کے مابین کوئی واسطہ نہ تھا اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہوا جبکہ تار کا طول اور اس کی وضع خاص تھی۔ بات یہ ہے کہ سلاخوں کے مابین شرارہ گذرنے سے ایک قسم کی توانائی پیدا ہوتی ہے جس کا اشعاع اطراف کی فضا میں ہوتا ہے۔ یہ توانائی برقی مقناطیسی موجوں (Electromagnetic waves.) کی شکل میں اشاعت پذیر ہوتی ہے اور پاس یا دور کے کسی حلقے میں جس کا طول اور جس کی وضع، ان امواج کے مناسب حال ہو، شرارہ پیدا کرتی ہے۔

ہرٹز کے اسی تجربہ کو سر آلیور لاج (Sir Oliver Lodge.) نے وسیع پیمانے پر انجام دیا اور اس کی اہمیت کو اچھی طرح واضح کیا۔ اس سلسلہ میں اور بھی لوگوں نے تھوڑا بہت کام کیا ہے لیکن، جیسا کہ بتلایا جا چکا ہے، اٹالیہ کے باشندے گگ للمو مارکونی (۱۸۷۴-۱۹۳۷ء) نے باقاعدہ طور پر لاسلکی پیام رسانی کو قابل عمل بنایا اور اس درخشاں ایجاد کا موجد کہلایا۔

شرارہ کے ذریعہ برقی مقناطیسی موجوں کو حاصل کرنا اور پھر حسب ضرورت مختلف اور مناسب طول موج کی موجوں کو پیدا کرنا ایک دقت طلب کام تھا اس لئے سائنس دانوں نے جب یہ معلوم کیا کہ اگر کسی تار میں رَو کی سمت جلد جلد بدلتی جائے تو اس سے ایثر میں برقی مقناطیسی موجیں پیدا ہوتی ہیں، تو شراروں کا کام متبادل رو (جلد جلد سمت بدلنے والی برقی رَو) (Altervating Current) سے لیا جانے لگا۔ مثلاً فی ثانیہ ۱۰۰ شرارے پیدا کرنے کی بجائے فی ثانیہ ۱۰۰ مرتبہ سمت بدلنے والی رَو استعمال کی جانے لگی۔

ان ابتدائی تحقیقات کے بعد اس موضوع پر کام کرنے والوں نے برقی مقناطیسی امواج پیدا کرنے، ان کو ارسال کرنے اور اخذ کرنے، ان کے طول موج کو حسب ضرورت بڑھانے گھٹانے، ان کی حساسیت میں اضافہ کرنے کے لئے حساس اور کار آمد اجزاء تیار کئے ہیں جن کی یہاں مختصر تشریح کی جائے گی۔

لاسلکی آلات کے ضروری اجزاء

امالی لچھا (Inductive Coil.) یہ تار لچھے دار ہوتا ہے۔ اس کے ذریعہ راست رَو کو زیادہ تفاوت قوہ کی متبادل رَو میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ اس کا تعلق ہوائیہ (Aerial) سے ہوتا ہے۔

اگر کسی خاص طول موج کی موجوں کو وصول کرنے کے لیے ہوائیہ استعمال کیا جاتا تو وہ انھیں امواج کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ اس سے مختلف طول موج کی موجوں کی وصولی کے لیے مختلف طول کا ہوائیہ درکار ہوتا لیکن اب چونکہ اس کا تعلق امالی لچھے سے ہوتا ہے اس لئے لچھے کے طول کو کم و بیش کرنے سے ہوائیہ کا موثر طول گھٹایا یا بڑھایا جا سکتا ہے، اس طرح مختلف متعدد کی امواج ایک ہی آلہ پر وصول کی جاسکتی ہیں۔

مکثفہ (Condenser.) مکثفہ ایک برتن ہوتا ہے جس کی مدد سے جلد جلد اہتزاز پیدا کئے جا سکتے اور جس میں برقی توانائی کو خاصی مقدار میں جمع کیا جا سکتا ہے۔ یہ برتن متعدد دھاتی تختیوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کے درمیان ہوا یا کوئی دوسری غیر موصل شئے ہوتی ہے۔ اب ایک تختی کو مثبت برق سے برقایا جاتا ہے تو دوسری تختی امالی اثر کے تحت منفی برق سے برقائی جاتی ہے۔ ان تختیوں کی وسعت بڑھا دی جائے تو اس میں برق کے سمانے کی اہلیت بڑھ جاتی ہے۔ نیز تختیوں کے درمیانی فاصلوں کو بڑھانے گھٹانے سے ان کی برقی گنجائش میں کمی و بیشی ہو سکتی ہے۔ اس طرح سے مکثفے دو قسم کے ہوتے ہیں ایک مستقل دوسرے تغیر پذیر۔ لاسلکی میں بالعموم تغیر پذیر مکثفے استعمال کئے جاتے ہیں۔

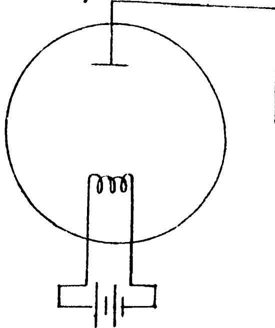
ہوائیہ (Aerial.) ہوائیہ بالعموم ایک لمبا دھاتی تار ہوتا ہے جسے مکان کی چھتوں پر کھمبوں کے ذریعہ آڑا تان دیا جاتا ہے اس کا ایک سرا کھمبے کے ساتھ حاجز سے ملا ہوتا ہے اور دوسرا مکثفہ سے ملتا ہے۔ نشرگاہ کے ہوائیہ سے جب متبادل رو گذرتی ہے تو

اس سے برقی مقناطیسی امواج کی اشاعت ہوتی ہے جنھیں وصولی آلے کے ہوائیہ میں، بشرطیکہ آلہ اس خاص نشر گاہ کے ساتھ ہم سُر بنادیا گیا ہو، برقی رَو پیدا ہوتی ہے جس سے اس کے اجزا ادہم آہنگی کے ساتھ متاثر ہوتے ہیں۔

پہلے عام طور سے لانبے افقی تار کی وضع کے ہوائیے استعمال ہوتے تھے لیکن یہ اب مختلف قسم کے بنائے جاتے ہیں۔ ان کا طول بھی نسبتاً بہت کم ہوتا ہے بعض آلات میں تو یہانتک نزاکت پیدا کی گئی ہے کہ ان میں صرف ایک انچ کا ہوائیہ استعمال کیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود لانبے تار کا ہوائیہ ہی اپنی خصوصیات کے باعث زیادہ پسندیدہ ہے۔

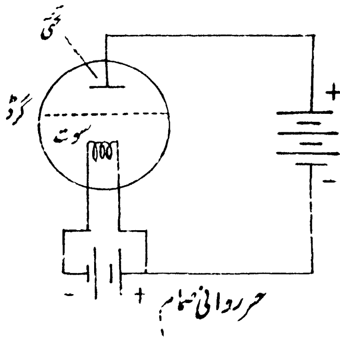
صمام (Valve) یہ لاسلکی آلات کا بہت ہی اہم اور ضروری جز ہے اور اس کی بدولت لاسلکی آلات کی حساسیت میں ایک انقلابی تبدیلی ہوئی ہے۔ یہ آلہ برقی رَو کو صرف ایک ہی سمت میں گذارنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے گویا یہ ایک ایسے دروازہ کے مانند ہے جو صرف ایک طرف کھل سکتا ہے۔ سیکل کا صمام اس کی اچھی مثال ہے۔ اس کے ذریعہ ٹیوب میں ہوا داخل ہوتی ہے لیکن واپس نہیں ہوتی۔ گویا یہ ہوا کو صرف ایک ہی سمت میں گذارتا ہے۔ اسی طرح سے برقی صمام بھی برقی رَو کو صرف ایک ہی سمت میں گذارتا ہے۔

برقی صمام کی ایجاد پروفیسر جے۔ اے فلیمنگ کی مرہون منت ہے۔ صمام شکل میں ایک برقی لمپ کے مماثل ہے۔ اس میں ایک طرف ایک باریک تار ہوتا ہے جسے سُوت (Filament.) کہتے ہیں اور دوسری طرف ایک دھاتی تختی۔ سُوت اور تختی کے مابین کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ سُوت کا تعلق برقی مورچہ سے کر دیا جاتا ہے تو وہ خوب گرم ہو جاتا ہے۔ پھر دھاتی تختی کا تعلق ایک دوسرے برقی مورچے کے مثبت سرے سے اور سوت کا منفی سرے سے کر دیا جاتا ہے جس سے برقی رَو گذرنے لگتی ہے اب اگر رَو کی سمت بدل دی جائے تو رَو بند ہو جاتی ہے فلیمنگ نے اس کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ جب باریک تار میں سے برقی رَو گذرتی ہے تو وہ گرم ہو جاتا ہے اور اس سے کثیر تعداد میں



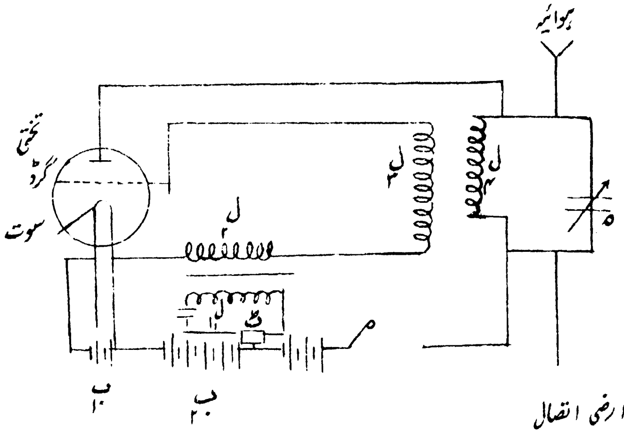
برقیے خارج ہوتے ہیں اور صمام کی صورت میں وہ سوت سے نکل کر تختی کی طرف جاتے ہیں۔ اس طرح سے رَو کے لئے ایک راستہ مل جاتا ہے اور دور مکمل ہوتا ہے جو تبدیلی سمت کی صورت میں ناممکن ہے۔

اب جبکہ صمام کا تعلق متبادل رَو سے کر دیا جاتا ہے تو چونکہ اس میں رَو کی سمت ہر آن بدلتی ہے اس لئے سوت کبھی مثبت اور کبھی منفی سرے سے متعلق ہوتا ہے جب منفی سے متعلق ہوتا ہے تو رَو گذرتی ہے اور جب مثبت سے ہوتا ہے تو رَو نہیں گذرتی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس میں رو صرف ایک ہی سمت میں گذر سکتی ہے۔ اس طرح صمام متبادل برقی رَو کو راست رَو میں تبدیل کرتے ہیں۔



ایک دوسرے سائنس داں ڈاکٹر فارسٹ نے سوت اور تختی کے درمیان ایک اور برقیرہ استعمال کیا جس کی شکل سوراخدار تختی کی سی ہوتی ہے۔ اسے گرڈ Grid کہتے ہیں اس سے صمام کی قابلیت میں معتد بہ اضافہ ہوتا ہے۔ گرڈ کی برقی حالت رَو کو ضبط میں رکھتی ہے اسی لیے اسے ضابطہ برقیرہ بھی کہتے ہیں۔

آلۂ فرستندہ جس آلہ کے ذریعہ آواز نشر کی جاتی ہے اسے آلۂ فرستندہ (Transmitter.) اور جس آلہ کی مدد سے اس لاسلکی نشر کو وصول کیا جاتا ہے اسے وصولی آلہ Receiver کہتے ہیں۔ ذیل کی شکل میں آلۂ فرستندہ کی تشریح کی گئی ہے۔ اس میں ب۱ اور ب۲ دو برقی مورچے ہیں ب۱ کا تعلق صمام کے سوت سے ہے۔ جب رَو گذرتی ہے تو سوت گرم ہو جاتا ہے جس سے برقیے خارج ہوتے ہیں۔ ب۲ کا مثبت سرا لچھے کے نیچے کے سرے



ل۱ سے ملا ہوا ہے اور لچھے کا دوسرا سرا ل۲ صمام کی تختی سے ملا ہوا ہے۔ ب۲ کا منفی سرا سوت سے ملا ہوا ہے اس طرح سے دَور مکمل ہوتا ہے اور برقیے سوت سے نکل کر تختی کی طرف جاتے ہیں اور لچھے کے دور میں ایک مسلسل رَو جاری ہوتی ہے۔ اب ہمیں اس مسلسل برقی رَو کو اہتزازی رَو میں تبدیل کرنا ہے۔ لچھا ل۳ ایک طرف صمام کے گرڈ سے اور دوسری طرف ل۲ کے ساتھ سوت سے ملا ہوا ہے۔ جب ل۴ میں سے برقی رَو گذرتی ہے تو ل۳ میں عارضی رَو پیدا ہوتی ہے اور گرڈ کی برقی حالت بدلتی ہے جس سے برقیوں کی رَو بدلتی ہے۔ اس کا اثر ل۴ پر پڑتا ہے اور دور ل۴ میں ایک قسم کا ارتعاش پیدا ہوتا ہے اور ایک ارتعاشی رَو قائم ہو جاتی ہے۔ ان ارتعاشات کو ہوائیہ برقی مقناطیسی امواج کی صورت میں اثیر (Ether.) میں پھیلاتا ہے۔ ہ ایک مکثفہ ہے۔ اس کی گنجائش اور امالیت کو کم و بیش کر کے اشاعت پذیر امواج کے طولِ موج میں حسب ضرورت کمی و بیشی کیجاتی ہے۔

اس دور میں ٹ ایک خوردہ گو (Microphone.) ہے جس کے سامنے نشر کرنے والا تقریر کرتا ہے۔ یہ ایک صندوقچہ پر مشتمل ہوتا ہے جس میں کاربن کے

مہین ذرّات بھرے ہوتے ہیں جن میں سے برقی رو گذرتی ہے۔ ان ذرات کے سامنے ایک پردہ ہوتا ہے۔ جب ہم مُنہ نال (Mouth. Piece.) کے ذریعہ بات کرتے ہیں تو ہوا میں موجیں پیدا ہوتی ہیں اور ان کے اثر سے پردہ آگے پیچھے حرکت کرتا ہے۔ اس حرکت کی وجہ سے کاربن کے ذرّات پر دباؤ پڑتا ہے۔ زیادہ دباؤ کی صورت میں ان کی مزاحمت گھٹ جاتی ہے اور تیز برقی رَو گذرتی ہے۔ دباؤ کم ہونے کی صورت میں مزاحمت زیادہ ہوتی اور رَو کم گذرتی ہے۔ اس طرح سے برقی رَو میں ایک اہتزازی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس عمل سے ل ۱ لچھے میں برقی رَو گھٹتی بڑھتی ہے جس سے ل ۲ لچھا بھی اسی انداز میں متاثر ہوتا ہے اور پھر اس کا اثر گرڈ کی برقی حالت پر پڑتا ہے اور نتیجہ کے طور پر برقی مقناطیسی امواج کی کیفیت بھی آواز کی ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔

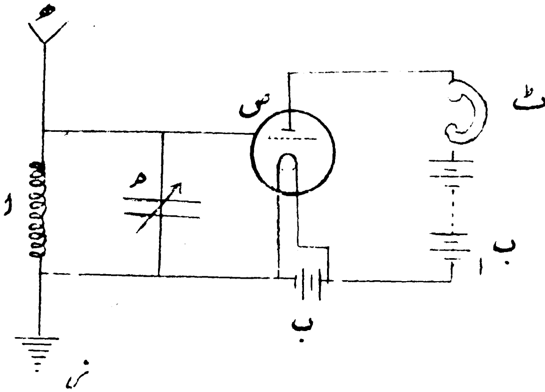
اب یہ برقی امواج ہوائیہ سے نکل کر اثیر کے ذریعہ اطراف کی فضا میں اشاعت پذیر ہوتی ہیں اور ان کی رفتار ۱۸۶۰۰۰ میل فی ثانیہ ہوتی ہے۔ اثیر ایک فرضی واسطہ ہے۔ سائنس دانوں نے اس کے وجود کو صرف مان لیا ہے اور اسے مان کر جو نتائج حاصل کیے گئے ہیں وہ اتنے صحیح اور درست ہیں کہ اس مفروضہ کو صداقت کا رتبہ مل گیا ہے۔ یہ واسطہ عالمگیر ہے اور ہر جگہ جاری و ساری۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ جہاں کچھ ہے اور جہاں کچھ نہیں، وہاں اثیر موجود ہے۔ اس لیے برقی مقناطیسی امواج کے لیے کوئی مادّی شئے غیر شفاف یا رکاوٹ کا باعث نہیں۔

ایک صمام والا وصولی آلہ۔ وصولی آلوں میں برقی مقناطیسی امواج یا برقی اہتزازات کو اک سمتی رَو میں تبدیل کرنے اور حساسیت میں اضافہ کرنے کے لیے ایک یا دو سے زیادہ صمام استعمال کئے جاتے ہیں۔ ذیل کی شکل میں ایک صمام والے وصولی آلہ کا خاکہ دیا گیا ہے۔ ھ ہوائیہ، ل ۱ امالی لچھا، ز زمین، م مکثفہ، ص، صمام، ب برقی مورچہ اور ٹ ٹیلیفون کا مسماع (Headphone) ہے۔ ہوائیہ کا تعلق امالی لچھے کے اوپری سرے سے ہے اور نیچے کے سرے کا تعلق ایک تار کے

ذریعہ زمین سے ہے۔ اس کے لئے ایک تار سے چھوٹی سی دھاتی تختی باندہ کر زمین میں گاڑ دی جاتی ہے جسے ارضیہ

Earth Plate.

کہتے ہیں۔



برقی مورچہ ب کا تعلق صمام کے سوت سے ہے جس کے باعث سوت گرم ہوتا ہے اور اس سے برقیے خارج ہوتے ہیں۔

برقی مورچہ ب کا مثبت قطب ٹیلیفون کے مسماع میں سے تار کے ذریعہ صمام کی تختی سے ملا ہوا ہے اور منفی قطب کا تعلق سوت سے ہے۔ اب دور مکمل ہے اور برقیے سوت کی طرف رواں ہیں یعنی ٹیلیفون کے مسماع میں سے برقی رَو گذر رہی ہے۔ ہوائیہ کا تعلق صمام کے گرڈ سے ہے۔

عمل نشرگاہ سے آنے والی برقی مقناطیسی امواج کو ہوائیہ اخذ کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان امواج کا طول ہر نشرگاہ کے لئے مختلف اور مختص ہوتا ہے اس لئے مکثفہ کی گنجائش کو اس طرح تبدیل کریں گے کہ مکثفہ اور امالی لچھے کا تعدد ایسا ہو جائے جیسا کہ آنے والی موج کا ہے۔ اس طرح سے ہوائیہ ان برقی مقناطیسی امواج کو اخذ کرے گا اور ل م کے دور میں برقی ارتعاشات پیدا ہو جائیں گے۔ ان ارتعاشات کے زیر اثر گرڈ میں باری باری سے مثبت اور منفی برقیت پیدا ہوتی جائے گی یعنی گرڈ کی برقی حالت آنے والی موج سے متاثر ہوتی رہے گی۔

اب ظاہر ہے کہ صمام میں سے برقی رَو صرف ایک ہی سمت میں جا سکتی ہے اس لیے جب گرڈ میں منفی برق ہوگی تو ٹیلیفون کے آلہ میں سے رَو نہ گذرے گی اور جب مثبت برق

ہوگی تو رَو گذرے گی اِس طرح سے گویا متبادل رَو کی بجائے اک سمتی رَو کے صدمے ٹیلیفون میں سے گذریں گے۔ اب چونکہ یہ صدمے جلد جلد اور یکے بعد دیگرے پڑتے ہیں اس لئے ان کا اثر یک سمتی رَو کا سا ہوگا

ٹیلیفون کے سماع میں ایک برقی مقناطیس Electromagnet ہوتا ہے۔ اس کے سامنے ایک قرص ہوتا ہے۔ برقی مقناطیس کچے لوہے کا ایک گھڑ نعلی وضع کا چھوٹا سا ٹکڑا ہے جس پر محجوز لپٹا ہوتا ہے اس کی خاصیت یہ ہے کہ جب تک تاریں سے رَو گذرتی ہے، یہ مقناطیسی خواص کا اظہار کرتا ہے اور جب رو بند کردی جاتی ہے تو اس کی مقناطیسیت زائل ہو جاتی ہے۔ اس لیے جب رَو تیز ہوتی ہے تو مقناطیس قرص کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور کمزور رَو کی صورت میں مقناطیس تھوڑا سا کھینچتا ہے اور کم قوت کے ساتھ۔ اس طرح سے رَو کی کمی وبیشی کے باعث قرص ایک طرح کا اہتزاز کرنے لگتا ہے۔ سماع کے قرص کی یہ حرکت نشرگاہ سے آنے والی امواج کے ساتھ تطابق کرکے وہی آواز پیدا کرتی ہے۔ سماع کی جگہ اگر مکبرالصوت لگا دیا جائے تو آواز ایک بڑے رقبے میں سنائی دے گی۔

ہم نے یہ ایک صمامی آلہ کی تشریح کی ہے لیکن آج کل بازار میں جو ریڈیو سٹ (Radio Set. دست یاب ہوتے ہیں، ان میں ارتعاشات کو زوردار اور آواز کو بلند کرنے کے لئے ایک سے زیادہ صمام استعمال کئے جاتے ہیں چنانچہ عام ریڈیو سٹ میں ۲ تا ۱۰ صمام ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے آواز بہت صاف سنائی دیتی ہے۔ کیونکہ ان سے کمزور ارتعاشات کو کئی سو گنا زوردار کیا جاسکتا ہے۔ یہ صمام گویا ریلے کا کام دیتے ہیں۔ ان کا حال بالکل ریلے ریس (Relay Race) کا سا ہے۔ جب ایک دوڑنے والا ایک خاص فاصلہ طے کرچکتا ہے تو دوسرے کو اپنی جھنڈی دیتا ہے جو پوری توانائی کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ اس طرح سے ایک صمام دوسرے صمام کو طاقت بخشتا ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ لاسلکی امواج کرۂ ارض کے اطراف کس طرح سفر

کرتی ہیں؟ کیوں یہ سیدھی چلکر فضا میں گم نہیں ہو جاتیں؟ بات یہ ہے کہ کرۂ ہوا میں، سطح زمین سے بہت اوپر منجمد نائٹروجن گیس کی دو تہیں ہیں جن میں یہ گیس ننھی ننھی فلموں کی شکل میں موجود ہے۔ پہلی تہ کرۂ ارض کی سطح سے ۴۰ میل پرے اور دوسری ۰۰ا میل پرے واقع ہے اور یہ دونوں تہیں ایک لحاف کی طرح کرۂ ارض کے اطراف ہیں۔ انھیں ان کے محقق کے نام سے ہیوی سائیڈ (Heaviside Layers) کہتے ہیں۔ ان تہوں کے باعث یہ امواج فضا میں گم ہونے نہیں پاتیں بلکہ پہلی ہی ہیوی سائیڈ تہ سے ٹکرا کر منعکس ہوتی ہیں اور یہ انعکاسی سلسلہ نصف کرۂ ارض طے کرنے تک جاری رہتا ہے۔

فضائی خلل انداز ریڈیو کے سامعین اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ بعض دفعہ ان کے سٹ میں مکبر الصوت سے عجیب و غریب آوازیں نکلتی ہیں اور گڑبڑسی ہونے لگتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ آوازیں وصولی آلہ کی خرابی، مورچے کے اتر جانے یا پیچوں کے برابر کسے ہوئے نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوں۔ ایک حد تک یہ خیال درست ہے لیکن اچھے سے اچھے ریڈیو سٹ میں بھی، جہاں اس قسم کی کوئی خرابی نہ ہو، یہی ہنگامہ آرائی پائی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی کوئی اور وجہ بھی ہوگی اور اس کی وجہ وہ برقی خلل ہے جو فضا میں پیدا ہوتا ہے۔ اس فضائی خلل کا گہرا مطالعہ کرکے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ اس کا تعلق گرجنے والے بادلوں کے برقی اخراج سے ہے۔

گرجنے والے بادل کا اوپر اور نیچے کا حصہ مخالف قسم کی برق سے برقایا جاتا ہے۔ جب ان برقی بھرتوں کے درمیان برقی تناؤ زیادہ ہو جاتا ہے تو برقی اخراج شرارہ کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ اس برقی اخراج سے بلند قسری اہتزازات یا امواج پیدا ہوتی ہیں۔ بلند قسری کا مطلب یہ ہے کہ یہ اہتزازات زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہتے بلکہ دو ایک جھونکوں کے بعد ختم ہو جاتے ہیں لیکن ان کی اشاعت لاسلکی امواج کی سی ہوتی ہے۔ اس لئے جب یہ امواج لاسلکی پیام رسانی کی امواج کے ساتھ وصولی آلہ پر پہنچتی ہیں تو وہاں "ناخواندہ مہمان" کی طرح گڑبڑ مچا دیتی ہیں کیونکہ ان کے اہتزازات میں اور آلۂ فرستندہ سے نکلنے والے برقی مقناطیسی امواج کے اہتزازات میں فرق ہوتا ہے۔ وہ بے قاعدہ ہوتے ہیں اور یہ باقاعدہ اور مسلسل۔

فضائی خلل رات کے ابتدائی حصہ میں بہت زیادہ ہوتا ہے۔ غروب آفتاب سے کچھ پہلے وصولی بہت خوشگوار اور باقاعدہ ہوتی ہے لیکن جیسے جیسے سورج غروب ہوتا ہے یہ ہنگامہ آرائی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور غروب کے کچھ منٹ بعد تو گڑبڑ اتنی زیادہ ہونے لگتی ہے کہ بعض دفعہ تو آلہ کو بند کر دینا ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جیسے جیسے رات زیادہ ہوتی ہے اس خلل میں کمی واقع ہونے لگتی ہے اور زیادہ رات گئے تو دور کے اسٹیشنوں کے پروگرام بھی صاف سنائی دینے لگتے ہیں۔

گرم ممالک میں جہاں موسم گرما میں بادل زوروں سے گرجتے ہیں فضائی خلل اندازیوں کی فراوانی ہوتی ہے اسی باعث سب موسموں سے زیادہ عمدہ وصولی موسم سرما میں ہوتی ہے۔

اب تک فضائی خلل کو دور کرنے کا کوئی علاج دریافت نہیں ہوا ہے۔ البتہ چھوٹے طول موج کی امواج، بڑے طول موج کی امواج کی نسبت کرتے کم متاثر ہوتی ہیں۔ چنانچہ آج کل عام رجحان زیادہ تر چھوٹے طول موج کی نشرگاہوں کی طرف ہے۔ بہرحال خوش قسمت ہوگا وہ انسان جس کے ہاتھ اس درد کی دوا لگ جائے!

فضائی خلل کے علاوہ ریڈیو سٹ میں گڑبڑ کی اور بھی کئی ایک وجوہات ہیں بالخصوص شہروں میں جہاں برقی تاروں کا جال بچھا ہوتا ہے، متبادل رو کے تکوینی آلات ہوتے ہیں، نیان کے اشتہارات کثرت سے لگائے جاتے ہیں، موٹر یا دیگر شرارہ پیدا کرنے والی سواریوں کی ریل پیل ہوتی ہے، ایسی خلل اندازیاں بہت ہوتی ہیں چنانچہ شاہ راہوں کے بازو جو مکان واقع ہوتے ہیں وہاں وصولی میں تھوڑی بہت خرابی ہوتی ہے۔ لیکن یہ اثرات محدود ہوتے ہیں اور وسیع رقبہ کو متاثر نہیں کرتے۔

فیض محمد بی اے ڈپ۔ ایڈ

حسرتِ جلوہ

وہ جلوہ گاہ، وہ پہلی نگاہِ مستانہ
اسی کے دھیان میں جاری ہے گشت روزانہ
پیامِ عیش ہے لاریب آرزوئے نشاط   خوشا امیدِ ملاقات و جستجوئے نشاط
ملا نہیں ابھی وہ دل نواز کاشانہ

پھر ایک بار اُسے دیکھنے کی حسرت ہے
نظر فروزِ دل و دیدہ جس کی طلعت ہے
بھگت رہا ہوں میں خمیازہ اپنی غفلت کا   لگا سکا نہ جو اندازہ دل کی قیمت کا
نہ دے سکا اُسے پہلی نظر میں بیعانہ

میں چاہتا ہوں اسی مہ جبیں کو دل دینا
سکھا گئی جو مجھے لطفِ زندگی لینا
تصوراتِ وفا مائلِ فراوانی   معاملہ کی ابھی سے یہ عیش سامانی
پری خود آئے نظر یا ملے پری خانہ

میں جس کی یاد میں ہوں وہ نظر نہیں آتی
یہ علم بھی نہیں اب کیوں ادھر نہیں آتی
بیان کیا غمِ مایوسیِ نگاہ کروں   امیدِ جلوہ رکھوں اور آہ آہ کروں
کسے سناؤں میں حسرت بھرا یہ افسانہ

نمودِ زندہ دلی کس قدر وہاں ہوگی
قمر جمال مری دلربا جہاں ہوگی
سہیلیوں کو مزے خوب آ رہے ہوں گے   شباب و حسن کے کیا کیا مظاہرے ہوں گے
نہاں مجھی سے ہو اس کی ادائے مستانہ

علی منظور حیدرآبادی

دکن میں اردو شاعری کا احیاء

نواب میر نظام علیخاں کے عہد میں

دکنی ادب کی پیدائش اور اس کے عروج کی تاریخ، درحقیقت دسویں اور گیارھویں صدی ہجری کی خود مختار دکنی سلطنتوں کے عروج اور زوال کی داستان ہے! ان سلطنتوں میں خاص طور پر بیجاپور اور گولکنڈے کے تاجدار علم و ادب اور شعر و سخن سے غیر معمولی شغف رکھتے تھے۔ انھیں دو سلطنتوں کا استحکام دکنی شاعری کی ترقی کا نقطۂ آغاز ہے۔ عادل شاہی اور قطب شاہی خاندانوں کے آخری چار سلاطین کے عہد میں، جو دکھنی شاعری کا عہد زرین ہے، دارالسلطنت بیجاپور اور گولکنڈہ، اس زبان کے بلند پایہ شاعروں کی شعری سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ان شاعروں میں بیجاپور کے مقیمی، امین، صنعتی، رستمی، ملک خوشنود، نصرتی اور ہاشمی اور گولکنڈہ کے قطب شاہ، وجہی، حسن شوقی، غواصی اور ابن نشاطی کے کارناموں کی ادبی خوبیاں اور شعری نزاکتیں موجودہ تحقیقات کی بدولت روز بروز روشنی میں آتی جارہی ہیں۔

مغلوں کی فتح دکن کے بعد سے دکھنی ادب اور شاعری پر زوال طاری ہونے لگا دہلی کی شہنشاہیت اور دکن کی سلطنتوں کے درمیان کشمکش یوں تو ۹۹۵ھ سے شروع ہوچکی تھی۔

لیکن نصف صدی کے طویل عرصہ تک یہ سلطنتیں دہلی کی شہنشاہی فوجوں کا مقابلہ بے جگری کیساتھ کرتی رہیں۔ ان میں احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جو دکن کے سب سے زیادہ شمال میں واقع ہونے کی وجہ سے ہر وقت، تازہ دم مغل فوجوں کے حملوں کا، نشانہ بنتی رہی اور اس طرح سینہ سپر ہوکر، وہ بیجاپور اور گولکنڈہ کی ادبی، اور شعری ترقیوں کے لیے مواقع فراہم کرتی رہی۔ نظام شاہی حکمرانوں میں ملک عنبر اور چاند بی بی نے دہلی کی فوجوں کا جس اولوالعزمی سے مقابلہ کیا تھا اس کے افسانے آج تک مشہور ہیں۔ بالآخر شاہجہاں کے ہاتھوں ۱۶۳۵ء میں اس سلطنت کا خاتمہ ہو گیا، اور مغلوں کے لئے جنوب کی طرف پیش قدمی کا راستہ کھل گیا۔ لیکن شاہ جہاں کو آگے بڑھنا نصیب نہ ہوسکا اور عالمگیر تخت دہلی پر متمکن ہوئے۔ سن ۱۰۹۰ء سے عالمگیر نے دکن کو فتح کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اور دس سال کی سعیٔ پیہم کے بعد اُن کی یہ خواہش پوری ہوسکی۔

بیجاپور کے خاتمہ کے وقت عادل شاہی سرپرستی میں بیسیوں شاعر موجود تھے۔ ان میں سے سیوا، مومن وغیرہ کے نام ہم تک پہنچے ہیں۔ اسی طرح جس وقت گولکنڈہ تباہ ہوا، جس قدر شاعر اور ادیب بے سہارا ہو گئے۔ ان میں سے چند فائز، لطیف نوری مرزا، غلام علی وغیرہ ہیں۔

بیجاپور اور گولکنڈے کی تباہی کے ساتھ ہی دکھنی زبان اور شاعری کے قدردانوں کا خاتمہ ہوگیا۔ ۱۷۱۱ء میں دہلی کی تباہی کے سبب اس راجدھانی کے علماء اور شعراء کا وطن سے کوچ کرکے فیض آباد اور لکھنؤ پہنچنا اور پھر، لکھنؤ کے اُجڑنے پر، لکھنؤ کے شعراء کا قدر دان اور سرپرست کی تلاش میں رامپور اور حیدر آباد کی طرف روانہ ہونا ہمارے قریبی زمانے کے واقعات ہیں۔ حالانکہ یہ اُس زمانے کا واقعہ ہے، جب اردو زبان کافی ترقی کر چکی تھی اور ہندوستان کے طول وعرض میں اس کا معیار یکساں ہوگیا تھا۔ دکھنی شاعروں کے لیے یہ مصیبت تھی کہ، آمد و رفت کی دقتوں نے، خود دکن کی ہمسایہ ریاستوں میں عوام کی طرزِ زندگی، معاشرت اور مذاق میں فرق پیدا کر رکھا تھا۔ ایسی فضا میں دکھنی شعراء اپنے مرکز سے منتشر ہوکر کہاں جاسکتے، اور اپنی متاعِ شعر وسخن کے لئے قدر دان کہاں پیدا کرسکتے تھے؟

اسی لئے عادل شاہی اور قطب شاہی خاندانوں کی تباہی دکھنی زبان نہیں تو کم سے کم دکھنی ادب اور شاعری کے لئے پیغام مرگ ثابت ہوئی۔

بیجاپور کی تباہی کے بعد، اس سرزمین کے اہل علم وفضل اور شاعروں کے انتشار کا ایک واقعہ، قاضی محمود بحری کی زندگی ہے۔ بحری مضافاتِ بیجاپور کے ایک قصبے، گوگی کے رہنے والے تھے۔ وہ شعر وسخن کے اُس مذاق کی پیداوار تھے جس کے سبب بیجاپور کا نام آج تک زندہ ہے۔ سلطنت اور سرپرست کی تباہی کے بعد، وہ بعض اور شعراء کی طرح، اپنی علم وفن کی بساط سمیٹ کر گولکنڈے کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں قزاقوں نے انھیں لوٹ لیا۔ مال واسباب کے ساتھ ان کا ادبی سرمایہ اور تصنیفات کا بڑا حصہ بھی تباہ وبرباد ہوگیا۔ خود بصد خرابی گولکنڈہ پہنچے۔ یہاں پورے دو سال بھی چین سے رہنے نہ پائے تھے کہ یہ سلطنت بھی تاراج ہوگئی۔

بیجاپوری شعراء کی حد تک تو یہ بھی تھا کہ ان میں سے کچھ گولکنڈہ جا سکتے تھے، جہاں ان کی قدر کرنے والے موجود تھے لیکن جس وقت گولکنڈہ کی سلطنت تباہ ہوئی، دکھنی شاعروں کا، اس وسیع دنیا میں کہیں سہارا نہ رہا۔

اس کے دو بڑے سبب تھے۔ ایک تو یہ کہ دکھنی حکومتوں کے خاتمہ کے سبب دکن کی مرکزیت ختم ہو چکی تھی۔ دوسرے عادل شاہی اور قطب شاہی حکمرانوں کے جانشین مغل، دکھنی زبان سے نامانوس تھے۔ فطرتاً انھیں دکھنی ادب اور شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس طرح حکومت کی سرپرستی ختم ہونے کے ساتھ ہی دکھنی شاعری پر زوال طاری ہونا ایک لازمی بات تھی۔

اس میں شک نہیں کہ یہ (۳۸) سال کا زمانہ جس میں دکن حکومت دہلی کا ایک جز بنا رہا، شعراء سے بالکل خالی نہیں تھا۔ لیکن مغل، جو شمال سے فارسی زبان اور شاعری کی دلچسپیاں اپنے ساتھ لائے تھے، دکھنی شعراء کی کاوشوں کی داد نہیں دے سکتے تھے اسی لئے، ان چند شاعروں کو چھوڑ کر جو اپنے ادبی ذوق اور شاعری کے نشوونما کے لئے غیر کی حوصلہ افزائی اور قدردانی کے محتاج نہیں رہتے، اکثر دکھنی شاعر پھر فارسی کی طرف رجوع ہونے لگے۔

اس وقت دکن کی عام فضا بھی شعر وسخن کی سرگرمیوں کے لئے موزوں نہیں تھی۔ یہ زمانہ درحقیقت سیاسی اور سماجی تصادم شکست وریخت اور، تعمیر جدید کا زمانہ تھا۔

ایسی فضا ادب اور شاعری کی پیدائش اور ترقی کے لئے کبھی راس نہیں آتی۔ یہ بے چینی کی حالت دکن میں آصفجاہی سلطنت کے قیام اور استحکام تک برابر قائم رہی۔ اور پھر جب آصفجاہی خاندان کے پانچویں حکمران، نواب میر نظام علی خاں کے عہد میں شعر وسخن کی ترقی کے اسباب مہیا بھی ہوئے تو وہ دکھنی کے مساعد نہیں ہوئے۔

آصفجاہی سلطنت کے قیام کے زمانے میں دکھنی شاعری پر یاس وحرمان کا پرتو طاری تھا۔ عادل شاہی اور قطب شاہی سرپرستیوں کے زمانے میں اس میں جو بلند آہنگی اور ادبیت پیدا ہونے لگی تھی، وہ اس وقت مفقود ہو چکی تھی اس زمانے کی عام دکھنی شاعری، ہلاکو کی ترکتازیوں کے بعد کی فارسی پیداوار کی طرح متصوفانہ اور مذہبی رنگ کی ہوگئی تھی۔ اس زمانے کے اکثر شاعر ایسے تھے، جو وسیع سلطنتوں کے عروج اور زوال کے نقشے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے! اپنے قدردانوں اور سرپرستوں کی تباہی کے بعد، دنیا اور اس کے عیش وآرام کی ناپائداری کے نقوش ان کے دل پر ثبت ہو گئے اور وہ فطرتاً روحانیت اور تصوف میں اپنا اطمینان ڈھونڈھنے لگے۔

اس زمانے کی تصنیفات سے اس کا خاطر خواہ پتہ چلتا ہے۔

محمد علی عاجز اور عبد اللطیف کے قصے دراصل فقہی مسائل کی توضیح ہیں بحری کی مثنوی "من لگن" اسی عصر کی پیداوار ہے۔ ضعیفی نے جتنے قصے لکھے وہ سب مذہبی ہیں۔ ذوقی نے حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کی منقبت میں اپنی شاعرانہ قابلیت صرف کی۔ عشرتی اور وجدی جو آخری شعرا ہیں، اپنی متصوفانہ مثنویوں کی بدولت مشہور ہیں۔ مذکورہ بالا مذہبی اور صوفی شعرا کے علاوہ احمد، اشرف، امامی، رضا، قادر، ہاشم علی وغیرہ دنیاوی موضوع پر طبع آزمائی کرنے کی بجائے شہدائے کربلا کے واقعات اور مراثی لکھنے میں اپنی نجات سمجھتے رہے۔

نواب نظام الملک نے ۱۱۳۶ھ میں جب دکن کی خود مختار حکومت قائم کی تو دکن کی مرکزیت پھر ایک دفعہ نو دکر آئی اور تباہ حال علماء، شعراء اور اہل فن کی توقعات کے لئے ایک مستحکم مرکز پیدا ہو گیا لیکن خود نواب نظام الملک کی زندگی میں شعر وسخن کی ترقی کے مواقع کم تھے کیونکہ ان کی توجہ سیاسی گتھیوں کے سلجھانے میں تمام تر مصروف رہی۔ اس میں شک نہیں کہ وہ فارسی کے اچھے

شاعر تھے اور اپنی فرصت کے اوقات فکرِ شعر میں صرف کیا کرتے تھے، تاہم دکھنی شاعری سے وہ نامانوس تھے۔ اسی لئے انھوں نے اگر کچھ قدر کی تو فارسی شعرا کی۔

نواب نظام الملک کا پایہ تخت اورنگ آباد تھا، مغلوں کے زمانہ حکومت میں بھی اورنگ آباد کو مرکزیت حاصل تھی اسی لئے بیجاپور اور گولکنڈے کی تباہی کے بعد اورنگ آباد ہی دکھنی شعرا اور علما کا عرصہ تک مرکز بنا رہا۔ اس وقت تک اُردو کے شہرۂ آفاق شاعر ولیؔ اور سراجؔ اس سرزمین کی خاک سے اُٹھ چکے تھے۔ شمالی ہند سے جو علما اور ریختہ گو شاعر دکن آئے، وہ پہلے پہل یہیں وارد ہوئے۔ اس میں شک نہیں کہ حکومت کی توجہ اُردو شاعروں کی طرف زیادہ نہیں تھی تاہم ایک زبردست حکمران اور امن و عافیت کے علاوہ شائستہ دربار کی توقع ان کے لئے کافی تھی۔ چنانچہ اہل علم و فن اور شعرا کے یہاں جمع ہونے کا لازمی نتیجہ تھوڑے ہی عرصہ میں یہ ہوا کہ اورنگ آبادی شعرا نے خاصی ترقی کر لی اور نواب نظام علی خاں کے عہد تک اورنگ آباد کے شعرا کا ایک نیا اور دکھنی سے ممتاز دبستان قائم ہو گیا۔ اس دبستان کے شعرا نے آگے چل کر حیدرآباد کی شاعری کے قدیم طرز کو بدلنے میں شمالی ہند کے شعرا کے دوش بدوش حصہ لیا۔

نواب نظام الملک کے انتقال کے بعد دکن کی فضا پھر مکدر ہونے لگی تھی تھوڑے عرصہ میں، تین حکمران، ناصر جنگ، مظفر جنگ اور صلابت جنگ تخت نشین ہوئے لیکن جب نواب نظام علیخاں نے عنانِ حکومت سنبھالی تو اگلی پریشانیاں ختم ہو گئیں۔ نظام علی خاں آصفجاہ ثانی، اس خاندان کے دوسرے زبردست حکمران ہیں جنھیں اپنی طویل مدتِ حکومت میں، سیاسی خلفشاروں میں گھرے رہنے کے باوجود، زیادہ امن و عافیت کی زندگی میسر آئی انھیں کے زمانے میں نواب نظام الملک کی ڈالی ہوئی داغ بیل پر، مملکت کے مختلف شعبوں میں استحکام اور ترقی ہوئی۔ اگر آصفجاہِ اوّل نے اپنی قوت بازو اور تدبر سے دکن میں ایک سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی، تو آصفجاہ ثانی نے اس کو مستحکم کیا اور سماجی، درباری اور علمی روایات کی ابتدا کرنے اور انھیں قائم کرنے کا باعث ہوئے۔

جب نواب نظام علی خاں کے دربار کی بساط بچھی، تو دکھنی شعر و سخن کا وہ ذوق، جو قدردان اور سرپرست کی تلاش میں منتشر ہو کر ضائع ہو رہا تھا، رفتہ رفتہ سمٹ کر اس دربار کے اطراف جمع ہونے لگا۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں، اس دربار کے اِردگرد، شمالی ہند،

اورنگ آباد اور دکن کے کم و بیش دو سو شاعر جمع ہو گئے۔

لیکن اس دفعہ حیدر آباد میں جس طرز کی شاعری کا نشو و نما ہوا، وہ ٹھیٹ دکنی شاعری نہیں تھی، بلکہ یہ شمالی ہند یعنی دہلی کے اساتذہ کے نمونہ اور طرز کی شاعری تھی جس کے بڑے علمبردار اُس زمانے میں میرؔ، سوداؔ اور دردؔ تھے۔

یہ نئی شاعری نہ صرف طرز یا اسلوب اور زبان میں قدیم دکھنی سے ممیز تھی بلکہ اس کے اصناف بھی بڑی حد تک دکھنی سے مختلف تھے۔

دکھنی شاعری میں محمد قلی قطب شاہ سے پہلے غزل کا پتہ کم چلتا ہے۔ غزل پہلے پہل محمد قلی کے زمانے میں لکھی گئی اور کوئی تعجب نہیں کہ دکھنی میں اس کی ابتدا محمد قلی نے کی ہو۔ محمد قلی کے زمانہ تک دکھنی شاعر مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ نگاری کی طرف زیادہ مائل تھے۔

محمد قلی کے بعد بھی سینکڑوں دکھنی شاعر پیدا ہوئے، لیکن غزل کو کسی نے بھی غیر معمولی اہمیت نہیں دی۔ ولیؔ اورنگ آبادی سب سے پہلا شاعر ہے جس نے اُردو غزل کو فارسی غزل کا رتبہ اور مقبولیت تک پہنچانے میں سعی بلیغ کی۔ ولی کی شعری روایات کو، سراجؔ اورنگ آبادی نے اور بھی آگے بڑھایا۔

دکن میں غزل گوئی کو زیادہ مقبولیت اورنگ آباد اور شمالی ہند کے شاعروں کی کوششوں کی بدولت حاصل ہوئی۔ دہلی میں ریختہ کی ابتدا ہی غزل سے ہوئی اور یہیں کے اساتذہ نے اس کو معراج کمال تک پہنچایا۔

نواب میر نظام علی خاں کے عہد سے، دکن کے شعرا میں بھی غزل کو عام مقبولیت حاصل ہونے لگی۔ اس کے علاوہ غزل کے ساتھ ایک اور چیز کی بھی ابتدا اسی زمانے سے ہوئی، جس کو اُردو غزل کی تاریخ سے خاص تعلق ہے۔ یہ تلمذ کا سلسلہ ہے جس سے قدیم دکھنی شاعری نا آشنا تھی۔

ولی کے اثر سے، دہلی میں اُردو شاعری کا جب چرچا پھیلا، تو اکثر شعرا کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس فن کو واقف کار اساتذہ سے حاصل کریں۔ سراج الدین علی خان آرزوؔ، جو فارسی کے مسلم الثبوت شاعر سمجھے جاتے تھے اور جو دکھنی سے بھی واقفیت رکھتے تھے، دور اوّل کے اکثر اُردو شعرا کے لئے استادی کی خدمت انجام دیتے رہے یہیں سے شاعری کے ساتھ یہ رسم بھی

آگے بڑھی، اور رفتہ رفتہ اس کو اس قدر اہمیت حاصل ہوگئی کہ "بے استادہ" شاعر ہی تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ مرزا غالب پر معاصرین کی طعن و تشنیع کا محرک بھی احساس تھا۔

دکن کی شاعری میں آصفجاہ ثانی کے زمانے سے یہ سلسلہ جاری ہوا۔ اورنگ آباد کے شعرا کے لئے سب سے پہلے سراج اورنگ آبادی نے استادی کا حق ادا کیا اور حیدرآباد میں آصفجاہ ثانی کے دربار کے مورخ اور شاعر، شاہ تجلی علی نے "استاد اول" کی حیثیت حاصل کی۔ تجلی کے بعد ان کے منظورِ نظر شاگرد، شیر محمد خاں ایمان، اس زمانے کے شمالی اور دکھنی شعرا میں استاد تسلیم کئے گئے۔

ایک تیسری تحریک جس کی ابتدا دکھنی شعرا میں اسی زمانے سے ہوئی، دکھنی کے قدیم الفاظ، محاورات اور اسالیب کے ترک کرنے کی کوشش تھی۔ شمال کے اولین شعرا، ابتدا میں دکھنی ہونوں پہ شعر لکھنے پر مجبور تھے۔ ایک نسل کے بعد جب ان کے ہاں شاعری کا ذوق خاصا ترقی کر گیا تو قدیم اسالیب، الفاظ اور محاوروں کی پابندی انھیں اجیرن معلوم ہونے لگی۔ مرزا مظہر جان جاناں کی کوشش سے قدیم الفاظ اور محاوروں کے خلاف بغاوت شروع ہوئی اور تھوڑے عرصہ کے اندر اندر دہلی کے شاعر اس زمانے کی عام بول چال کی زبان میں شعر لکھنے لگے۔ اس تحریک سے پہلے دہلی کے شعرا کا کلام بالکل دکھنی معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ مظہر کے ایک معاصر شاہ حاتم نے اپنے دیوان کو تاریخ وار مرتب کیا ہے۔ ان کے دیوان کے مطالعہ سے اس کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

زیرِ تبصرہ زمانے میں، شمالی ہند یعنے دہلی، اورنگ آباد اور حیدرآباد کے شعرا کے میل جول سے، جب دکن میں اردو شاعری کا احیا ہوا، اور دہلی کی ترقی یافتہ شاعری دکھنی شعرا کا مطمحِ نظر بنی تو دکنی شعرا نے بھی، اپنے دہلوی معاصرین کی طرح، قدیم دکھنی اثر کو شاعری سے دور کرنے کی جد و جہد شروع کی اور نواب نظام علی خاں کے عہدِ حکومت کے ختم ہونے سے پہلے پہلے، سینکڑوں شاعر ایسے پیدا ہو گئے، جو قدیم دکھنی کو ترک کر چکے تھے اور دہلی کے اساتذہ کی زبان میں شعر لکھنے لگے تھے۔

تاہم قدیم دکھنی کا اثر فوراً زائل نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں بھی چند شاعر ایسے موجود تھے، جن کی تربیت قدیم ادبی ماحول اور روایات میں ہوئی تھی۔ وہ اپنے میلانِ طبع

اور وضعداری کے سبب ٹھیٹ دکھنی ہی میں شاعری کرتے رہے۔ ان میں درگاہ قلی خاں درگاہ، نوازش علی خاں شیدا، انور الدولہ قابل ذکر ہیں۔

درگاہ قلی خاں، آصفجاہ اوّل کے قابل اعتماد امرامیں سے تھے۔ ان کی تربیت نواب موصوف ہی کی نگرانی میں ہوئی تھی۔ اور نواب کے ساتھ انھوں نے بڑی جاں نثاری کے ثبوت دئے تھے۔ نواب نظام علی خاں کے عہد میں وہ گوشہ نشیں سے ہوگئے تھے اور اپنی پوری توجہ علمی اور ادبی مشاغل تک محدود کرلی تھی۔ اُن کے باغ دلکشا واقع اورنگ آباد میں اکثر شعروسخن کی محفلیں جمی رہتی تھیں۔ درگاہ کی تصنیفات میں "مُرقع دہلی" کے علاوہ کئی دکھنی مرثیے شامل ہیں۔ اِس مضمون کے آخر میں چند اور نمونوں کے ساتھ درگاہ کے کلام کا اقتباس بھی پیش کیا گیا ہے۔

نوازش علی خاں شیدا دکن کے مشہور مرثیہ گو ہیں یہ سراج اورنگ آبادی کے معاصر تھے۔ "اعجازاحمدی" اور "روضتہ الاطہار" ان کی تصنیفات ہیں۔

انورالدولہ جو اس زمانے کے ایک اور دکھنی نگار شاعر ہیں، آصفجاہی دربار کے ایک امیر تھے اور غالباً یہ اورنگ آباد کے رہنے والے تھے چنانچہ ان کے کلام میں فعل "بولنا" کے ساتھ "نے" علامت فاعل کا استعمال بے تکلف کیا گیا ہے جو اورنگ آبادی شعرا کی ایک خصوصیت ہے۔

نواب نظام علی خاں آصفجاہ ثانی، اپنے جدِ اعلیٰ آصفجاہ اوّل کی طرح نہ صرف مُہماتِ مملکت سے دلچسپی رکھتے تھے، بلکہ شعروسخن سے بھی انھیں لگاؤ تھا۔ جب یہ اطمینان سے دارالسلطنت میں قیام کرتے، تو شعروسخن کی محفلیں گرم ہوتیں۔ سالگرہ اور نوروز کے جشن منعقد ہوتے اور شادی بیاہ یا سلطنت کی تقریبیں منعقد ہوتیں تو اُردو اور فارسی شعرا اور انشا پرداز اپنا مدحیہ کلام، قصیدے اور قطعے پیش کرکے انعام اکرام پاتے تھے۔ اس طرح، شعرا کو اُن کے دربار کے اطراف جمع ہونے کے لئے ایک اچھی وجہ پیدا ہوگئی تھی۔

آصفجاہ ثانی کی تخت نشینی کے زمانہ تک یہ خاندان دکھنی شاعری سے مانوس ہو چکا تھا۔ اس میں کچھ دکھنی شعرا کی اس جد وجہد کو بھی دخل ہے جس کی بدولت ان کا کلام شمال کے حکمرانوں کے لئے جاذب توجہ بن گیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ نواب نظام علی خاں کے دربار میں فارسی شعرا سے زیادہ دکن اور شمال کے ریختہ گو شاعر جمع ہو گئے تھے۔ اور امرا اور

اہل درباران شعرا کی خوب قدر کرتے تھے۔

یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں لیکن ایک دربار کا ذکر ضروری ہے جس کی فیاضیوں کو، دکن کی شاعری کے احیا میں بہت بڑا دخل ہے۔ یہ سلطنت کے مدار المہام اور وزیر نواب اعظم الامرا ارسطو جاہ کا دربار ہے۔ ارسطو جاہ کی فیاضیوں نے ان کی صحبتوں کو اہل علم وفن اور شاعروں کا مرکز اور ان کی توقعات کا مطمح نظر بنا دیا تھا۔ ان صحبتوں کے مقابلے میں خود دربار شاہی بھی ماند پڑ گیا تھا۔ ایران، شمالی ہند اور دکن کے اطراف وجوانب سے علما اور شعرا کھنچ کھنچ کر اس دربار میں آنے لگے۔ ارسطو جاہ کے فیض سے سینکڑوں شاعر مستفید ہوئے اور بیسیوں شاعر ایسے تھے جن کی تربیت اس دربار میں ہوئی۔ اگر اس وقت ارسطو جاہ جیسا فیاض اور علم دوست وزیر دکن میں موجود نہ ہوتا تو شعرا کا ایسا کثیر مجمع یہاں ہو سکتا اور نہ شعر وسخن کی یہ گرم بازاری ہوتی۔ ارسطو جاہ کی مدح میں جتنی شاعری کی گئی ہے، کسی امیر تو امیر، بلکہ حکمران کی مدح میں بھی شاید ہی کی گئی ہو گی۔ یہاں بیسیوں شاعر ایسے تھے جنھوں نے پادشاہ وقت کی مدح میں شاید ہی کچھ لکھا ہوگا، لیکن ارسطو جاہ کی تعریف میں دیوان کے دیوان لکھے ہیں۔

ارسطو جاہ کے درباری شعرا کی کاوشوں کی بدولت اُردو میں قصیدوں کا ایک بڑا ذخیرہ فراہم ہو گیا ہے۔ اس ذخیرہ کا ایک حصہ درباری شاعری سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

خوش قسمتی سے یہ تمام افکار، دربار کے ایک متوسل شاعر، شاہ تجلی علی کی سعی سے ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں۔ اس مجموعہ کا نام "مجموعہ فصاحت" ہے اور ۱۲۱۵ھ میں مرتب کیا گیا ہے۔ حقیقت میں سَو سوا سو شاعروں کے کلام کا یہ قابل قدر مجموعہ ہے جس میں قدیم دکھنی، اورنگ آبادی، شمالی اور جدید حیدر آبادی شعرا کا کلام ایک جگہ ملتا ہے۔

اس مجموعہ کو اور اس زمانے کے تذکروں کو پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ دکھنی شعرا نے بہت جلد شمالی ہند کے اثرات کو جذب کر لیا تھا اور دہلی کی زبان میں شعر کہنے لگے تھے کہیں کہیں تو مشابہت اس قدر مکمل ہے کہ جب تک شاعر کا پتہ معلوم نہ ہو، یہ نہیں واضح ہوتا کہ یہ شمالی ہند کے شاعر کا کلام ہے یا دکن کے۔

غرض نواب نظام علی خاں کا عہد دکن کی اُردو شاعری کی تاریخ میں شمالی ہند اور

دکن کی قدیم شاعری کا سنگم ہے جس کی ابتدا اورنگ آباد اور رشیدا جیسے ٹھیٹ دکھنی نگار شعرا سے ہوئی اور جس کا اختتام شیر محمد خاں ایمان جیسے شعرا کے نشو و نما پر ہوتا ہے۔

شمالی ہند میں یہ زمانہ دہلی کی اردو شاعری کے عروج کا زمانہ ہے جو شاعر اس زمانے میں دہلی سے دکن وارد ہوئے ان میں سے اکثر ایسے تھے جو نہ صرف مظہر اور حاتم بلکہ میر اور سودا کے ریختوں کو بھی سن چکے تھے۔ ان میں سے بعض ایسے بھی تھے، جن کی تربیت ان اساتذہ کی رہنمائی میں ہوئی تھی جب یہ دکن آئے تو ان میں سے سربرآوردہ اساتذہ جیسے میر غلام علی آزاد بلگرامی، سید عبدالولی عزلت اور شاہ غلام قادر سامی وغیرہ بہت جلد مرجع شعرا بن گئے۔ اورنگ آباد اور حیدر آباد میں کئی نوجوان شعرا کی تربیت ان کے اثر کے تحت ہوئی۔

آزاد بلگرامی کی صحبتوں سے جس طرح کے سخن فہم اور سخن سنج پیدا ہوئے، اُن کا ایک اچھا نمونہ لالہ لچھمی نارائن، شفیق اورنگ آبادی ہیں شفیق اپنے علم و فن کے مقابلے میں کسی شاعر کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔

دوسری طرف ایک اور گروہ تھا جو اس فن کو دکن ہی کے اساتذہ سے سیکھ رہا تھا اِن میں شاہ تجلی علی کے تلامذہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جن کے مقدمتہ الجیش، شیر محمد خاں ایمان تھے۔ یہ دو سلسلے حیدر آباد میں حال تک بھی موجود تھے۔

ذیل میں ہم اس زمانہ کے ٹھیٹ دکھنی نگار اور شمال سے دکن آنے والے شعرا اور دکن کے جدید دبستان کے شاعروں کے کلام سے مختصر نمونے پیش کر کے اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

پہلا اقتباس، نوازش علی خاں شیدا، دکھنی مرثیہ نگار کی تصنیف "اعجاز احمدی" سے ماخوذ ہے۔ اس میں ایک بھیڑیئے کی چرواہے سے گفتگو کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

یہودی تھا چرواہا اُس جائے ایک ۔۔۔ چراتا تھا بکریاں مکاں خوب دیک
قضا را کیا ایک بھیڑا گذر ۔۔۔ گیا لیکے منہ سیں بکری پکڑ
وو چرواہا دنبال دوڑا گیا ۔۔۔ مشقت سیں بکری چھڑا کر لیا (لایا)
لگا (وہ) کہنے بھیڑے نے چرواہے سات ۔۔۔ کہ کرتے ہیں انسان جس طور بات
کہ جو رزق حق نے دیا مجکوں تھا ۔۔۔ چھوڑا کیوں لیا تو نے اے بے حیا

وہ چرواہا سنکر ہوا ہے عجب — تکلم یہ حیواں کا ہے کس سبب
کیا اس سے بھیڑے نے ہنس یہ کلام — کہ اس میں عجب تر تمہارے ہیں کام

ذیل کا اقتباس احسن الدین خاں بیان دہلوی کے ایک قصیدے کا ہے جو اعظم الامرا ارسطو جاہ کی مدح میں لکھا گیا تھا۔

ہمیشہ دل میں مرے یہ خیال آتا ہے — کہ کھینچے پھرتی ہے کیوں ہر طرف مجھے تقدیر
مرے تو دل میں تلاشِ معاش ادنیٰ نہیں — کہ جس کے واسطے اتنا فلک کرے تشہیر
مگر تلاش تھی دل میں تو شخص کامل کی — وہ خواہ امیر بظاہر ہو خواہ ہوئے فقیر

....

غرض کہ بس اسی صورت میں ہے وہ معنی خاص — کہ ذہن عام سمجھنے کرے ہے جس کو دیر
سو ایسی دولت جاوید یاں دکن میں ملی — کہ ایک شخص کو پایا ہے بے عدیل و نظیر
امید یوں ہے کہ اس کیمیا کی خدمت سے — ہمارے بھی مس ناقص کو ہوئے کچھ تغییر

....

بجائے مدح میں اس کی اگر ہزار جگہ — اس ایک شعر کو سودا کے میں کروں تحریر
غرض نہ خلق ہو دنیا میں آدمی ایسا — کریں جو خاک کو آدم کے لاکھ بار خمیر

آخری اقتباس شاہ تجلی علی کے ایک قصیدے کا ہے جو ارسطو جاہ کی مدح میں لکھا گیا تھا۔

ہیں اب کے ایک سال میں پیدا بہار دو — اک گل پہ جھوم جھوم گرے ہے ہزار دو
گل کوئی، شمع کوئی سمجھ بلبل و پتنگ — قرباں ہیں صبح و شام بصد اضطرار دو
سیلاں ہے بسکہ جوش رطوبت سے باغ میں — سرو چمن کے بیچ سنتی جوئبار دو
موج نسیم، آئینۂ آبشار سے — صیقل سا صاف کر دیا زنگ غبار دو
یاں تک نمو کا زور ہے نکلے زمیں کو چیر — یک بیج سے گلوں کے ہری شاخسار دو
تک کھول زلف مکھڑے پہ اے شک مہر و ماہ — دیکھوں میں ایک صفحہ پہ لیل و نہار دو

....

ہوتے ہی صبح میں جو گیا سیرِ باغ کو | دیکھوں کھلے ہیں وہاں چمن لالہ زار دو
خوشقد مثالِ سرو چمن جوئبار پر | بیٹھے ہیں رشکِ باغ ارم طرحدار دو
تھا بہروپ کا آبِ رواں کا سازمزمہ | بجتے تھے ایک سُر میں رباب و ستار دو

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق!

علامہ اقبال نہ کوئی مُلّا ہیں اور نہ کوئی فقیہہ نکتہ در، معترض کہتے ہیں کہ وہ "دُنیائے عمل" میں سست گام ہیں۔ اُن کی کشتِ عُمر بے حاصل ہے لیکن یہ سب کو مُسلّم ہے کہ وہ نہایت تیز بیں ہیں اور اپنے پہلو میں وہ چیز رکھتے ہیں کہ ع "نامِ اُو دل است۔ دل" اور وہ بھی پُر اضطراب! وہ نہ صرف "اہلِ دل" بلکہ "اہلِ فکر" بھی ہیں۔ اور فکر بھی اُن کی ایک ایسے "ساحلِ ناپذیر" ہے۔ وہ ہمیشہ "داغ در جگر" اور "نَے کی طرح نالاں رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم اس "نغمہ جاں" شاعر کے "نغمہائے پے بہ پے" سے کسی نہ کسی صورت میں مسلسل مستفید ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے احساسات اور افکار کی تازہ ترین ترجمانی ایک چھوٹی سی مثنوی کی صورت میں ہوئی ہے جس کا نام زیبِ عنوان ہے۔

"پیامِ شرق" کے فاضلانہ دیباچہ میں جو گیٹے کے "مغربی دیوان" سے سو سال بعد لکھا گیا ہے ڈاکٹر اقبال نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ:۔

"اُس کا مدعا زیادہ تر اُن اخلاقی، مذہبی اور ملّی حقایق کو پیشِ نظر لانا ہے جن کا تعلق افراد اور اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔"

یہی بات اُن کی اس جدید منظوم تصنیف پر بھی صادق آتی ہے۔ ان کے ذہن میں ایک سوال اقوامِ شرق سے متعلق پیدا ہوتا ہے۔ ؎ پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق :: باز روشن می شود ایامِ شرق۔

یوں تو مشرق، مغرب کی جوع الارضی اور معاشی دستبرد کے لیے نوعِ انسان کی ہلاکت میں اس کی سخت کوشی سے آگاہ ہو رہا ہے۔ حبش اور چین کے واقعات نے بھی جنیوا کے طلسم سامری کو "غیر از فکر و فن" ہیچ ثابت کر دیا ہے! اب یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ مغربی اقوام کی قاہری

صرف سوداگری ہے اس حقیقت کے ادراک سے مشرق بیدار ہو رہا ہے لیکن ضرورت ہے کہ مشرق کے اس "فروغِ صبح" کو "پایانِ روز" کے درجہ تک پہنچایا جائے۔ مشرق کے نوجوانوں کو جو زیادہ تر عورتوں کی طرح "مشغولِ تن" ہیں اور حبِ مال اور ترسِ مرگ کا شکار ہیں "اولادِ غیور" بنایا جائے۔ اس کی اولین شرط اندیشہ و احساس کی اصلاح یعنی "تطہیرِ فکر" اور "تعمیرِ فکر" ہے۔ اندیشۂ قوم کی خرابی قومی قلبِ سلیم کی موت ہے۔ اس سے قوم جد وجہدِ حیات۔ یا بقول اقبال "حرب و ضربِ کائنات" سے کنارہ کش ہو جاتی ہے۔ "پیامِ مشرق" کے مذکورہ بالا دیباچہ ہی میں اس نغمہ آشنائے رومؒ و تبریزؒ برہمن زادہ (اقبال) کا ارشاد ہے:—

"مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے۔ اقوامِ مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیئے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے اِنّ اللہ لا یغیر ما بقوم حتّٰی یغیّروا ما بانفسہم کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے، زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں کو حاوی ہے۔ میں نے اپنے فارسی تصانیف میں اسی صداقت کو مد نظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔"

مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" شاعر نے اسی مقصد سے لکھی ہے کہ احرارِ شرق کے سینے "نخلِ سینا" بنا دیئے جائیں۔ ان میں "گرمیٔ ذکر" اور "رفعتِ فکر" پیدا ہو ؎

تا بروز آرم شبِ افکارِ شرق　　　　بر فروزم سینۂ احرارِ شرق

تمہید کتاب کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ "کاروانِ عشق و مستی کے امیر، مرشد روشن ضمیر مولانا رومیؒ کی روح، اس دانائے اسرارِ فرنگ" شاعر کو تو ہمات سے چور اور سحرِ فرنگ سے مسحور مشرق کی نجات اور بیداری کے مد نظر یہ ہدایت کرتی ہے کہ "تو خلیل الٰہی کی طرح مست رہ کیوں کہ اوہام اور اصنام پرست مشرق کے ہر کہن بتخانہ کو مسمار کرنا ہے ؎

باش مانندِ خلیل اللہ مست　　　　ہر کہن بتخانہ را باید شکست"

تیرا عہد رمزِ جاں سے آگاہ نہیں حُبِ غیر اللہ اس کا ضعف اور مرض ہے۔ ربطِ دین وسیاست کی حقیقتِ کبریٰ سے ناواقف ہے۔ تو فکرِ شرق کو سحرِ فرنگ سے آزاد کر اور اپنے سرور سے اس میں کچھ آب ورنگ پیدا کر ؎

اہلِ حق را زیں دو حکمت باز گوئے　　معنیِ دین و سیاست باز گوئے

تاریخ نبوت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی جنگ مذہب اور حریّت قومی کی ایک جامع اور نمایاں جنگ ہے۔ خصوصاً اس لیے کہ اسرائیلی جماعت کی ذہنی غلامی نے مسخ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ فرعونیوں سے آزاد ہونے کے بعد بھی بچھڑے کی پرستش کا سحر اُن کے دلوں سے جلد دور نہ ہوا۔ اقبال نے ذہنی غلامی اور سیاسی استبداد کے خلاف آواز بلند کرنے میں فرعون اور حضرت کلیمؑ کا تمثیلی پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے۔ حکمتِ فرعونی اور حکمتِ کلیمی کے عنوانوں سے مسلسل کئی اشعار لکھے ہیں۔ حکمت فرعونی کا خلاصہ یہ ہے ع مکر و فن، تخریب جاں، تعمیر تن۔ یا ع قوت فرمانروا معبودِ اُو۔ اس سے وحدتِ حیات دو نیم ہو جاتی ہے اس کا حریف "چوب کلیمؑ" ہے جس کی ایک صفت ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ شاہنشاہیت کا قصر اس کی نگہ میں صرف ایک دیر کہنہ ہے ؎

در نگاہش قصرِ سلطاں، کہنہ دیر　　غیرتِ اُو بر نتابد حُکمِ غیر

ذہنی اور عملی آزادی حریت کی ایک اور تعبیر تکبیرِ حسینؓ اور گرمیٔ بدر وحنین کے مثالی اور معیاری تاریخی حقیقت سے کی ہے۔ تاکہ یہ کوئی علم الاصنام کا افسانہ نہ سمجھا جائے۔ ان کے نزدیک زندگی اور حریت کے اس پیغام کا مرکزی نقطہ، تشریح لا الٰہ الا اللہ ہے جو ہمیشہ، ہر ملک، ہر قوم میں انبیاءؑ کی تعلیم کا مرکز اور محور رہا ہے! اور اب بھی نبوّت کبریٰؐ کا کلمۂ دعوت ہے۔ ایک بلیغ مصرعہ اس بحث کا خلاصہ ہے۔ کیا خوب کہا ہے اور ساری اقوام مشرق سے مخاطب ہو کر کہا ہے ع اُمتاں را لا جلال الّا جمال

اس کلمہ کے دو رکن ہیں۔ ایک نفی لا الٰہ (کوئی الٰہ نہیں) دوسرا اثباتی الّا اللہ (سوائے اللہ کے) الٰہ محاورۂ عرب میں ایسی ہستی کو کہتے تھے جس کے آگے انسان اُسے غنا اور قوت کا سرچشمہ سمجھ کر دست سوال دراز کرے اور سربسجود ہو جائے۔ کلمہ کا یہی مطلب ہے کہ کوئی شے یا ہستی اس کی مستحق نہیں کہ ہم سے حق کے خلاف اپنی اطاعت اور عبادت کا مطالبہ کرے۔ کیونکہ صرف خدا ہی کی ذات ہماری ہر احتیاج کا حقیقی سہارا ہے وہی عبادت اور بندگی کے مطالبہ کا حق رکھتی ہے جب ہم یہ یقین کرنے لگتے ہیں، اس حقیقت کا ادراک جب قوی ہو جاتا ہے کہ عبادت کا

مستحق اور واقعی مستعان اس کے سوا کوئی نہیں تو، وہم، شرک، خوفِ باطل، دیگر اخلاقی رذائل کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ وقت آپڑے تو اس یقین کی قوت کی بنا پر نہایت دلیری اور پامردی سے ہم ہر باطل قوت کے آگے سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ موجودات سے ڈرنے اور دبنے کی بجائے اُن پر غالب آنے اور ان کو مسخر کرنے کا ذوق پیدا ہوتا ہے۔ مشرق کو اس پیغام کی طرف متوجہ کرنے کی سخت ضرورت ہے اور وہ بھی تحقیق اور تفصیل کے ساتھ اس سے مادی رُعب اور سیاسی دباؤ بھی کم ہو جاتا ہے۔ حق کی حمایت اور انسانی عظمت کے خلاف انسانی دل و دماغ پر دستبرد کے مواقع کم ہو جاتے ہیں محکوم اور مجبور اقوام کے دل میں لا کی یہ آگ لگانی چاہیئے یہ غلام کی جنگ آزادی کے لیے پہلی شمشیر ہے ؎

ہر کہ اندر دستِ او شمشیرِ لاست　　　جملہ موجودات را فرمانرواست

یہی وہ عقیدہ ہے جو فردی اور قومی زندگی کے لیے سرچشمۂ جلال ہے لیکن اس کے ایجابی پہلو میں ہمارا ہاتھ خدا کے آگے پھیلتا ہے! اور اپنے ساتھ ساری کائنات کو خدا کے حضور میں ہاتھ پھیلائے پاتے ہیں، اسی لیے ہمارا سر صرف اسی کے آگے سجدہ میں جھکتا ہے۔ خوف اور طمع دراصل اسی کی ذات سے وابستہ ہوتے ہیں۔ قدرتی طور پر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جن اخلاقِ جمیلہ اور محاسنِ انسانیت کا فطری اور بلند نظر مذہب طالب ہے وہ ہم میں اُسی نقطۂ نظر سے پیدا ہونے لگتے ہیں۔ یہی انسانی نفس کا جمال ہے جس درجہ دلنشیں یہ حقیقت ہوگی اُسی قدر سنوار اور قوت ہم میں پیدا ہوں گے۔ قوموں اور ملتوں کے لیے یہ تعلیم اقبال کی نظر میں حرکتِ حیات اور سکونِ باطن کے لیے نہایت ضروری ہے مختلف مقامات پر عنوان اور تعبیر تشبیہ اور تفسیر کے اختلاف سے اس کی توضیح کی گئی ہے یہی بحث نظم کی جان ہے۔ اقبال کا خیال اور ان کی بڑی تمنا ہے کہ ساری اقوام مشرق خصوصاً ہندوستان کی ملتیں، مسلم، غیر مسلم سب اس تعلیم، اور اس فکر سے ایقان اور عمل میں مستفید ہوں لیکن ان کے نزدیک مسلمانانِ ہند کی غلامی خود اس امر کی دلیل ہے کہ وہ "لذّتِ ایمان" سے بڑی حد تک محروم ہیں۔ اگرچہ ان میں "حافظِ قرآن" ہی کیوں نہ ہوں ؎

از غلامے لذّتِ ایماں مجو　　　گرچہ باشد حافظِ قرآں مجو

ہند کی ایسی مذہبی تحریک اور بانیٔ تحریک پر سخت تنقید ہے جس کے تحت "قوتِ فرمانروائے وقت" کی

غلامانہ اطاعت کیشی کے لیے مذہبی استناد اور الہامی بنیاد مہیا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کے باعث ان کے ذوقِ انقلاب پر مُردنی سی چھا گئی اور "زشتی اندیشہ" نے انھیں خوار کر دیا۔ چنانچہ ایک ایسی تحریک کے بانی سے متعلق ارشاد ہوتا ہے ؎

دولتِ اغیار را رحمت شمرد　　　رقصہا گردِ کلیسا کرد و مُرد

شاعر نے اہلِ ہند کی فرقہ پروری اور تفرقہ پردازی پر بھی ایک نظم لکھی ہے جس کا عنوان ہے "اشکے چند برافتراقِ ہندیاں" جس میں اس پر بڑے درد و کرب کا اظہار کیا ہے کہ تنگ نظری نے پرانے فتنے یہاں برپا کر دیے اور اس طرح اہلِ فرنگ کو اس نام نہاد "نزاعِ کفر و دیں" کے ثالث بننے کا موقع ہاتھ آ گیا ؎

ہندیاں بایکدگر آویختند　　　فتنہائے کہنہ باز انگیختند

ہندوستان کے اہلِ فکر کے لیے یہ نظم ایک دعوتِ فکر و نظر ہے۔ انھیں اس کا بڑا رنج ہے کہ تنگ نظری کے باعث ہماری اینٹیں تعمیرِ غیر کا سرمایہ بنی ہوئی ہیں ؎

شرق و غرب آزاد و مانخچیرِ غیر　　　خشتِ ما سرمایۂ تعمیرِ غیر

دوسروں کے اشارہ پر ایسی زندگی اُن کی نظر میں مرگِ جاوداں ہے ؎

زندگانی بر مرادِ دیگراں　　　جاوداں مرگ است نے خوابِ گراں

ہندوستان کے نوجوانوں سے اُن کا مطالبہ ہے ع در غلامی زادۂ آزاد میر۔

اقوامِ عرب سے بھی "حرفے چند با اُمتِ عربیہ" کے عنوان سے چند باتیں کہی ہیں۔ جس میں خاص طور پر انھیں اس طرف متوجہ کیا ہے کہ کس طرح وہ فاصبحتم بنعمتہ اخواناً (تم اس کے فضل سے بھائی بھائی ہو گئے) کی نعمت، قوت اور اخوت کو ٹھکرا کر سیاستِ فرنگ کے تفرقہ انگیز قومیت میں مبتلا ہو گئے اور آج حادثۂ فلسطین وغیرہ کے سے فتنوں میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ ان سے شاعر کا سوال ہے کہ قیصریت اور کسریٰ کے خلاف کس نے علم بلند کیا تھا ع نعرۂ لاقیصر و کسریٰ کہ زد؟

اہمیت انقلاب روس پر نہایت جامع اور حکیمانہ تبصرہ ہے۔ شاعر کی نگاہ میں اس کا تخریبی اور سلبی پہلو نہایت قوی ہے ؎

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ　　　لا سلاطیں، لا کلیسا، لا الٰہ

لیکن اس کا تعمیری اور ایجابی پہلو محکم نہیں ع مرکب خود را سوئے اِلاّ نراند ۔ بغیر تعمیری پہلو کے حیات کا مقصد حاصل نہیں ہوتا ؎

در مقامِ لا نیاساید حیات سوئے اِلاّ می خرامد کائنات

روس کے موجودہ حالات اور رفتار سے جو اصحاب نظر باخبر ہیں وہی اس تعبیر کی قدر و قیمت اور بلاغت کا اندازہ کر سکتے ہیں کیسی پتہ کی کہہ گئے ہیں کہ نفیٔ بے اثبات مرگِ "اُمم" ہے۔ انقلابِ روس کے اثر کو کیا خوب ظاہر کیا ہے ع تیز نیشے بر رگ عالم زد است ۔

سیاسیاتِ حاضرہ پر ایک نظم ہے جس میں ایک بالغ نظر شاعر اور فلسفی دنیا کی موجودہ سیاسی رفتار پر ایک کلّی نقطۂ نگاہ سے تبصرہ کرتا ہے کہ "موجودہ سیاسی روش انسان کو فطرۃ اللہ" کا نگہبان نہیں رہنے دیتی"۔ ہدایت ہوتی ہے ؎

الحذر از گرمیٔ گفتارِ اُو الحذر از حرفِ پہلو دارِ اُو

غرض ہر مقام ایسا ہے کہ ع کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست ۔ "حرفِ پہلو دار" اقبال کی ایجاد کردہ نئی ترکیب ہے جس کے معنی ہیں ایسی بات جس کے کئی پہلو نکلتے ہوں۔

ایسی ہر نظم میں کئی اشعار ایسے ہونے لازم ہیں جن میں خاص معانی کو صرف نظم کے پیرایہ میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ لوازم شعر اس میں چنداں نہیں پائے جاتے اس مثنوی میں بھی ایسے اشعار جا بجا ملیں گے۔ مثلاً

کس نداند زشت و خوب کار چیست جادہ ہموار و ناہموار چیست

اقبال ایک حکیم ہی نہیں بلکہ فطری شاعر بھی ہیں، یہ افکار ان کے قلبی احساسات بھی ہیں اس لیے بکثرت ایسے اشعار ان کی ہر تصنیف اور اس تصنیف میں ہیں جو معنوی بلندی کے ساتھ ساتھ شعر کے محاسن صوری سے بھی آراستہ ہیں۔ مثلاً مرد آزاد یا مردِ حُر کے مقامات بنائے ہیں ع مرگِ اُو را از مقاماتِ حیات ۔ کیسی بلیغ تعبیر ہے یا ع ناامیداں سر بجیب اُو سر بکف ۔ بز دلی اور شجاعت کا کیسا نقشہ کھنچ جاتا ہے انھی کی زبان سے آخر میں یہ کہنا ہے ع از تب و تابم نصیب خود بگیر۔

غلام دستگیر رشید ام اے (عثمانیہ)

باب سوم

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی تخت نشینی

آپ کے سنہ جلوس میں مورخین کو اختلاف ہے۔ فرشتہ، برہان ماثر اور ہفت اقلیم کے مورخوں نے لکھا ہے کہ آپ ۵ رشوال ۸۲۵ھ کو تخت نشین ہوئے۔ تذکرۃ الملوک میں آپ کا سنہ ۸۳۰ھ میں تخت نشین ہونا بیان کیا گیا ہے۔ آپ کے زمانے کے سکوں سے بھی فرشتہ، برہان ماثر اور ہفت اقلیم ہی کی تائید ہوتی ہے۔ لہٰذا آپ ان مورخوں کے بیان کے مطابق ۵ رشوال ۸۲۵ھ م ۲۲ ستمبر ۱۴۲۲ء میں تخت نشین ہوئے۔ اور آپ کے بھائی فیروز شاہ بہمنی نے اپنی کمر سے تلوار نکال کر آپ کی کمر میں لگائی۔ اور خود ہی تخت فیروزہ پر ہاتھ پکڑ کر بٹھایا۔ تخت نشینی کے وقت آپ کی عمر ۵۱ سال کی تھی۔

اکابر و اعیان ملک، سادات، مشایخ، علماء و فضلاء، اُمراء و جمہور نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اُمراء، وزراء نے حسب دستور مبارک باد دی اور نذریں گذرانیں۔ علماء و مشایخ و شُعراء نے تہنیت میں اشعار مدحیہ و جملات دعائیہ پڑھے۔ تمام درباری مسرور اور شاداں ہوئے اور زیادہ خوشی اس بات سے ہوئی کہ دونوں بھائیوں میں اتفاق ہو گیا تھا[1]۔ خاص و عام آپ کے اخلاق اور بھائی اور بھتیجے کے ساتھ آپ کی محبت دیکھ کر نہایت مطمئن تھے۔ اور فیروز شاہ کی دور اندیشی و انصاف پسندی کی بھی بے انتہا تعریف و توصیف کرتے اور کہتے تھے کہ فیروز شاہ نے انصاف اور ہوشمندی سے بیٹے کی محبت کو بالائے طاق رکھ کر شاہزادہ حسن خاں کو ولیعہدی سے

---

[1] محبوب الوطن تذکرۂ سلاطین دکن حصۂ اول مولفہ مولوی عبدالجبار خاں صوفی۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی تخت نشینی

معزول کر کے بھائی کو تخت نشین کیا! اگر نہ کرتا تو لاکھوں آدمیوں کی جانیں جاتیں۔ ملک و رعایا برباد و تباہ ہوتے۔ تخت نشینی کے بعد آپ نے سادات و مشائخ، علما، و فضلا، و امرا، و جمہور کو بے انتہا انعامات اور گراں قدر تحائف سے سرفراز فرمایا! اور مہمات سلطنت کے انتظام میں بھائی کے حکم کے مطابق مشغول ہو گئے۔

آپ بھائی کا معالجہ ہوشیار حکیموں سے کراتے اور ہر روز صبح و شام بھائی کی عیادت و سلام کے لیے جاتے اور تسلی و دلاسا دیتے تھے۔ بھائی آپ کو عدل و انصاف و حفاظت رعایا کے لیے نصیحت کرتا اور یہ بھی کہتا تھا کہ شاہزادہ حسن خاں اور مبارک خاں اور دیگر اعزہ کے ساتھ عمدہ سلوک کیا کریں۔

آپ[1] کی تخت نشینی کے بعد دس روز تک زندہ رہ کر فیروز شاہ نے بروز دوشنبہ ۱۵ر شوال ۸۲۸ھ م ۲ر اکتوبر ۱۴۲۲ء کو انتقال کیا۔ برہان ماثر کا بیان ہے کہ فیروز شاہ کا انتقال ۱۱ر شوال ۸۲۵ھ کو ہوا۔ لیکن ہفت اقلیم کے مؤلف کا بیان ہے کہ فیروز شاہ کا انتقال آپ کی تخت نشینی کی شب یعنی ۵ر شوال ۸۲۵ھ کو ہوا جو غلط معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ زیادہ تر مورخین ۱۵ر شوال کی تائید میں ہیں۔ غرض انتقال کے بعد آپ نے تجہیز و تکفین کی تیاری کر کے جنازہ شاہانہ دبدبہ اور عظمت سے اٹھا کر باپ دادا کے پہلو میں دفن کیا۔ لیکن مفرح القلوب[2] کے مولف نے لکھا ہے کہ "فیروز شاہ کو اس کی وصیت کے مطابق اُسی کے تیار کروائے ہوئے گنبد میں جو شاہ کمال پیر کے پہلو میں تھا دفن کیا گیا۔ بظاہر مفرح کا قول فرشتہ کے قول سے صحیح و مرجح معلوم ہوتا ہے۔" لیکن میری تحقیق میں فرشتہ کا قول صحیح ثابت ہوتا ہے کیونکہ فیروز شاہ کا گنبد گلبرگہ میں سلاطین بہمنیہ کے گنبدوں کے سلسلہ میں واقع ہے۔

فیروز شاہ کی موت کے متعلق بھی مورخین میں اختلاف ہے۔ برہان ماثر اور فرشتہ میں

---

[1] ۔ فرشتہ۔

[2] ۔ مفرح القلوب آج کل ناپید ہے اس واقعہ کو مولانا صوفی عبدالجبار صاحب نے اپنی کتاب محبوب الوطن (تذکرہ سلاطین دکن) میں لکھا ہے اور مورخین نے اسی سے یہ واقعہ نقل کیا ہے۔

لکھا ہے کہ فیروز شاہ بیمار تھا اور اسی بیماری کی وجہ سے انتقال کیا لیکن انھیں کا بیان ہے کہ بعض تاریخوں میں لکھا ہے کہ آپ نے اپنے بھانجے شیر خاں کے وسوسہ و تحریک سے اسی کے ذریعہ فیروز شاہ کا گلا گھونٹوا دیا تھا۔ سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی تخت نشینی

برہان ماثر کے مولف نے اسی واقعہ کو کسی قدر وضاحت کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے کہ آپ کے بھانجے شیر خاں نے آپ کو مشورہ دیا کہ فیروز شاہ کی موجودگی بغاوت کا باعث ہوگی کیونکہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں اسی طرح دو بادشاہ ایک مقام پر نہیں رہ سکتے۔ پس آپ نے بھانجے کے اس مشورے سے اتفاق کر کے بھائی کو پوشیدہ طور پر مروا ڈالا بقول تذکرۃ الملوک چھوٹے بڑے مہمات سلطنت کو سلطان فیروز شاہ آپ کے حوالے کر کے خود عبادت الٰہی میں مشغول ہو گیا۔ آپ تمام امور سلطنت پر حاوی ہو گئے اور تمام اُمراء وارکان دولت اور سپاہی آپ کے مطیع و فرماں بردار بن گئے۔ اس کے بعد آپ فیروز شاہ کی مخالفت کرنے لگے۔ ایک روز ایک شخص نے سلطان فیروز شاہ سے عرض کیا کہ سلطان احمد تمہاری مخالفت کر کے مستقل بادشاہ ہونا اور تم کو سلطنت سے علیحدہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ بلا خدشہ بادشاہت کریں پس تمہیں ہر کام میں ان سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ یہ سنکر فیروز شاہ نے جواب دیا کہ تقدیر سے کیا چارہ ہے مجھے یقین ہے کہ میرے بعد وہی بادشاہ ہوں گے۔

مشہور ہے کہ فوج کے ستر سپاہی فیروز شاہ کے مخالف تھے فیروز شاہ نے اُن کے قتل کا حکم دیا تھا۔ آپ نے فیروز شاہ سے عرض کر کے ان کے گناہ معاف کرا کر قتل سے بچا لیا اور ان کے قرب و منزلت میں بھی اضافہ کیا اس لیے انھوں نے فیروز شاہ کے قتل میں آپ کا ساتھ دیا۔

سلطان فیروز شاہ کے ہاں بہت سے حبشی غلام تھے جو دن رات اس کی خدمت کیا کرتے تھے ان میں سے ایک غلام توشک خانہ (جامہ خانہ) کا افسر تھا جو ہر صبح خلوت میں جا کر سلطان کا لباس بدلا کرتا تھا آپ نے اس غلام کا قرب اور منزلت زیادہ دیکھی تو اس کو فریب دے کر فیروز شاہ کے قتل پر آمادہ کیا۔ ایک دن آپ فیروز شاہ کے قتل کے ارادہ سے محل میں داخل ہوئے۔ فیروز شاہ کے پاسبان اس سے واقف ہو کر آپ کے ساتھیوں سے لڑنے لگے دونوں طرف کے کئی آدمی اس لڑائی میں مارے گئے۔ بالآخر حبشی افسر توشک خانہ نے جو آپ کا

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی تخت نشینی

محرم راز تھا یا سبا لوں سے کہا کہ میں جا کر سلطان فیروز کو سلطان احمد کے حربہ قتل سے آگاہ کرتا ہوں اور آپ سے کہا کہ میں لڑائی کے وقت خلوت میں جا کر فیروز شاہ کا کام تمام کر دوں گا۔ پس اس موقع کو غنیمت جان کر وہ فیروز شاہ کی خلوت گاہ میں گیا اس وقت فیروز شاہ کلام اللہ کی تلاوت کر رہا تھا اس بدبخت حبشی نے خنجر مار کر فیروز شاہ کو قتل کر دیا اور لوگوں کو سلطان کے قتل کی اطلاع دی۔ فیروز شاہ کا لشکر اس خبر کو سن کر جنگ سے منھ موڑ کر اپنی اپنی جگہ واپس ہو گیا۔ بعض اُمراء نے فیروز شاہ کے بڑے لڑکے کو تخت پر بٹھانا چاہا لیکن اسی وقت آپ اس لڑکے کو قتل کر کے خود تخت نشیں ہو گئے۔

مراۃ العالم کے مولف کا خیال ہے کہ فیروز شاہ نے اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑ کر تخت پر بٹھایا اور اپنے بیٹوں کے لیے سفارش کی اور اس کے چند روز کے بعد فیروز شاہ کو زہر دیا گیا۔ جس کی وجہ سے وہ مر گیا۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا[1] جلد سوم میں ہے کہ آپ کی تخت نشینی کے وقت فیروز شاہ مرض الموت میں مبتلا تھا اس کی موت کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے بعض مورخوں کا خیال ہے کہ اس کو زہر دیا گیا جس کی وجہ سے وہ مر گیا۔

میری تحقیق میں تمام روایات بالا بالکل غلط ثابت ہوتی ہیں اور فرشتہ اور برہان ماثر کا قول صحیح معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی تخت نشینی کے وقت فیروز شاہ[2] مرض الموت میں مبتلا تھا اور

---

[1] کیمبرج ہسٹری جلد سوم میں یہ مضمون سر و لزلی ہیگ کا لکھا ہوا ہے اس نے تین تاریخوں کا ذکر کیا ہے لیکن نہیں معلوم ان تینوں سے کونسی تاریخیں مراد ہیں۔ میری تحقیق میں صرف مراۃ العالم میں لکھا ہے کہ فیروز شاہ کو زہر دیا گیا تھا اور فرشتہ، برہان ماثر اور تذکرۃ الملوک میں لکھا ہے کہ اس کو قتل کیا گیا تھا یہ چاروں تاریخیں اور ان کے مورخ فیروز شاہ کے ہمعصر نہیں تھے پس معلوم نہیں ہو سکا کہ سر و لزلی ہیگ کی تحقیق میں وہ کونسی تاریخیں ہیں جو فیروز شاہ کی ہمعصر تھیں۔

[2] اس کی تائید تمام حسب بالا تاریخوں سے ہوتی ہے۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی تخت نشینی

اسی مرض کی وجہ سے وہ آپ کی تخت نشینی کے دس روز کے بعد مرگیا اس کو نہ قتل کیا گیا اور نہ زہر دیا گیا۔ کیونکہ آپ سراپا رحم و محبت اور نہایت رقیق القلب وصوفی مشرب تھے ممکن نہیں کہ اس قسم کا فعل آپ سے صادر ہوا ہو۔ کیونکہ آپ کو بھائی کے جانب سے کسی قسم کا اندیشہ وخوف نہیں تھا خود بھائی نے آپ کو اپنی زندگی میں بادشاہ بنا دیا تھا۔ ہاں اگر آپ تخت نشین نہ ہوتے تو بھائی کو قتل کرنے کا گمان ایک حد تک صحیح ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ آپ کو بھائی اور بھتیجے سے بے انتہا محبت تھی جس وقت آپ قلعہ گلبرگہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھے اس وقت ہوشیار اور بیدار۔ باتفاق حسن خاں قلعہ پر چڑھے اور وہاں سے آپ پر گولے مارنے شروع کیے یہاں تک کہ آپ کے پاس گولے گرنے لگے اور آپ کے خاص رفیقوں میں سے کچھ لوگ ان گولوں کی زد سے اڑ گئے۔ ایسے موقع پر آپ نے حسن خاں کا مقابلہ نہیں کیا۔ اگر آپ چاہتے تو حسن خاں اور اس کے سارے ساتھیوں کو قتل کرا دیتے کیونکہ فیروز شاہ کی تمام بہترین فوج آپ سے مل گئی تھی۔ آپ نے حسن خاں کی محبت کی وجہ سے مقابلہ نہیں کیا بلکہ قلعہ کے عقب میں چلے گئے یہاں حسن خاں کے گولے نہیں آسکتے تھے۔ دوسری مرتبہ جب فیروز شاہ خود آپ کے مقابلے کے لیے آیا اور بے ہوش ہو کر واپس ہوا تو اس وقت بھی اگر آپ چاہتے تو بھائی کا تعاقب کر کے گرفتار کر لیتے اور قتل کرا دیتے لیکن آپ نے ادباً بادشاہ کا تعاقب نہیں کیا۔ کیونکہ آپ بھائی اور بھتیجے کا خیال ہمیشہ رکھتے اور کبھی ادب کے دائرہ سے قدم باہر نہیں رکھتے تھے۔ جس وقت فیروز شاہ نے قلعہ کا دروازہ کھول کر آپ کو اندر بلایا اس وقت آپ ادب سے بھائی کے قدموں پر سر رکھ کر زار زار رونے اور عذر معذرت کرنے لگے اور پھر ادب سے اپنی قدیم جگہ کھڑے ہو گئے جہاں آپ ہمیشہ دربار میں زمانہ خان خانانگی میں کھڑے رہتے تھے۔ جب آپ بھائی کا اس قدر ادب ولحاظ رکھا کرتے تھے تو آپ سے کیسی امید ہو سکتی ہے کہ آپ نے بھائی کو قتل کروایا یا زہر دلوایا ہو۔ اس کے علاوہ شاہزادہ حسن خاں کے ساتھ آیندہ آپ نے جو برتاؤ کیا اس سے بھی یہ امر خلاف قیاس معلوم ہوتا ہے۔

تذکرۃ الملوک کا دعوے کہ آپ نے بھتیجے کو بھی قتل کروا دیا بالکل غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کی تائید کسی اور تاریخ سے نہیں ہوتی۔ فرشتہ کے قول کی تائید متعدد تواریخ سے

طان احمد شاہ ولی بہمنی کی تخت نشینی

ہوتی ہے۔ اس لیے وہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے بھتیجے کے ساتھ جو سلوک کیا اس کو میں ذیل میں قلمبند کروں گا۔ حسن خاں آپ کے زمانے میں زندہ تھا اور نہایت عیش و آرام کی زندگی بسر کرتا رہا۔ تذکرۃ الملوک کا تمام بیان از ابتدا تا آخر بالکل غلط اور بے بنیاد معلوم ہوتا ہے۔ فرشتہ اور برہان ماثر نے کسی تاریخ کا نام یا حوالہ نہیں دیا ہے جس میں فیروز شاہ کے قتل کا ذکر کیا گیا ہو بلکہ انھوں نے لکھا ہے کہ "بعض تاریخوں میں لکھا ہے کہ احمد خاں نے اپنے بھانجے شیر خاں کے ذریعہ فیروز شاہ کا گلا گھونٹوا دیا"۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فرشتہ اور برہان ماثر کے مولفین کو اس میں شک ہے اگر انھیں اس واقعہ کا یقین ہوتا تو تواریخ کا حوالہ ضرور دیتے جیسا کہ انھوں نے اکثر واقعات کے ضمن میں دیا ہے۔

مہمات سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد آپ نے سب سے پہلے خلف حسن بصری کو وکیل امور سلطنت کر کے ہزار و دو صدی کا منصب عطا کیا اور ملک التجار کا خطاب دیا۔ اور ہوشیار عین الملک اور بیدار نظام الملک غلاموں کی وفاداری اور آقا پرستی کی قدر فرماکر آپ نے اول الذکر کو خطاب امیر الامرائی دے کر ہزار و پانصدی کے منصب اور آخر الذکر کو دولت آباد کی فوج کی سپہ سالاری اور منصب دو ہزاری سے سرفراز فرمایا۔ اور فیروز شاہ کے بیٹے حسن خاں کو جو وارث تاج و تخت تھا اور جمیع ارکان دولت جس کے اندھا، قتل یا قید کرنے کی صلاح دیتے تھے منصب پانصدی عطا کیا اور فیروز آباد جاگیر میں دیا اور وہاں اس کو آزادی سے رہنے اور اگر جی چاہے تو فیروز آباد سے چار کوس کے فاصلہ تک بلا اجازت سیر و شکار کرنے کی اجازت بھی عطا کی۔ یہ شہزادہ آپ کی زندگی تک وہاں سیر و شکار میں مشغول رہ کر اپنی زندگی خوب مزے سے بسر کرتا رہا۔ اور اس بے فکری کی زندگی کو تاج شاہی سے لاکھ درجہ غنیمت سمجھا۔ اس کے علاوہ فیروز شاہ کی نصیحت کے مطابق آپ نے دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ بھی نہایت عمدہ سلوک کیا جس کی وجہ سے وہ

لہ۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ حسن خاں نے کبھی چچا کے دل کو اپنے سے آزردہ اور رنجیدہ نہ ہونے دیا۔ چچا کی وفات کے بعد حسن خاں کے سر پر مصیبت آئی اور چچا کے جانشینوں نے اس کو نابینا

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی تخت نشینی

آپ کے مطیع و فرمانبردار تھے۔ اور اُمراء و وزراء و مشایخ و علماء و فقراء و شعراء کو آپ نے صلات و عطیہ جاگیرات سے ممتاز فرمایا جس کی وجہ سے تمام آپ کے احسان و کرم کے شکر گذار ہو گئے۔

برہان ماثر میں ہے کہ آپ کے سات[1] صاحبزادے تھے۔ ان میں سے بڑے صاحبزادہ کا نام ظفر خاں تھا۔ آپ نے بادشاہ ہونے کے بعد خان خانان کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ دوسرے صاحبزادے کو محمود خاں کا خطاب اور تیسرے صاحبزادے کو محمد خاں کا خطاب

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کر کے فیروز آباد کے قلعہ میں قید کر دیا جہاں اسی حالت میں اس نے وفات پائی۔ اس کے نابینا کرنے کی کوئی وجہ بیان نہیں کی گئی ہے۔ لیکن کسی قدیم تاریخ سے اس کی تائید نہیں ہوتی ہے۔ حسن خاں کے بھائی مبارک خاں کی لڑکی نرگس بی بی سے جو تاریخ دکن میں ملکہ مخدومہ جہاں کے نام سے یاد کی جاتی ہے سلطان علاء الدین احمد شاہ دوم بن سلطان احمد شاہ ولی بہمنی نے اپنے ولی عہد شاہزادہ ہمایوں شاہ بہمنی کی شادی کی تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ احمد شاہ اور فیروز شاہ کی اولاد میں خوشگوار تعلقات قایم تھے۔ اور شادی بیاہ کا سلسلہ جاری تھا۔ اس کے علاوہ کسی تاریخ سے دونوں کی اولاد کے ناخوشگوار تعلقات ہونے کا پتہ نہیں چلتا۔ اگر ہوتے تو شادی بیاہ کا ہونا ناممکن تھا۔ اس کے سوا حسن خاں سے یہ امید بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ اس نے چچا کے انتقال کے بعد سلطنت حاصل کرنے کے لیے کوشش کی ہو جس کی وجہ سے اس کو اندھا کیا گیا کیونکہ وہ عیش کا متوالا تھا اور اس کو دنیا و ما فیہا کی کچھ خبر نہ تھی۔ اور بغیر اجازت وہ فیروز آباد سے باہر چار کوس سے زیادہ نہیں جا سکتا تھا۔ اور نہ اس کے پاس فوج وغیرہ تھی۔ غرض ایسے عیش پسند شخص سے سلطنت حاصل کرنے کی کوشش کرنے کی کوئی امید نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا احمد شاہ کے جانشینوں کا حسن خاں کو اندھا کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

[1] برہان ماثر۔ اس کے متعلق مفصل بحث آیندہ باب "احمد شاہ کے آخری ایام" میں کی جائے گی کیونکہ دیگر تواریخ سے آپ کے صرف چار صاحبزادوں کا ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس میں ان چاروں کے نام بھی دیئے ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے برہان ماثر کی روایت غلط ثابت ہوتی ہے۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی تخت نشینی

عطا فرمایا ظفر خاں آپ کے بڑے صاحبزادے اور ولی عہد تھے۔ مگر دوسرے تمام مورخوں نے بڑے صاحبزادے کا نام علاء الدین لکھا ہے اور کسی نے ظفر خاں کا نام نہیں لکھا ہے صاحبزادوں کو جو خطابات دیئے گئے ہیں ان کا ذکر بھی کسی تاریخ میں نہیں ملتا۔ فرشتہ میں اس کے متعلق کچھ بھی نہیں لکھا ہے۔ برہان ماثر سے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ باقی چار صاحبزادوں کے نام کیا تھے اور انھیں کیا کیا خطابات عطا کیئے گئے تھے۔ میری تحقیق میں صاحبزادوں کو بادشاہ ہوتے ہی خطابات سے سرفراز فرمانا پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتا اور کسی دوسری تاریخ سے اس کی تائید بھی نہیں ہوتی ہے۔

غرض آپ نے اپنے پاکیزہ اخلاق اور دلکش عنایتوں سے سب خاص و عام کو اپنا مطیع بنالیا اور ہر شخص کے دل میں آپ کی جگہ ہوگئی جس کی تائید آیندہ واقعات سے ہوگی۔ ان تمام امور سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے انتظامات سلطنت کی طرف توجہ کرکے ہر شعبہ کو ترقی دی۔

باب چہارم

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے انتظاماتِ سلطنت

آپ کو جو سلطنت ملی وہ فیروز شاہ کے آخری زمانے میں فتوحات کے باعث بہت وسیع ہوگئی تھی۔ خزانہ بھرا ہوا تھا سوار اور پیادہ فوج کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ تھی۔ فیلخانہ میں تین سو سے زیادہ جنگی ہاتھی تھے علیٰ ہذالقیاس ترکی، عربی اور عراقی گھوڑے بہت تھے۔ شترخانہ میں بہت اونٹ تھے۔ آلاتِ حرب وجنگ اور سامان توپ و تفنگ یعنے گولوں کے تودے اور باروت کے کوٹھے بھرے ہوئے تھے۔ سلح خانہ، توشکخانہ اور آبدار خانہ وغیرہ کارخانہ جات بھی معمور تھے۔ لیکن فیروز شاہ کو اس کی آخری عمر میں بیجانگر کے آخری حملہ میں شکست ہوئی تھی۔ اس جنگ میں صدہا سپاہیوں کا قتل عام ہوا۔ مسجدیں شہید کی گئیں اور گاؤں اور شہر تباہ و بے چراغ ہوئے غرض ہر طرح کے ستم توڑے گئے اور سلطنت کا ایک بڑا علاقہ دیوارئے کے قبضہ میں چلا گیا تھا لیکن آپ نے ہر طرف سے لشکر جمع کرکے اس زور و شور سے حملہ کیا کہ وہ اس کی تاب نہ لا سکا اور آپ نے اس کا پیچھا کر کے اس کو حدودِ مملکت بہمنیہ سے باہر کردیا لیکن اس کی وجہ سے ملک تباہ، رعایا پریشان اور خزانہ خالی ہوگیا تھا۔ فوج بھی بہت کم ہوگئی تھی۔ غرض آپ کو جو سلطنت ملی تھی وہ رقبہ میں تو بہت وسیع تھی لیکن اس میں انتشار اور جھگڑے تھے اور ہر طرف پریشانی اور عام ابتری پھیلی ہوئی تھی۔

لہ۔ فرشتہ۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے انتظامات سلطنت

جس زمانے میں آپ بادشاہ ہوئے ہیں ہندوستان کی عام سیاسی حالت یہ تھی کہ سارے ملک میں ابتری اور طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ مرکزی سلطنت برائے نام رہ گئی تھی۔ طاقتور صوبہ دار اپنی اپنی جگہ خود مختار بن بیٹھے تھے چنانچہ اس کا اندازہ ذیل کے حالات سے ہو سکتا ہے۔

دہلی پر خاندان سادات کی حکومت تھی لیکن ان کی سلطنت صرف دہلی اور اس کے نواح تک محدود تھی۔ جونپور میں سلاطین شرقی آزادی کا جھنڈا اڑا رہے تھے۔ راجپوتانہ کے چھوٹے چھوٹے راجہ خودمختاری کے نشے میں چور تھے۔ گجرات میں آل مظفر کی فرمانروائی تھی۔ وسط ہند میں خاندان فاروقیہ اور مالوہ میں خانوادۂ خلجیہ کا زور تھا۔ دکن آپ کے زیر نگیں تھا۔ بیجانگر کی ہندو ریاست ساحل ملابار و کوکن سے لیکر دریائے کرشنا کے جنوبی کنارے تک پھیلی ہوئی تھی۔ ساحل کارومنڈل پر رایان اڑیسہ کا تسلط تھا جو دکن کی فتح کے خواب دیکھ رہے تھے۔ غرض ملک ہند بے شمار چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا جن میں ہمیشہ لڑائی اور فساد کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

آپ کو جو سلطنت ملی تھی خود اس کی حالت یہ تھی کہ اس کے جنوب میں بیجانگر کی طاقتور سلطنت موجود تھی جو ہمیشہ اس تاک میں رہتی تھی کہ جب کبھی موقع ملے سلطنت بہمنیہ کو ہضم کر جائے۔ مشرق میں رایان اڑیسہ تھے اور یہ بھی سلطنت بہمنیہ کا نام و نشان مٹانے پر آمادہ نظر آتے تھے۔ شمال میں سلاطین مالوہ و خاندیس اس کے جانی دشمن تھے۔ مغرب میں سلاطین گجرات بھی اس ریاست پر دندان آز تیز کیے ہوئے تھے۔ یہ تو بیرونی حالات تھے۔ اندرونی حالات بھی کچھ اطمینان بخش نہیں تھے۔ ملکی اور غیر ملکی کا جھگڑا[1] ایک زمانے سے چلا آ رہا تھا۔ یہاں اکثر ایسے مسلمان تھے جن کی دو چار نسلیں اس ملک میں گذر چکی تھیں۔ یہ لوگ نو واردوں کو آفاقی یا غیر ملکی کہا کرتے تھے اور سلاطین بہمنیہ کے وزرا، امرا، اور فوج میں غیر ملکی لوگ ہوا کرتے تھے۔ اس طرح دکنیوں کا اثر دربار اور میدان جنگ میں بہت کم ہو رہا تھا۔ اس لیے جب سلاطین بہمنیہ اپنے ہاں کسی غیر ملکی کو ملازم رکھتے تو یہ بہت ناراض ہوتے اس طرح یہاں ملکیوں اور غیر ملکیوں کی دو پارٹیاں بن گئیں تھیں جن میں ہمیشہ رقابت رہا کرتی تھی اس کی وجہ سے ملک میں آئے دن فتنہ و فساد برپا رہا کرتا۔ اوّل اوّل آپ کے زمانے میں

---

[1] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے انتظامات سلطنت

اس رقابت نے زور پکڑا کیونکہ آپ نے غیر ملکیوں کی ایک بڑی تعداد کو فوج میں بھرتی کر لیا تھا اور اسی رقابت کی وجہ سے کئی جنگیں اور کشت و خون ہوئے۔ آپ نے اس کو دور کرنے کی تدابیر اختیار کیں جن سے یہ فتنہ فرو ہوا۔ لیکن سلطان علاء الدین احمد شاہ دوم کے زمانے میں یہ فساد اس قدر بڑی قوت کے ساتھ ظاہر ہوا کہ سلطنتِ بہمنیہ کا خاتمہ ہی کر دیا۔

غرض ایسے پرآشوب زمانے میں آپ تختِ شاہی پر متمکن ہوئے۔ آپ قواعدِ لشکرکشی اور آئینِ فرمانروائی خوب جانتے تھے اس لیے بجائے بدلہ لینے، فتوحات کا سلسلہ شروع کرنے اور حدودِ سلطنت کو مستحکم کرنے کے آپ نے سب سے پہلے انتظامِ مہماتِ سلطنت اور اندرونی استحکام کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ ابتداء میں آپ نے اپنی بے مثل انتظامی قابلیت کو جو آپ کے تجربہ کار ہوشیار اور کار آزمودہ ہونے پر دلالت کرتی ہے کام میں لاکر فیروز شاہ کے زمانہ کے انتظام میں کچھ تغیر نہیں کیا مگر رفتہ رفتہ بعد میں بعض خدماتِ قدیمہ پر جدید عہدہ دار مقرر کیے اور امراء، وزراء و مشائخ و علماء و فقراء و شعراء کو صلات عطیہ جاگیرات سے ممتاز فرمایا۔

ذیل میں سلطنتِ بہمنیہ کے مختلف شعبوں کے متعلق تفصیل سے لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ سلطنت کے استحکام کے لیے آپ نے انھیں میں اصلاحات نافذ کیں جن سے آپ کا تدبر اور دانشمندی ظاہر ہے۔

انتظامی اصلاحات

۷۵۹ھ م ۱۳۵۳ء[۱] میں جب سلطان علاء الدین حسن گانگو بہمنی نے وفات پائی ہے تو اس زمانے میں سلطنت ملک مہاراشٹر اضلاع رائچور، مدگل اور کرناٹک اور تلنگانہ کے صوبے کے تھوڑے سے حصے تک محدود تھی۔ سلطان احمد شاہ بن سلطان علاء الدین حسن گانگو نے تخت نشیں ہونے کے بعد سلطنتِ بہمنیہ کو چار صوبوں یعنی گلبرگہ، دولت آباد، تلنگانہ اور برار میں منقسم کیا اور ہر ایک صوبہ کئی ضلعوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر ضلع کا رقبہ تین سو میل تھا اور ہر ضلع تقسیم تھا کئی تعلقات میں اور ہر تعلقہ کئی دیہات میں۔ صوبے کا خاص عہدہ دار صوبہ دار تھا جس کو بہمنیوں کی اصطلاح میں طرفدار یا نائب اور

---

[۱] فرشتہ۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے انتظاماتِ سلطنت

سرلشکر کہا کرتے تھے۔ تمام صوبے کی مالگزاری اور مالیات کے معاملات اور فوجی اور جنگی انتظامات اسی کے سپرد تھے۔ اور صوبے میں امن و امان قایم رکھنا بھی اسی کے فرایض میں داخل تھا۔ اس کا تقرر راست بادشاہ کی طرف سے عمل میں آتا تھا۔ اس کے ماتحت عہدہ داروں کا تقرر یہ خود کرتا تھا۔ صوبے کے تمام قلعے اسی کے ماتحت ہوتے تھے۔ یہ جس شخص کو چاہتا تھا اپنی طرف سے قلعہ کا تھانہ دار مقرر کرتا تھا۔ محمد شاہ بن علاء الدین حسن گانگو بہمنی نے ممالک محروسہ کے ہر طرفدار کو جدا خطاب دیا تھا جیسے دولت آباد کے طرفدار کا خطاب "مسندِ عالی" طرفدار برار کا خطاب "مجلسِ عالی" طرفدار تلنگانہ کا خطاب "اعظم ہمایوں" اور طرفدار پایہ تخت گلبرگہ (حسن آباد) اور بیجاپور کا خطاب "وکیل السلطنت" اور "ملک نائب" بھی تھا۔ ممالک محروسہ کے سپہ سالار کو امیر الامرا کا خطاب عطا ہوتا تھا۔ مدتوں تک یہ خطابات دکن میں رائج رہے۔ آپ کے زمانے میں ملک کا رقبہ بہت بڑھ گیا تھا۔ بیجانگر، تلنگانہ، کانکن اور اڑیسہ کے اکثر علاقے سلطنتِ بہمنیہ میں شامل ہو چکے تھے لیکن باوجود اس وسعت کے ملک کی تقسیم اب بھی وہی تھی جس کو سالہا سال پیشتر محمد شاہ بن سلطان علاء الدین حسن گانگو نے کی تھی۔ اس سے یہ خرابی پیدا ہو رہی تھی کہ طرفدار بہت طاقتور ہوتے جا رہے تھے اور بادشاہ کا ان کو پوری طرح قابو میں رکھنا دشوار نظر آ رہا تھا۔ آپ نے اس صورت حال کو ملک کے لیے خطرناک تصور کیا اور ان طرفداروں اور اعلیٰ عہدہ داروں کے رقبے اور اقتدارات میں کمی کر کے ان کے اختیارات کی ایک حد معیّن کر دی اس کی وجہ سے طرفداروں کی طاقت کم ہو گئی اور آپ کو ان پر پورا قابو حاصل ہو گیا۔ آپ نے ملک کی تقسیم میں کوئی ردّ و بدل نہیں کیا کیونکہ اس سے ملک میں بدامنی اور فساد پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ آپ نے اپنی دور اندیشی اور تجربہ کارانہ پالیسی کو کام میں لا کر آیندہ پیش آنے والے خطرے سے ملک کو بچا لیا اور طرفداروں کی طاقت میں کمی کر کے اپنی طاقت میں بہت اضافہ کر لیا۔ آپ کے بالکل برعکس خواجہ جہاں عماد الدین محمود گاواں[1] وزیر محمد شاہ بن ہمایوں شاہ بہمنی نے ملک کو بجائے چار صوبوں کے آٹھ صوبوں میں تقسیم کیا۔ اور طرفداروں یا سرلشکریوں کے

---

[1] فرشتہ۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے انتظامات سلطنت

اقتدارات میں بھی بہت زیادہ کمی کر دی اس کی وجہ سے خودغرض ارکان سلطنت کے منصوبوں میں خلل پڑنے لگا اور انھوں نے خواجہ جہاں سے دشمنی کر کے اس کو قتل کرادیا اور ملک میں اسی کی وجہ سے فتنے اور فسادات پیدا ہوئے جس کا نتیجہ سلطنت بہمنیہ کے خاتمہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ آپ نے قدیم تقسیم کو ہی قایم رکھا تھا جس کی وجہ سے سلطنت بہمنیہ کو خوب ترقی و عروج نصیب ہوا۔

آپ نے اپنے عہد میں ہر ایک طرفدار کو دو ہزار گھوڑوں کے سپہ سالار کا رتبہ دے رکھا تھا اور اس کی صوبہ واری فوج اسی تعداد تک معین نہیں تھی بلکہ اس میں اس وقت اضافہ ہوتا تھا جبکہ آپ خود بنفس نفیس بڑے جاگیرداروں کی کثیر فوج کے ساتھ میدان جنگ میں تشریف لے جاتے۔ اس سے طرفداروں کے تحت ایک وسیع علاقہ ہونے کے باوجود ان کی قوت کم ہو گئی تھی جس کی وجہ سے ان کے سرکشی و بغاوت کرنے یا سلطنت کے خلاف سازش میں شریک ہونے کا اندیشہ باقی نہیں رہا تھا۔

آپ نے حسب ذیل اشخاص کا تقرر ان صوبوں کی طرفداری و سرلشکری پر فرمایا جو نہایت تجربہ کار اور موزوں تھے۔

۱۔ بیدار نظام الملک طرفدار و سرلشکر دولت آباد۔ ۲۔ عبدالقادر خان جہاں طرفدار برار ۳۔ عبداللطیف خاں اعظم طرفدار تلنگانہ۔ ۴۔ خلف حسن بصری ملک التجار طرفدار ملک نائب و وکیل السلطنت پایہ تخت حسن آباد گلبرگہ و بیجاپور۔

سلطنت بہمنیہ میں قدیم سے آٹھ وزارتیں قایم تھیں جو آپ کے زمانے میں بھی برابر جاری رہیں ان کے نام اور فرائض حسب ذیل ہیں۔

۱۔ وکیل السلطنت۔ ۲۔ وزیر کل۔ ۳۔ امیر جملہ۔ ۴۔ وزیر اشراف۔ ۵۔ ناظر۔ ۶۔ پیشوا۔ ۷۔ کوتوال۔ ۸۔ صدر جہاں۔

اس وقت کسی تاریخ سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان عہدوں سے کیا کیا کام متعلق تھے۔

لہ۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے انتظامات سلطنت

البتہ اس قدر پتہ چلتا ہے کہ وکیل السلطنت کا رتبہ سول عہدوں میں سب سے اعلیٰ تھا ۔۔۔ اور وہ زیادہ تر بطور نائب بادشاہ کے ہوتا تھا اور بادشاہ کی غیر حاضری میں کاروبار سلطنت کو انجام دیتا تھا۔ جب کبھی کوئی شخص اس عہدہ پر مقرر ہوتا تھا تو اس کو ایک انگشتری بطور علامت عہدہ دی جاتی تھی۔ وزیر کل کے ذمے اندرونی انتظامات سلطنت تھے۔ امیر جملہ کو صدر المہام فینانس کہنا چاہیئے کیونکہ اس کے ذمے تمام سلطنت کے مالیات کا انتظام ہوتا تھا۔ وزیر اشراف کے فرائض میں خارجی معاملات اور سرکاری رسومات کی ادائی داخل تھی۔ ناظر کو معتمد فینانس کہنا چاہیئے کیونکہ یہ عہدہ دار امیر جملہ کے مددگار کی حیثیت سے کام کیا کرتا تھا۔ پیشوا وکیل السلطنت کے ہر کام میں شریک ہوا کرتا تھا اور اس کے کاروبار میں مدد دینا اس کا فرض تھا۔ غرض اس کے فرائض وکیل السلطنت کے فرائض سے ملتے جلتے تھے۔ کوتوال نہ صرف افسر پولیس تھا بلکہ معمولی مجرموں کو بحیثیت مجسٹریٹ سزا بھی دیتا تھا اور مہتمم محابس بھی ہوا کرتا تھا۔ صدر جہاں قاضی القضاۃ کا لقب تھا۔ یہ چیف جسٹس اور صدر المہام امور مذہبی و اوقاف کی خدمت انجام دیتا تھا اور اکثر اوقات ایک ہی شخص کو متعدد عہدے دیئے جاتے تھے[1]۔

ان وزارتوں کے علاوہ سلاطین بہمنیہ کے دربار میں چار دو ہزاری منصبدار بھی رہتے تھے یہی چار امیر صوبوں کے طرفدار اور سرلشکر مقرر کیئے جاتے تھے۔ امیر الامرا ایک ہزار و پانصد کا منصبدار ہوتا تھا اسی طرح وکیل السلطنت کو ہزار دو صدی کا منصب عنایت ہوتا تھا باقی امیر اور منصبدار ہزار سے زاید اور سو سے کم کے نہ ہوتے تھے۔ جو امیر ایک ہزار یا اس سے زاید کا منصبدار مقرر کیا جاتا تھا اُسے طوغ و علم اور نقارہ بھی دربار شاہی سے مرحمت ہوتا تھا۔

آپ نے قدیم عہدہ داروں میں کچھ تغیر کر کے حسب ذیل خدمات قایم کی تھیں۔

نام عہدہ دار مع خطاب	نام عہدہ
ملک التجار خلف حسن بصری۔	وکیل السلطنت و منصب ہزار دو صدی

---

[1] فرشتہ۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے انتظامات سلطنت

ہوشیار عین الملک	امیر الامراء و منصب ہزار پانصدی
بیدار نظام الملک	طرفدار و سرلشکر دولت آباد و منصب دو ہزاری
عبدالقادر سرلحداران[1] مخاطب بہ خان جہاں	طرفدار و سرلشکر برار و منصب دو ہزاری
میر علی سیستانی	امیر سہ صدی
قاسم بیگ صف شکن	منصب پانصدی و جاگیردار کلہر
میر شمس الدین قمی	مصاحب
سیف اللہ حسن آبادی	"
عبداللطیف مخاطب بہ خان اعظم	طرفدار و سرلشکر تلنگانہ و منصب دو ہزاری
عبداللہ خاں کابلی	حاکم جنیر و منصب صدی
خواجہ حسن اردستانی امیر صدہ	استاد تیراندازی شاہزادگان
حسن خاں	امیر سہ صدی
ملا عبدالغنی	صدر
عالم خاں	امیر صدہ
لودھی خاں	"
دلاور خاں	"
سید حسن بدخشی	امیر سہ صدی
میر عابد علی کرد المخاطب بہ کافر کش	امیر یکہزاری

---

[1] ابتداء میں خدمت سرلحداران پر یہ مامور تھے اسی خدمت کے دوران میں جبکہ سلطان کو بیجانگر کی فوج نے گھیر لیا تھا اس وقت انھوں نے سلطان کی جان بچائی تھی اسی کے صلہ میں سلطان نے ان کو برادر جاں بخش یار حق گذار کا لقب اور خان جہاں کا خطاب اور منصب دو ہزاری دے کر طرفدار و سرلشکر تلنگانہ بنایا تھا۔ اس کا مفصل ذکر فتوحات کے تحت بیان کیا جائے گا۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے انتظامات سلطنت

عبد القادر بن عیسیٰ بن محمود بن عماد الملک	سرلشکران و منصب دو ہمدی
خواجہ عماد الدین سیستانی	" " "
عزیز خاں	مصاحب
خواجہ بیگ المخاطب بہ قلندر خاں	داروغہ گلبرگہ و منصب دو صدی
خسرو بیگ اوزبک امیر صدہ	استاد و اتالیق شاہزادگان
میر فرخ بدخشی	امیر سہ صدی
فرخ خاں	" "
مولانا نجم الدین	مفتی
عبد اللہ خاں نبیرہ اسمٰعیل منج	امیر صدہ و افسر جبیرہ
شیخ حبیب اللہ جنیدی	مصاحب
میر نور اللہ[1] بن شاہ خلیل اللہ بن شاہ نعمت اللہ کرمانیؒ	ملک المشایخ و داماد سلطان
شاہ قلی سلطان	شاہزادہ چنگیزی
شیخ آذری	ملک الشعراء
ملا شرف الدین مازندرانی	خوشنویس
مجنوں سلطان	شاہزادہ چنگیزی
شیر ملک[2]	کوتوال
قاضی احمد مقبول[3]	ملک العلماء و صدر جہاں

قراخان کرد ۔ رستم خاں مازندرانی ۔ بہادر خاں اوزبک ۔ میر ابو القاسم جرجانی ۔ شاہ حبیب اللہ بن شاہ خلیل اللہ داماد سلطان و جاگیردار قصبہ بیڑ ۔ شاہ محب اللہ بن شاہ حبیب اللہ داماد

لہ ۔ فرشتہ نے میر نور اللہ اور برہان ماثر نے مرزا نور اللہ لکھا ہے ۔

۲و۳ ۔ ان کا ذکر فرشتہ میں نہیں ہے ۔ یہ دونوں ناموں اور عہدوں کا ذکر برہان ماثر نے کیا ہے ۔ اور میں نے اسی سے لیا ہے ۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے انتظامات سلطنت

شاہزادہ علاءالدین اور حسین بن حسن برادر خلف حسن بصری اُمراء کے گروہ میں داخل تھے۔ برہان مآثر میں لکھا ہے کہ آپ نے محمد بن علی بادردی مخاطب بہ خواجہ جہاں کو جو سلطان سنجر سلجوقی کی اولاد سے تھا سر نوبت میسرہ مقرر فرمایا اور لّلو خان کا خطاب دیا پھر اس کے بعد جب سر نوبت میمنہ مقرر فرمایا تو سارنگ خاں کے خطاب سے مفتخر فرمایا۔ قاضی نظام الدین شرقی نبیرۂ سید شریف کو شرف جہاں کے خطاب سے مشرف فرمایا اور سید عبدالمومن نبیرۂ مخدوم جہانیاں سید جلال بخاریؒ کو سید اجل جلال خان کے لقب سے ملقب فرمایا۔ آپ نے سنہ ۸۳۳ھ م ۱۴۲۹ء میں بیدار نظام الملک طرفدار و سر لشکر دولت آباد کی جگہ ملک التجار خلف حسن بصری کو دو ہزاری منصبدار بنا کر طرفدار و سر لشکر دولت آباد مقرر فرمایا اور بندر دابول اور دیگر بندرگاہوں اور سواحل کا انتظام بھی انھیں کے سپرد کیا اور ان کی جگہ میاں محمود[1] نظام الملک کو جو عقل و علم و فضل میں لاثانی تھے اور مشہور بزرگ شیخ فریدؒ شکر بار کی اولاد سے تھے خلف حسن بصری کی جگہ وکیل السلطنت ملک نائب اور طرفدار و سر لشکر حسن آباد گلبرگہ و بیجاپور مقرر فرمایا۔ اُن کے علاوہ سلطنت کے آخری ایام میں آپ نے شہزادہ محمود خاں کو رام گڑھ۔ ماھور۔ کلم اور برار کے بہت سے حصوں کا حاکم بنایا اور شہزادہ داؤد خاں کو حاکم تلنگانہ و راپچور[2] و چنول مقرر کیا اور شہزادہ علاءالدین کو (جنھیں ظفر خاں کا لقب تھا) ولی عہد اور شہزادہ محمد خاں کو شریک ولی عہد مقرر فرمایا۔

دربار عام

سلاطین[3] بہمنیہ کے ہاں دو قسم کے دربار ہوا کرتے تھے جن کو ان کی اصطلاح میں "بارگاہ کل" اور "بارگاہ خاص" کہتے تھے۔ بارگاہ کل دربار عام تھا اور اس میں ہر امیر و فقیر باریاب ہو سکتا تھا۔ سلطان علاءالدین حسن گانگو بہمنی کے زمانے میں یہ دربار ہفتہ میں ایک وقت بروز چہارشنبہ صبح سے دوپہر تک بڑی عظمت و شان سے ہوا کرتا تھا لیکن سلطان محمد شاہ بن سلطان علاءالدین حسن گانگو کے زمانے میں سوائے جمعہ کے ہر روز دربار عام

---

[1] یہ ذکر فرشتہ میں نہیں ہے، برہان مآثر نے اس کو تفصیل سے لکھا ہے۔

[2] برہان مآثر۔

[3] فرشتہ۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے انتظامات سلطنت

ہوتا تھا۔ دربار کے ایوان میں ہر روز ریشمی فرش وقالین ہائے زرین نہایت تکلف سے بچھائے جاتے تھے اور وسط میں مخمل اور زربفت کے شامیانے تانے جاتے تھے جن کے نیچے ابتدا میں علاء الدین حسن گانگو بہمنی کا نقرئی تخت بچھایا جاتا تھا بعد میں محمد شاہ تخت فیروزہ بچھانے لگا جس کا رواج تمام سلاطین کے زمانے میں برابر جاری رہا۔ دروازوں پر بیش قیمت پردے لٹکائے جاتے تھے سلاطین ایک پہر دن گذرنے کے بعد دربار میں آتے تھے سلطان محمد شاہ جب تک دربار میں رہا علاء الدین حسن گانگو بہمنی کا نقرئی تخت بچھارہا پہلے باپ کے تخت کو تعظیماً سجدہ کرتا تھا یہ رسم دربار میں تخت فیروزہ بچھانے کے بعد سے موقوف کردی گئی تھی۔ غرض سلاطین بہمنیہ تخت پر نہایت ہی دبدبہ اور شوکت کے ساتھ بیٹھ کر دربار کیا کرتے تھے۔ اور مہمات سلطنت کو انجام دیتے تھے۔ نماز ظہر کی اذان سے قبل دربار برخاست کردیا کرتے تھے۔ ایوان کے تین دروازے تھے جن کے درمیان سو ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ تھا۔ اور اطراف میں جلوخانہ۔ ہر ایک دروازہ پر دربان سپاہیوں اور نقیبوں کا مجمع رہتا تھا جنھیں بہمنیوں کے اصطلاح میں بار دار کہتے تھے۔ ارباب استغاثہ وغیر استغاثہ کو کسی قسم کی روک ٹوک نہیں ہوتی تھی بار دار دربار کے جانے والوں سے ہتھیار لے لیتے تھے کیونکہ کوئی شخص دربار میں ہتھیار کے ساتھ داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ نقیب ریشمی قبائیں اور زرّین کلاہیں اور کمر میں بگلوس اور ہاتھ میں عصائے نقرئی لیے ہوئے اور دیگر شاگرد پیشہ و خدام بھی زرّین کلاہیں پہنے اور بگلوس لگائے ہوئے یہ دیکھتے رہتے تھے کہ کون آتا ہے اگر کسی غیر مسلم کو آتا دیکھتے تو بلند آواز سے کہتے ہداک اللہ و مسلمان کو دیکھتے تو بسم اللہ کہتے مسلمان اور ہندو آواز سنتے ہی تین مرتبہ ادب سے تسلیم ادا کرکے آگے بڑھتے۔ دوسرے دروازے پر بھی یہی کیفیت رہتی اُمراء و وزراء دربار میں اپنے اپنے رتبہ کے لحاظ سے تخت کے دائیں اور بائیں دست بستہ کھڑے رہتے۔ دربار میں سوائے علماء و مشایخ کے کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی سلطان علاء الدین حسن گانگو بہمنی کے زمانے میں صرف ملک سیف الدین غوری کو خاص عنایت و فضیلت و ضعف پیری کی وجہ سے دربار میں بیٹھنے کی اجازت ملی تھی لیکن ملک سیف الدین نے محمد شاہ اوّل بہمنی کی تمکنت پسند طبیعت کا خیال کرکے دوسرے اُمراء وارکان خاندان شاہی کی طرح دربار میں کھڑے

لہ۔ فرشتہ۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے انتظامات سلطنت

رہنے کی بادشاہ سے اجازت طلب کی جس کو بادشاہ نے خوشی سے منظور کرلیا اور ملک سیف الدین بھی کھڑے رہنے لگا۔ درباری اُمراء کا لباس قبا سفید دستار اور بگلوس اور مشائخ و علماء کا جبہ کرتا صدری اور عمامہ ہوا کرتا تھا دربار میں درباری مختلف رنگوں کے لباس میں آسکتے تھے لیکن اُن کی دستار سفید اور ایک ہی وضع کی ہوئی ضروری تھی اُمراء و وزراء کا ایک ہی لباس ہوا کرتا تھا۔ دربارِ عام میں اربابِ استغاثہ وغیر استغاثہ کثرت سے جمع رہتے تھے۔ بادشاہ ہر ایک کی فریاد سُنتا اور انصاف کرتا تھا اور جو لوگ بچ جاتے اُن کی درخواستیں رکھ لیتا تھا اور دوسرے روز یا تیسرے دن اُن کو کافی جواب دیتا تھا۔ دربار میں سُرخ لباس مظلوم کی علامت تھی۔ اس لیے بادشاہ سب سے پہلے اُن کی دادرسی کرتا تھا۔ غرض سلاطین بہمنیہ کے دربار عام میں حاکم و محکوم دونوں اپنی اپنی حاجتوں کے لیے جاتے تھے اور عوام اس کی وجہ سے بے فکر اور مطمئن رہتے تھے کیونکہ اُن پر کوئی بادشاہ کی دادرسی کے خوف سے سختی و ظلم نہیں کرسکتا تھا۔ اور ہر وقت عہدہ داروں کو بھی بادشاہ کا خوف لگا رہتا تھا۔ رعایا بادشاہ کے انصاف کی وجہ سے شکرگزار اور مطیع رہتی تھی۔

دربارِ خاص سلاطین بہمنیہ[1] کے ہاں بھی بارگاہ خاص مغلوں کی طرح دربار خاص ہوتا تھا اور اس دربار کے لیے بھی ایک خاص عمارت ہوا کرتی تھی۔ یہ دربار عام کے محل سے زیادہ آراستہ ہوتا تھا اس میں وزراء و اُمراء افسرانِ فوج و معززین ریاست، بزرگانِ دین و ملت، مصاحبین، علماء و شعراء شریک ہوا کرتے تھے۔ ضرورت کے لحاظ سے اس کا انعقاد عمل میں آتا تھا۔ تمام مہمات سلطنت، طرفداروں اور سرلشکروں اور عہدہ داروں کا تقرر و تبدل اور جنگوں کے لیے فوجوں کی روانگی کا تصفیہ اسی میں ہوتا تھا۔

دربار و نذر عیدین و جشن نوروز۔ سلاطین بہمنیہ[2] دیگر مسلمان بادشاہوں کی طرح اُمراء و سپاہ کے تالیف قلوب کے لیے دربار عیدین و نوروز منعقد کرتے۔ نذریں لیتے اور جشن نوروز منایا کرتے تھے۔ دستور کے مطابق دربار ریشمی فرش، رنگین قالینوں

---

[1] فرشتہ [2] فرشتہ

سلطان احمد شاہ مخمل و زربفت کی مسندوں اور تکیوں سے سجایا جاتا تھا دیواروں پر نقش و نگار کیے جاتے۔ اور ولی بہمنی کے دروازوں پر مخمل و اطلس کے پردے لٹکائے جاتے تھے۔ دربار کے تینوں دروازوں پر چوبداروں انتظامات سلطنت اور نقیبوں کا مجمع ترتیب سے صف بستہ رہتا تھا سوار و پیدل عمدہ وردیوں میں دو طرفہ کھڑے رہتے تھے۔ دروازے سے گذر کر درباری دربار میں باریاب ہوتے تھے! ور نذریں پیش کر کے اپنی اپنی جگہ تخت کے دائیں بائیں ادب سے کھڑے رہتے تھے۔ نذریں پیش کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ رقم نذرانہ جو پانچ یا گیارہ دینار یا زیادہ ہوتی تھی ایک مخملی تھیلی میں بند اور مہر کی ہوئی پیش کی جاتی تھی۔ نذر دینے والے کا نام اور تعداد رقم بھی اسی تھیلی پر لکھی ہوتی تھی۔ بادشاہ کے حضور میں باربک نذر دینے والے کو پیش کرتا تھا۔ اگر بادشاہ اُس پر ہاتھ رکھ دیتا تو قبولیت کی علامت سمجھی جاتی تھی اور منشی اس نذرانہ کو لیکر طلائی یا نقرئی تشت میں جو تخت کے پہلو میں رکھا جاتا ڈال دیتا تھا۔ اور رجسٹر میں نذر دینے والے کا نام درج کر لیتا تھا جملہ رقم نذرانہ شاہی خزانہ میں داخل کی جاتی تھی۔ نذروں سے فارغ ہونے کے بعد سب درباری دعوت میں شریک ہوتے تھے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد لوگ محفل راگ رنگ سے محظوظ ہو کر رخصت ہوتے تھے۔ رخصت کے وقت انھیں شاہی خدام عطر اور پان سپاری اور الائچی ایک زرین کپڑے میں باندھ کر دیتے اور گلاب چھڑکا کرتے تھے۔ سالانہ عیدین اور جشن نوروز میں تمام سلاطین بہمنیہ اُمراء و وزراء و ملازمین سلطنت کو مناسب خطابات، مشائخ و علماء کو انعام و اکرام اور مساکین کو مال و زر سے سرفراز و سربلند کیا کرتے تھے۔[۱]

عدالت سلاطین بہمنیہ کے عہد میں شاہان متقدمین کی طرح عدالتی کارروائی اسلامی شرعی قانون پر ہوتی تھی۔ قضاۃ و علماء کو عدالت کا پورا اختیار حاصل تھا کسی کی مجال نہ تھی کہ شرع کے خلاف فیصلہ کرے یا شرعی احکام کے اجرا میں تاخیر کرے۔ عدالتِ دیوانی اور عدالت فوجداری ملک کی دونوں بڑی عدالتیں سمجھی جاتی تھیں باقی عدالتیں انھیں کے ماتحت ہوتی تھیں۔ قضاۃ علماء اور فقہاء مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے۔ صدر عدالت

---

[۱] فرشتہ۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے انتظامات سلطنت

دارالسلطنت میں ہوتی تھی۔ اس عدالت کا صدر صدر جہاں ہوتا تھا اس کا تقرر راست بادشاہ کے طرف سے عمل میں آتا تھا! اسی کے تحت مفتی، فقیہ، محتسب، ایک فوجدار اور ایک داروغہ ہوتا تھا۔ اضلاع، دیہات اور تعلقوں کے فیصلے قضاۃ و محتسب کے ملاحظہ سے گذر کر صدر عدالت میں آتے تو مفتی و فقیہ کارروائی اور فیصلے کی نہایت اچھی طرح جانچ کرلیا کرتے تھے۔

اس کے بعد یہ فیصلے صدر جہاں کے پاس پیش کیے جاتے تھے اور صدر جہاں باتفاق فقہا و مفتیان عدالت تحت کے فیصلوں کی تنقیح اور جانچ کرلیتا تھا اگر تحت کے فیصلوں میں کوئی غلطی ہوتی تو اس کو ظاہر کرکے ملزم کو رہا کردیتا تھا اگر غلطی نہ ہوتی تو اسی فیصلہ کو بحال رکھتا تھا اگر حکّام و عمّال کی طرف سے ظلم و زیادتی ہوتی تو بالمشافہ بادشاہ کے حضور میں عرض کردیتا تھا۔ بادشاہ مقدمہ کی مسل منگواکر خود تحقیق کرتا اور اگر غلطی ہوتی تو اس کو رفع کرتا اور حکام کو تاکید کرتا کہ مکرر غور کریں تاکہ حقدار حق سے محروم نہ ہوجائیں۔ فیروز شاہ بہمنی نے اپنے زمانے میں اس عدالت کے علاوہ ایک اور محکمہ دفتر شاہی کے نام سے قایم کیا تھا جو وکیل السلطنت کے تحت ہوتا تھا تمام عدالتوں کے اہم فیصلے اس دفتر شاہی میں بھیجے جاتے تھے۔ وکیل السلطنت اُن کی جانچ پڑتال کرکے بادشاہ کے ملاحظہ میں پیش کرتا تھا اور بادشاہ کی دستخط کے بعد تعمیل کے احکام نافذ کیے جاتے تھے۔

ہر صوبہ اور ضلع میں محکمۂ قضاۃ، محکمہ محتسب اور محکمۂ فوجداری ہوتے تھے جو مقدمات اور معاملات کا فیصلہ کرتے تھے تعلقات اور دیہات میں قضاۃ محتسبین اور فوجداروں کے نائب مقرر کیے جاتے تھے۔ دیہات میں امناء، تھانہ دار اور چوکیدار مقدموں کے واقعات کی جانچ پڑتال کیا کرتے اور جہاں زد و کوب و رہزنی و خونریزی ہوتی وہاں جاکر ملزمین کو ماخوذ کرکے مقدمہ کا چالان محکمۂ فوجداری میں کرتے تھے۔ فوجداری طرفین کے گواہوں کا اظہار لیکر اپنی رائے کے ساتھ مقدمہ محکمۂ قضاۃ میں بھیجی جہاں قاضی اظہارات کی تصدیق کرکے فیصلہ شرعی احکام کے مطابق لکھتا تھا جس کی تعمیل داروغہ کے ذریعہ سے کی جاتی تھی کسی حالت میں بھی قاضی کے حکم کی تعمیل میں دیر نہیں ہوتی تھی۔ فیصلہ کے بعد مدعی علیہ کو مرافعہ کے لیے ایک مہینہ کی مہلت دی جاتی تھی۔

لہ۔ محبوب الوطن مولفہ مولوی عبدالجبار۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے انتظامات سلطنت

کبھی کبھی سلاطین بہمنیہ[1] دارالسلطنت کی صدر عدالت میں جا کر مقدمات مرجوعہ کی روئداد اور گواہوں کے بیانات کو سُنتے اور صدر جہاں کے فیصلوں کو دیکھ کر اظہار خوشنودی فرمایا کرتے تھے چنانچہ برہان ماثر اور تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ محمد شاہ ثانی بہمنی ایک روز عدالت میں گیا اُس روز ایک عورت زنا کے جرم میں گرفتار ہو کر سزا کے لیے دارالقضا میں لائی گئی تھی قاضی نے اُس سے پوچھا کہ تجھ کو اس فعل حرام کی جراءت کیونکر ہوئی عورت نے جواب دیا کہ میں نے سُنا تھا کہ ایک مرد چار عورتوں سے ایک ہی وقت میں تعلق پیدا کر سکتا ہے اس پر میں نے قیاس کیا کہ ایک عورت کو بھی چار مردوں سے واسطہ رکھنے کی اجازت ہوگی اب معلوم ہوا کہ یہ خیال صحیح نہیں ہے اور میں اقرار کرتی ہوں کہ آیندہ سے اس فعل حرام سے پرہیز کروں گی اور اس کے گرد نہ پھٹکوں گی۔ اس کو سُنکر قاضی متردد ہوا کہ اس کو کیا سزا دی جائے سلطان محمد شاہ نے قاضی سے کہا کہ عورت کو رہا کر دیجئے کیونکہ شرع میں شبہ سے حد ساقط ہو جاتی ہے اس پر قاضی نے مجرمہ کو رہا کر دیا اور عورت نے شرعی حد سے نجات پائی محبوب الوطن نے لکھا ہے محمود شاہی کے مولف نے اس نقل کو سلطان احمد شاہ کی طرف منسوب کیا ہے جو غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ برہان ماثر اور فرشتہ نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے صرف اس قدر لکھا ہے کہ آپ کے زمانے میں قدیم عدالتی انتظام قایم رہا آپ منصف مزاج اور شرع اسلامی کے نہایت سخت پابند تھے بشرطی انصاف میں کسی کی طرفداری نہیں کرتے تھے خواہ وہ آپ کا عزیز ہو یا غیر عزیز چنانچہ مولف محبوب الوطن نے مفرح القلوب کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ آپ نے اپنے حقیقی بھانجے شیر خاں کو ۸۳۶ھ م ۱۴۳۲ء میں کسی خون کے معاملہ میں قصاصاً قتل کرا دیا تھا اس واقعہ سے آپ کی انصاف پسندی پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

تعلیم

آپ نہ صرف ایک زبردست سپہ سالار اور دور اندیش و مدبر بادشاہ ہی تھے بلکہ علمی ذوق کے لحاظ سے بھی آپ کا درجہ بہت بڑا ہے آپ خود ایک عالم متبحر تھے اور آپ کے نزدیک بنی نوع انسان کی سب سے بڑی خدمت یہی ہو سکتی تھی کہ علم کی روشنی کو

---

[1] فرشتہ و برہان ماثر۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے انتظامات سلطنت

عام کرکے ہر شخص کو اس سے بہرہ ور ہونے کا سامان مہیا کریں۔ چنانچہ آپ نے اپنے زمانے میں تمام قدیمی تعلیمی اداروں کو جاری ہی نہیں رکھا بلکہ ان میں ہر طرح کا اضافہ کیا جو حسب ذیل ہے۔

سلطان[1] علاء الدین حسن گانگو بہمنی کو علم و ادب سے گہری دلچسپی تھی۔ علمائے عصر و فضلائے دہر کی بڑی قدر و منزلت کرتا تھا اس نے دکن میں عربی اور فارسی کی تعلیم کو رواج دیا اُس نے ہر چھوٹے سے چھوٹے قصبہ میں مساجد بنوائیں ہر ایک مسجد کے لیے امام، موذن اور مدرس مقرر کیا مدرس کا یہ فرض تھا کہ وہ اس قصبہ کے بچوں کو تعلیم دے۔ بڑے مقامات میں وہاں کی آبادی کے لحاظ سے زیادہ مدرسین مقرر کیا کرتا تھا۔

سلطان[2] خود ہمیشہ علماء کی صحبت میں رہا کرتا تھا۔ مولانا لطف اللہ سبزواری۔ ملا معین ہروی۔ مفتی احمد ہروی۔ ملا اسحٰق شیرازی۔ ملا فضل اللہ انجو۔ ملا حکیم علیم الدین تبریزی۔ حکیم نصیر الدین شیرازی۔ مولانا صدر شریف سمرقندی۔ ملک رکن غوری۔ ملک سیف الدین غوری۔ سید رضی الدین جگاجوت وغیرہ جیسے علماء و حکمائے بہمنیہ اس کے ساتھ رہتے تھے۔

شہزادوں کی تعلیم و تربیت کے لیے خاص اساتذہ مقرر تھے محمود خاں۔ داؤد خاں۔ اور احمد خاں ان سب شہزادوں کی تعلیم مولانا فضل اللہ انجو کے تفویض تھی۔ اور مولانا کے زیر نگرانی اساتذہ آکر پڑھایا کرتے تھے۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے یہ انتظام تھا کہ ایلچپور (برار) میں ایک دار العلوم کھولا گیا تھا جس کا ایک وسیع دار الاقامہ بھی تھا اُس کے اخراجات کے لیے سالانہ تین ہزار دینار آمدنی کی جاگیر وقف تھی اس کے علاوہ دولت آباد۔ گلبرگہ وغیرہ میں بہت سے مدارس قائم تھے۔ طلباء کو وظائف ہی نہیں دیئے جاتے تھے بلکہ اُن کے خورد و نوش اور کپڑوں کا ذمہ دار بھی مدرسہ ہوا کرتا تھا۔ مدرسین کی تنخواہیں معقول تھیں۔

---

[1] محبوب الوطن۔

[2] فرشتہ۔

[3] محبوب الوطن۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے انتظامات سلطنت

سلطان محمد شاہ بن حسن گنگو بہمنی بھی عالم متبحر تھا اُس نے ملک میں تعلیم پھیلانے میں اپنے باپ سے زیادہ کوشش کی اور اپنے ولی عہد مجاہد شاہ کو بڑے بڑے جید عالموں سے تعلیم دلائی۔ شہزادہ ترکی۔ عربی۔ فارسی کا ماہر تھا۔

سلطان محمد شاہ ثانی بہمنی بھی بڑا عالم تھا اس نے ملک کے تمام بڑے بڑے شہروں میں یتیموں کی تعلیم کے لیے مدرسے قایم کیئے۔ گلبرگہ۔ بیدر۔ قندھار۔ ایلچپور۔ دولت آباد۔ جنیر۔ چھول اور وائل وغیرہ شہروں اور بڑے بڑے قصبوں میں معلمین مقرر کیئے، ان کی تنخواہیں شاہی خزانہ سے ادا کی جاتی تھیں۔ وہ محدثین کی بڑی عزت کرتا اور ان کے لیے گراں قدر وظیفے مقرر کیا کرتا تھا۔ اس نے فیروز شاہ اور احمد شاہ کو شیراز کے مشہور سید اور متبحر عالم میر فضل اللہ (جو علامہ سعدالدین تفتازانی کے شاگرد رشید تھے) سے نہایت عمدہ تعلیم دلائی تھی۔

فیروز شاہ بہمنی خود بہت لایق اور ہر علم سے عموماً اور تفسیر و اصول و حکمت سے طبعی اور نظری سے خاص طور پر دلچسپی رکھتا تھا اس کو صوفیا کی اصطلاحات سے بھی پوری واقفیت تھی۔ اس نے ملک میں جا بجا مدرسے قایم کیئے اور جدید مساجد تعمیر کرا کر ان میں تعلیم کا انتظام کیا اور خود ہفتہ میں تین دن یعنی شنبہ۔ دوشنبہ اور چہارشنبہ درس دیا کرتا تھا۔ زاہدی اور شرح تذکرہ فن ریاضی میں اور شرح مقاصد کلام میں اور اقلیدس علم ہندسہ میں اور مطول علم معانی و بیان میں بادشاہ کے درس کی خاص کتابیں تھیں۔ اگر کبھی اتفاق سے بادشاہ کو فرصت دن میں نہ ملتی تھی تو رات کو طالب علموں کو اپنے پاس بلاتا اور ان کو حسب معمول سبق پڑھا کر اپنے معلومات سے مستفید کرتا تھا۔

آپ کی تعلیم بھی فیروز شاہ کے ساتھ مولانا میر فضل اللہ سے ہوئی تھی اس لیے آپ کو بھی ہر علم سے خاص دلچسپی تھی آپ نے ملک میں تعلیم کے جو قدیم ادارے تھے نہ صرف انھیں حسب دستور قایم رکھا بلکہ فتوحات کے ذریعہ نئے شہر حاصل کر کے ان میں مساجد تعمیر کر وا کر مدرسے قایم کیے تھے۔ پایہ تخت بیدر میں آپ نے مختلف ممالک سے متبحر عالموں کو بلا کر جمع کیا تھا جن کے

۱و۲و۳ ۵ ۔ فرشتہ۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے انتظامات سلطنت

چشمۂ فیض سے سیراب ہونے کے لیے دور دراز ممالک سے طالب علم آیا کرتے تھے۔ آپ ہی کے عہد مبارک میں سید السادات سید حنیفؒ۔ میر نور اللہؒ نبیرۂ شاہ نعمت اللہ کرمانیؒ۔ شاہ خلیل اللہؒ اور قاضی احمد مقبولؒ جیسے مشہور صوفیا بھی اپنی روحانی تعلیمات سے لوگوں کو بہرہ ور کر رہے تھے۔ ان حضرات کی روحانی تعلیم کی شہرت دور دراز ممالک تک پہنچی ہوئی تھی۔ انھی بزرگواروں کی شہرت آپ کے صاحبزادے کے زمانے میں خواجہ عماد الدین محمود گاوان جیسے متبحر عالم کو قاوان (گاوان) ضلع گیلان سے بیدر کھینچ لائی تھی۔ خود آپ کے علم و ادب کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ شیخ آذریؒ میر نور اللہ نبیرۂ شاہ نعمت اللہ کرمانی، شاہ خلیل اللہ معہ فرزندان، شاہ حبیب اللہ اور شاہ محب اللہ قاضی احمد مقبول۔ قاضی نظام الدین شرقی ملّا عبد الغنی۔ مولانا نجم الدین شیخ حبیب اللہ جنیدی، میر شمس الدین قمی۔ خواجہ عماد الدین سمنانی۔ سیف اللہ حسن آبادی۔ سید عبد المومن نبیرۂ مخدوم جہانیاں، سید جلال بخاری۔ میاں محمود نظام الملک خواجہ حسن اردستانی خسرو بیگ اوزبک اور سید السادات سید حنیف وغیرہ جیسے علما و حکمائے بہمنیہ ہمیشہ آپ کے ساتھ رہا کرتے تھے۔

آپ نے[1] شہزادوں کی تعلیم خسرو بیگ اوزبک اور خواجہ حسن اردستانی کے سپرد کی تھی خسرو بیگ اوزبک شہزادوں کو پڑھایا کرتے تھے اور خواجہ حسن اردستانی تیر اندازی اور دیگر سپاہیانہ فنون کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ آپ کے زمانے میں تعلیم کے مختلف شعبوں میں جو ترقی نظر آتی ہے وہ دیگر سلاطین کے زمانے میں نہیں پائی جاتی۔

جسمانی تعلیم

سلاطین بہمنیہ اپنی رعایا کو صرف دماغی تعلیم دلا کر جسمانی حیثیت سے کمزور بنانا نہیں چاہتے تھے اس لیے انھوں نے دماغی تعلیم کے ساتھ ساتھ جسمانی کا بھی کافی انتظام و اہتمام کیا تھا جس کی وجہ سے بہمنی رعایا نہایت طاقتور، بہادر، عالی ہمت اور جفاکش سپاہی بن گئی تھی جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

سلاطینِ بہمنیہ نے بمقتضائے عہد تیر اندازی۔ نیزہ بازی۔ شمشیر زنی اور دیگر

---

[1]۔ فرشتہ و برہان ماثر۔
[2]۔ فرشتہ۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے سپاہیانہ فنون۔ سواری اور بنوٹ کی تعلیم کا بڑا اہتمام کیا تھا۔ ان سلاطین کے زمانے میں یہ تعلیم علمی اور عملی دونوں طریقوں سے ہوتی تھی۔ اور اس کی روزانہ مشق کرائی جاتی تھی۔

انتظامات سلطنت اس تعلیم کے مقابلے میں علوم عقلیہ و نقلیہ کی تعلیم بہت کم دی جاتی تھی۔ صرف قضاۃ، مشائخ اور آئمۂ دین کی اولاد کے لیے یہ تعلیم لازمی نہیں تھی ان کے سوا سب کے لیے لازمی اور عام تھی۔ اسی وجہ سے دکن کا کوئی شہر تعلیم خانوں سے خالی نہیں تھا۔ بچے، جوان، بوڑھے سب ہی چار بجے سے شام تک ان تعلیم خانوں میں جمع ہو کر فنون سپاہگری کے قواعد سیکھتے اور مشق کیا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس تعلیم کا دکن میں عام رواج ہو گیا اور ہر ایک آدمی اس کا شایق بن گیا۔ اور اس تعلیم کو اپنی صحت و حفظ نفس کے لیے بہتر خیال کر کے خود ہی اس کا انتظام کرتا تھا۔ اس تعلیم کی بدولت تمام رعایا سپاہ بن گئی جو ضرورت کے وقت کام دے سکتی تھی۔ ہر ایک تعلیم یافتہ سبقت کے میدان میں خوب جولانی دکھاتا اور میدانِ کارزار میں پیش قدمی سے باز نہیں رہتا تھا۔

فرشتہ کا بیان ہے کہ جب آپ کرناٹک کے حملوں کے دوران میں ایک روز شکار کے لیے جنگل میں نکل گئے اور شکار کے تعاقب میں سوار اور پیادوں سے جدا ہو گئے اُس وقت صرف چند مصاحبین اور گنتی کے سوار اور پیدل آپ کے ہمراہ تھے۔ مخالفین نے جو دروں میں چھپے ہوئے تھے موقع دیکھ کر حملہ کیا اور چاروں طرف سے گھیر لیا۔ یہ سخت مشکل کا وقت تھا۔ بظاہر سلامتی نظر نہیں آتی تھی ایسی نازک حالت میں عبدالقادر سرسلحداران فی الفور تین ہزار خاصہ خیل شاہی لیکر پہنچ گیا۔ دونوں فوجوں کے درمیان سخت مقابلہ ہوا اور طرفین سے تیروں کی بارش ہوئی۔ آخر عبدالقادر نے دشمن کی فوج کو شکست دے کر بھگا دیا اور آپ کو بچا لیا۔ آپ اُس کی اس جانبازی سے بہت خوش ہوئے اور خلعت و منصب مناسب سے سرفراز فرمایا اور حکم دے دیا کہ ماہر تیرانداز شہزادوں کی تعلیم کے لیے مقرر کیے جائیں۔ اسی بنا پر خواجہ حسن اردستانی شہزادوں کو تیراندازی و فن سپاہگری سکھانے کے لیے مقرر کیے گئے۔ آپ نے معززین اور اُمراء کو تاکید کی کہ وہ اپنے بچوں اور رشتہ داروں کو تیراندازی اور فنونِ سپاہگری کی تعلیم دلائیں اور جاگیرداروں کو حکم ہوا کہ اپنے اپنے

علاقوں میں اس تعلیم کا اہتمام کریں۔ اس وجہ سے ملک کے مختلف حصوں میں تعلیم خانے قایم کیے گئے۔ سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے تیراندازی و شمشیر بازی کا عام رواج ہوا۔ اس فن میں آپ کی فوج دیگر فوجوں سے بازی لے گئی اُس وقت دکنی سپاہی دیگر اسلحہ حرب کے علاوہ تیر و کمان بھی رکھنے لگے۔　　انتظامات سلطنت

محمد شاہ ثانی[1] بہمنی نے آپ کو بچپن میں تیراندازی، چوگان بازی اور سواری کی باقاعدہ تعلیم دلائی تھی جس کی وجہ سے آپ ان فنون میں ماہر تھے۔ اور اسی کی بدولت بھائی کے زمانے میں کئی مہموں کو نہایت عمدگی سے سر کیا تھا۔ غرض آپ کو ان فنون سے ایک خاص لگاؤ اور دلچسپی پیدا ہو گئی تھی جس کی وجہ سے آپ نے اپنے عہد میں اس فن کو جتنی ترقی دی کسی نے نہیں دی۔ علاوہ دیگر تعلیم خانوں کے خود دارالسلطنت بیدر میں بھی چار تعلیم خانے قایم کیے گئے تھے جن کا وجود[2] ابھی تک پایا جاتا ہے۔ آپ نے اس تعلیم کو علوم و فنون کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فروغ دیا تھا۔ اس کے علاوہ خلف حسن بصری کو حکم دے کر عراق خراسان ماوراالنہر روم اور عرب سے تین ہزار تیرانداز طلب کر کے ملازم رکھوایا جو ہر وقت سرکاری ملازمین کے زمرے میں تیار رہتے تھے۔

بہمنی کتب خانہ　ملا محمد قندھاری اور تحفۃ السلاطین کے مولف نے لکھا ہے کہ سلاطین بہمنیہ علم و فضل کے زیور سے آراستہ تھے اور علوم و فنون کے شایق تھے۔ منجملہ سامان شاہی کے ان کے ہاں ایک کتب خانہ بھی تھا جس میں نادر کتب تھیں۔ ابتدا میں اُن کی تعداد بہت کم تھی لیکن فیروز شاہ بہمنی نے بادشاہ ہونے کے بعد اُس کتب خانہ کو بہت ترقی دی

---

[1]۔ فرشتہ۔

[2]۔ بیدر چار تعلیموں میں منقسم ہے (۱) تعلیم پنسال (۲) تعلیم منیار (۳) تعلیم صدیق شاہ (۴) تعلیم تورخاں کے ناموں سے مشہور ہیں۔ ہر ایک میں ورزش کا سامان رکھا ہوا ہے۔ ہر ایک تعلیم میں استاد ہوا کرتا تھا جو لڑکوں کو تعلیم فنونِ سپاہگری دیا کرتا تھا اور یہ تعلیم خانے استادوں کے نام سے ہی موسوم ہیں اس میں اختلاف ہے کہ یہ تعلیم خانے آپ ہی کے زمانے کے قایم شدہ ہیں یا بعد کے۔ بیدری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قدیم زمانے کے قایم کیے ہوئے ہیں خواہ یہ کسی زمانے کے ہوں ان سے جسمانی تعلیم کے شوق کا پتہ چلتا ہے۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے اور عرب و عجم سے نئی اور نایاب کتابیں منگواکر رکھوایا تھا۔ اس کے کتب خانہ میں ہر علم و فن کی کتابیں موجود تھیں۔ بہمنیوں کے آخری زمانے میں اس کتب خانے کی کتابوں کی تعداد کئی ہزار ہوگئی تھی۔

انتظامات سلطنت

محبوب الوطن کے مولف کا بیان ہے کہ کتب خانہ بہمنیہ کی کتابیں اب بھی کہیں کہیں ملتی ہیں۔ چنانچہ اس کتب خانہ میں ایک قرآن شریف حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے دست مبارک کا لکھا ہوا تھا جو آج کل حیدرآباد میں نواب شمس الامراء بہادر کے خاندان میں ہے اور اس پر بہمنی کتب خانہ کی چٹھی لگی ہوئی ہے۔ یہ قرآن شریف اپنی خوبیوں کے لحاظ سے قابل دید اور نایاب ہے۔

زراعت و محاصل

سلطان علاءالدین حسن گانگو بہمنی بادشاہ ہونے کے بعد امیران صدہ عہدہ داروں اور دکھنی ہندو راجاؤں کے تالیف قلوب میں مشغول رہا تھا اس لیے زراعت و محاصل کی اصلاح کا کام آیندہ کے لیے ملتوی رہا۔ اور قدیم ہندو راجاؤں کے زمانے کے ہی محاصل اس کے ابتدائی عہد میں جاری تھے۔ اس نے ان محاصل میں کمی و بیشی نہیں کی البتہ وہ سلاطین تغلق کی طرح زمین کا سی درسی گز مربع حصہ زمینداروں کو دیا کرتا تھا اور بعض کو پورا ضلع کثیر رقم کے عوض اجارہ بالمقطع کے تحت دیا کرتا تھا اس کی رو سے مقطعہ دار زمین اور زمیندار پر مالکانہ قبضہ رکھتا اور محاصل میں کمی و زیادتی بھی کیا کرتا تھا اسی طریقہ کی وجہ سے رعایا پر بعض اوقات مظالم ہوا کرتے تھے۔ بادشاہ نے سلطنت کو استحکام نصیب ہونے اور گرد و نواح کے راجاؤں اور عہدہ داروں کے مطیع و فرمانبردار ہونے کے بعد زراعت و خراج کے طرف اپنی توجہ مبذول کی اور عمل بالمقطعہ کے طریقے میں خرابیاں ہونے کی وجہ سے اس کو یک لخت موقوف کردیا اور ہر ضلع کی زمین کو سی درسی گز مربع قطعات میں تقسیم کرکے کاشتکاروں اور زمینداروں کو پنجسالہ یا زاید مدت کے قول پر دے کر مالگزاری وصول کرنے لگا اور دوسرے خدمات مثلاً مقدمی۔ نایک واڑی۔ پٹواری گری۔ دیوانی و دفتری وغیرہ بھی قایم کیے۔ مالگزاری زمین کی پیداوار اور قابلیت کے لحاظ سے مختلف طور پر وصول کی جاتی تھی۔ مالگزاری مقرر کرنے اور وصول کرنے میں زیادہ تر اس بات کی کوشش کی جاتی تھی کہ رعایا پر ظلم نہ ہونے پائے اس کی وجہ سے

رعایا خوش حال اور زمین آباد اور سرسبز و شاداب ہوگئی۔ اور جو زمینات ناقابل کاشت سلطان احمد شاہ اور بنجر پڑی تھیں اُن پر کاشت ہونے لگی۔ قدیم ہندوؤں کے زمانے میں زمین کا محاصل ولی بہمنی کے زمین کی حالت کے لحاظ سے چار طریقوں پر لیا جاتا تھا جن کے نام ایکنکوٹ، ۲۔ بٹائی۔ انتظامات سلطنت ۳۔ کھیت بٹائی اور ۴۔ لانگ بٹائی تھے۔ سلطان علاء الدین حسن گانگو بہمنی اپنے عہد میں طریقہ لانگ بٹائی کی رو سے نقد رقم مالگزاری وصول کیا کرتا تھا۔ لانگ بٹائی میں حکومت اور زمیندار غلہ کاٹ کر صاف کرنے کے بعد حسب قرارداد تقسیم کر لیا کرتے تھے یا حکومت بجائے جنس کے بازاری نرخ کے بموجب نقد رقم وصول کر لیا کرتی تھی۔ سلطنت بہمنیہ میں مالگزاری کے علاوہ اور محاصل بھی وصول کیے جاتے تھے جن کے نام ۱۔ مال واجب۔ ۲۔ مال وجہ۔ ۳۔ مال جرمانہ۔ ۴۔ مال پیشکش۔ ۵ مال تمغہ۔ ۶ مال سہ بندی۔ ۷ مال نذرانہ۔ ۸ حقوق خدمت تھے۔

سلاطین بہمنیہ ہندوؤں سے جزیہ نہیں لیا کرتے تھے اور اُن کا سلوک مسلمانوں اور ہندوؤں کے ساتھ بالکل یکساں تھا اور اُن دونوں فریقوں میں کوئی امتیاز نہیں کرتے تھے جس کی وجہ سے ہندو اور مسلمان یکجہتی سے زندگی بسر کرتے تھے۔

سلاطین بہمنیہ کے ہاں محکمۂ کروڑگیری قایم تھا اور وہ محاصل کروڑگیری وصول کیا کرتے تھے جس کی تفصیل محبوب الوطن کے مولف نے یہ دی ہے کہ گھوڑوں پر فی راس ایک دینار کے حساب سے محصول لیا جاتا تھا۔ گائے بیل اور بھینس پر فی راس ایک فنم۔ بکرے پر فی راس پانچ جیتل! اونٹ پر فی راس نصف جیتل۔ ہاتھی پر فی راس پانچ دینار ان محاصل میں جانوروں کی قیمت کے لحاظ سے کمی و زیادتی بھی ہوا کرتی تھی۔

ہر قسم کے ریشمی اور سوتی کپڑے پر قیمت کے لحاظ سے سیکڑہ تین روپے آٹھ آنے محصول لیا جاتا تھا۔ چینی۔ مسی اور پچرسی برتنوں پر بھی تین روپے آٹھ آنے سیکڑہ کے لحاظ سے محصول وصول کیا جاتا تھا۔ چاندی اور سونے کے برتنوں پر بھی قیمت کے لحاظ سے فی صدی پانچ روپے اور چاندی سونا اور جواہرات پر دس روپے آٹھ آنے فی صدی کے حساب سے محصول لیا جاتا تھا۔

تمام جنگلاتی اور حیوانانی پیداوار اور استعمالی اشیاء مثلاً گھانس اور لکڑی وغیرہ میوے۔ لقولات اور غلّہ پر کوئی محصول نہیں تھا لیکن نمک پر سیکڑہ پانچ کے حساب سے

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے انتظامات سلطنت

محصول لیا جاتا تھا بسیندبن بالمقطعہ اجارہ پر دیا جاتا تھا اور کلالوں سے فی بڑا گھڑا دس جیتل متوسط گھڑا پانچ جیتل اور چھوٹا گھڑا دو جیتل کے حساب سے محصول لیا جاتا تھا آپ کے زمانے میں نیز آپ کے بعد کے زمانے میں بھی یہی طریقہ جاری رہا کسی تاریخ سے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کسی بادشاہ نے اس میں اصلاح کی ہو یا محاصل میں کمی یا زیادتی کی ہو۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ سلاطین بہمنیہ کی فتوحات کا دائرہ بہت وسیع تھا اور وہ ہمیشہ کشور کشائی کی دھن میں لگے رہتے تھے۔ فتوحات اور باجگذار ریاستوں سے جو خراج ملا کرتا تھا اس سے حکومت کو اتنی کافی آمدنی ہو جایا کرتی تھی کہ مہموں کے اخراجات، عہدہ داروں اور سپاہیوں کی تنخواہیں ادا ہونے کے بعد ہمیشہ شاہی خزانہ بھرا رہتا تھا اس لیے محاصل و مالگزاری میں اضافہ کرکے سلاطین بہمنیہ اپنی رعایا کو پریشان کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اور نہ ہی انھیں اس کی طرف توجہ کرنے کی مہلت ملی۔ سلاطین بہمنیہ کو محاصل اور مالگزاری سے اتنی آمدنی نہیں ہوتی تھی جتنی کہ خراج اور مال غنیمت سے ہوا کرتی تھی اور یہی دو اُن کی آمدنی کے بہت بڑے ذرایع تھے۔

صنعت وحرفت

بعہد سلاطین بہمنیہ دکن اپنی صنعت وحرفت میں عروج کمال پر پہنچا ہوا تھا۔ اور سلاطین کی سرپرستی کی وجہ سے مقامی صنعتوں نے جو ترقی کی اس کی مثال تاریخ میں ملنی دشوار ہے۔ سلاطین کی قدردانی و سرپرستی کی شہرت سُنکر دور دراز علاقوں کے صنّاع دارالسلطنت بہمنیہ میں جمع ہو گئے تھے۔ اور سلاطین بہمنیہ ان کی ترقی کے ذرایع مہیا کرنے کی اور انھیں فروغ دینے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے دکن میں ریشمی اور سوتی پارچہ بافی۔ بِجرسی برتن سازی اور فولادی ہتھیار سازی کے صدہا کارخانے قایم ہو گئے تھے۔ پیٹھن۔ دولت آباد۔ گلبرگہ اور کھڑکی میں ریشمی کپڑوں کے کئی کارخانے قایم تھے جہاں ایسا نفیس اور خوش رنگ کپڑا تیار ہوتا تھا کہ دور دراز ممالک کے تاجر آ آکر سستے داموں خرید کر اپنے ممالک میں گراں داموں فروخت کرتے جہاں وہ ارزاں خیال کیے جاتے تھے۔ اور ان کی بیحد قدر کی جاتی تھی۔ ان کارخانوں میں مشروع ۔ ہمرو۔ تافتہ۔ بادلہ۔ ساڑیاں۔ دھوتی۔ ڈوریہ۔ ململ۔ رومال۔ سوسی۔ سیلہ اور دوپٹے وغیرہ مختلف اقسام اور رنگوں کے تیار ہوتے تھے۔ ناندیڑ۔ ماچن پلی۔ چارا۔ اودگیر۔ آندورا اور رائچور وغیرہ مقاموں کے تیار شدہ سیلے اور ستاریں بہت مشہور تھیں۔ یہ کپڑے اس قدر مقبول اور پسند تھے کہ بادشاہ، اُمراء،

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے انتظامات سلطنت

وزرا اور جاگیرداروں کے لباس انھی کپڑوں کے ہوا کرتے تھے۔

بیدر کی صنعت نے بھی آپ کے زمانے میں خوب ترقی کی تھی اس صنعت کے متعلق مشہور ہے کہ بیدر کے ایک ہندو راجہ نے اس کو ایجاد کیا تھا وہ ان برتنوں میں پھول رکھ کر روزانہ اپنے خاندانی دیوتاؤں پر چڑھاتا تھا اس کے جانشینوں نے اس صنعت کو خاص ترقی دی تھی لیکن موجودہ صفائی اور نزاکت آپ کے زمانے کی یادگار ہے۔ آپ نے سرپرستی کرکے اس صنعت کو اس قدر ترقی دی کہ اس کے صدہا کارخانے بیدر میں قایم ہوگئے اور ایسے عمدہ اور نفیس برتن تیار ہونے لگے کہ جن کی نظیر اُس وقت دنیا میں ملنی مشکل تھی۔ ان کارخانوں میں ظروف جست اور بچھریں مثلاً حقہ۔ پاندان۔ آفتابہ۔ قلمدان۔ عطردان۔ کٹورے۔ طشت۔ خاصدان وغیرہ نہایت عمدہ تیار ہوتے تھے جو دور دراز ممالک میں نہایت قدر وقیمت سے فروخت ہوتے تھے اور ان کی شہرت دنیا کے تمام حصوں میں تھی آج کل بھی یہ صنعت بیدر میں جاری ہے اور قدیم کاریگروں کی اولاد کے دو تین کارخانے قایم ہیں۔

فولادی ہتھیار سازی کے کارخانے آندور۔ بھونگیرا ورنرمل وغیرہ میں قایم تھے جہاں نایاب تلواریں۔ خنجر اور کھٹاریں وغیرہ تیار ہوا کرتی تھیں اور جن کی عمدگی کی شہرت سُنکر عرب وعجم کے تاجر دکن آکر انھیں خریدا کرتے تھے۔

ورنگل اپنے قالین بافی کی وجہ سے دنیا میں مشہور تھا۔ ورنگل کے جیسا قالین دنیا کے کسی حصے میں تیار نہیں ہوا کرتا تھا اس صنعت کو ورنگل کے ہندو راجاؤں نے خوب ترقی دی تھی۔ جب ورنگل بہمنیوں کے ماتحت آیا تو بہمنی سلاطین نے اُس کو اور بھی فروغ دیا۔

آپ نے اپنے عہد میں صنعت وحرفت کو خوب فروغ دیا آپ کی سرپرستی کی شہرت سُنکر بیدر میں ایسے ایسے ماہرین فن جمع ہوئے جن کی مثال اُس وقت دنیا میں ملنی مشکل تھی آپ نے صنعت وحرفت کی ترقی کے لیے تجارت کو بھی خوب ترقی دی۔ آپ کے زمانے میں بیدر اور دیگر مقامات دکن میں دنیا کے مختلف حصوں کے تاجر آکر خرید وفروخت کیا کرتے تھے۔ غرض آپ کے زمانے میں دنیا کے مختلف حصوں کی تیار شدہ اشیاء بیدر میں آکر فروخت

سلطان احمد شاہ ہوا کرتی تھیں اور تجارت اور صنعت و حرفت کو جو فروغ اُس وقت ہوا وہ کسی اور ولی بہمنی کے بادشاہ کے زمانے میں دکن کو نصیب نہ ہوا تھا۔

انتظامات سلطنت

ٹپہ خانہ سلاطین بہمنیہ کی اصطلاح میں ٹپہ خانہ کو "چپار خانہ" کہا کرتے تھے۔ اس زمانے میں ٹپہ کا انتظام خاص شاہی رسل و رسائل کے لیے تھا۔ اور ٹپہ رسانی کے لیے متعدد نایکواڑی مقرر ہوتے تھے اور تین تین میل پر ٹپہ کی چوکیاں قایم کی گئی تھیں۔ معمولی احکام در پروانجات شاہی روزانہ روانہ کیے جاتے تھے۔ اور اضلاع اور صوبوں سے سرکاری احکام کے جوابات آتے تھے۔ اس قسم کی ڈاک کو گھونگرو ٹپہ کہا جاتا تھا۔ سانڈنیاں بھی ٹپہ رسانی کے لیے مقرر تھیں۔ جو ضروری احکام شاہی ایک مقام سے دوسرے مقام کو نہایت تیزی سے پہنچاتی تھیں۔ اور وقایع نگاروں اور شقداروں کی رپورٹیں بادشاہ کے حضور میں لاتی تھیں۔ ٹپہ رسانی کی سانڈنیوں کی رفتار روزانہ ستر کوس ہوا کرتی تھی۔ اور ضرورت کے وقت اس سے بھی زیادہ رفتار ہو جاتی تھی۔ بہمنیوں کے ہاں گھوڑوں کے ذریعہ سے بھی ٹپہ رسانی کا کام لیا جاتا تھا۔ اس کے لیے انتظام یہ تھا کہ تین تین میل کے فاصلے پر مکانات بنا کر گھوڑے رکھے جاتے تھے۔ جو گھوڑوں کی ڈاک چوکیاں کہلاتے تھے۔ یہ گھوڑے ایک چوکی سے دوسری چوکی کو ٹپہ لیجا کر پہنچایا کرتے تھے۔ اس قسم کے انتظام ٹپہ رسانی کو "برید و بام" کہتے تھے۔ یہ انتظام ٹپہ رسانی بھی خاص شاہی رسل و رسائل کے لیے تھے۔ اُمراء، وزراء بھی ضرورت کے وقت ٹپہ رسانی کا خانگی انتظام کر لیا کرتے تھے۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ سلطان محمد شاہ تغلق کے پاس دہلی سے خطوط ورنگل اور دولت آباد میں ساتویں دن پہنچتے تھے۔ اس سے انتظام ٹپہ کی خوبی معلوم ہوتی تھی۔ بہمنیوں نے بھی سلاطین تغلق ہی کی تقلید کی تھی۔ انھی طریقوں پر تمام سلاطین بہمنیہ کے زمانے میں ٹپہ رسانی کا کام ہوا کرتا تھا۔

بہمنیوں کے زمانے میں راستے پُرخطر تھے۔ تنہا مسافر یا تاجر صحیح و سالم نہیں گذر سکتا تھا۔ تاجروں کے قافلے بھی مشکل سے آمد و رفت کیا کرتے تھے بھیل۔ کولی۔ بیڈر راستوں میں لوگوں کو لوٹا کرتے تھے۔ ان کی بدمعاشی اور ظلم و تعدّی سے اکثر جانیں ہلاک اور مال و اسباب تلف ہوتے تھے۔ حسن گانگو بہمنی نے ان اقوام کے فساد اور فتنوں کو سخت سزائیں۔ قتل اور حبس دوام کے

ذریعہ موقوف کرایا جس کی وجہ سے یہ خطرہ کم ہوا اور اس نے ان لوگوں کو پیدل فوج میں ملازم رکھ لیا تھا۔ ان کے سرداروں کو زیادہ تنخواہیں ملا کرتی تھیں۔ غرض حسن گانگو بہمنی نے اپنی اس حکمت عملی کے ذریعہ راستوں کے خطروں کو دفع کیا جس کی وجہ سے غربا اور تاجروں کی آمد و رفت کے لیے راستہ محفوظ ہو گیا تھا۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے انتظامات سلطنت

شکارگاہ

سلاطین بہمنیہ شکار کے بڑے شوقین تھے جب کبھی انھیں فرصت ملتی شکار کے لیے جایا کرتے تھے۔ حسن گانگو کو بھی اس کا بہت شوق تھا اور اسی کی وجہ سے اس کی موت بھی واقع ہوئی تھی۔ آپ کو بھی شکار کا بہت شوق تھا۔ ایک روز جنگ کے دوران میں آپ شکار کے لیے جنگل میں نکل گئے جہاں دشمنوں نے آپ کو گھیر لیا اور بڑی مشکل سے عبد القادر سر سلحدار ان کی مدد سے آپ کی جان بچی اور اپنے لشکر میں بخیر و عافیت واپس آئے۔ بقول فرشتہ بیدر کو پایہ تخت بنانے کا خیال بھی آپ کو شکار ہی کی وجہ سے آیا تھا۔ سلاطین بہمنیہ کے ہاں باضابطہ محکمۂ شکارگاہ قایم تھا جس میں میر شکاری اور دیگر عہدہ دار تنخواہ یاب مقرر کیے جاتے تھے جو شکار کے وقت بادشاہ کے ہمراہ رہتے تھے۔ اس کے علاوہ اسی محکمہ کے تحت شکاری کتے، چیتے اور دیگر جانور پالے جاتے تھے جن کے ذریعہ شکار کیا جاتا تھا۔

توشک خانہ

بہمنی اپنی اصطلاح میں توشک [illegible] کرتے تھے۔ ان کے [illegible] اسکا باضابطہ محکمہ قایم [illegible] رکھے جاتے تھے۔ اس محکمہ کے افسر کو جامدار کہتے تھے۔ اسکے ماتحت کئی اور [illegible] فیروز شاہ بہمنی کے زمانے میں اس عہدہ پر ایک حبشی غلام تھا۔ اور اسکے دیگر ملازمین بھی اکثر حبشی غلام ہی ہوا کرتے تھے۔ بادشاہ کے پہننے کے کپڑے اسی محکمہ کے تحت رہتے تھے۔ اس لیے اس کے افسر کا کام یہ تھا کہ روزانہ صبح بادشاہ کا لباس تبدیل کرائے۔ توشک خانہ میں ہزارہا تھان مخمل کاشانی۔ زربفت خراسانی۔ دیبائے رومی، اطلس چینی۔ شالہائے کشمیری۔ زردوزی قبائیں۔ بھرو۔ مشروع۔ ناندیڑ کے سیلے۔ سنجر خانی اور مہدی خانی وغیرہ رہتے تھے۔ اور کئی ہندی اور ایرانی ریشمی، اونی اور سوتی قالین بھی تھے۔ ہندی خاصکر اکل کوٹ ضلع برار کی

لہ۔ تذکرۃ الملوک۔

سلطان احمد شاہ شطرنجیاں اور دکن کی سوزنیاں بھی تھیں اس کے علاوہ بادشاہی شان و شوکت کے لایق ولی بہمنی کے ڈیرے۔ خیمے۔ چتر اور خرگاہ۔ قناتیں اور پردے بھی بہت تھے ان کے علاوہ متعدد میانے۔ انتظامات سلطنت ہاتھیوں کے ہودے اور اونٹوں کے کجاوے تھے علیٰ ہذالقیاس اور بھی سامان شاہی و اسباب ملک کشائی کثرت سے موجود تھا۔

پولیس سلطنت میں اندرون امن برقرار رکھنے کے لیے بہمنی بادشاہوں نے اپنے ہاں پولیس کا صیغہ مستقل طور پر قایم کر رکھا تھا چنانچہ اس صیغہ کے افسر اعلیٰ کو کوتوال کہتے تھے جس کے ماتحت کئی اور عہدہ دار اور صد ہا جوان ہوا کرتے تھے۔ ملک میں جھگڑے اور فساد نہ ہونے دینا اور اگر واردات ہو جائے تو اس کی تفتیش و تحقیق کرنا اور ملزم کا پتہ لگانا اور اس کو سزا دلوانا پولیس ہی کے فرایض میں داخل تھا۔ معمولی مقدمات کی سماعت کرنے اور بحیثیت مجسٹریٹ کے سزا دینے کا اختیار بھی کوتوال کو حاصل تھا۔ اس کے علاوہ قیدیوں کی نگرانی اور جیل خانے کے جملہ انتظامات بھی اس کے ہی سپرد تھے۔

سکے مسلمانوں میں بادشاہت کی خاص علامت سکّہ اور خطبہ خیال کی جاتی ہے۔ چنانچہ کسی بادشاہ کے تخت نشین ہونے یا کسی سلطنت کے قیام کے ساتھ ہی یہ ضروری خیال کیا جاتا تھا کہ اُس کے نام کا سکّہ چلایا جائے اور اُس کے نام کا خطبہ پڑھا جائے۔

حسن گانگو نے دکن میں جب سلطنت قایم کی تو اپنے نام کے سکّے کو اپنی سلطنت میں رواج دیا۔ چنانچہ حسن گانگو کے مختلف قسم کے سکّے دستیاب ہوئے ہیں۔

حسن گانگو کے بعد محمد شاہ اوّل کی کوششیں بہمنی سکّے کو رواج دینے کے سلسلے میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہمسایہ ہندو سلطنتیں اس بات کی کوشاں تھیں کہ مسلمانوں کے سکّوں کو عام رواج حاصل نہ ہو۔ چنانچہ ہندو سناروں نے اس بات کی کوشش کی کہ اسلامی سکّوں کو جہاں تک ہو سکے گلا ڈالا جائے۔ اس فتنے کو روکنے کے لیے محمد شاہ نے جو مدافعانہ تدابیر اختیار کیں ان کا ذکر فرشتہ اور دیگر مورخین نے تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ غالباً ہندو سناروں کی انھی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ حسن گانگو اور محمد شاہ اوّل کے سکّے کم مقدار میں دستیاب ہوتے ہیں۔

محمد شاہ کے بعد سے احمد شاہ تک تقریباً تمام سلاطین بہمنیہ کے سکّے دستیاب ہوتے ہیں۔

یہ سکے ابتداءً سلاطین دہلی کے سکوں سے مشابہ ہوتے تھے۔ وزن۔ حجم۔ طرز تحریر اور عبارت سلطان احمد شاہ تقریباً وہی ہوتی تھی جو سلاطین دہلی کے سکوں کی تھی۔ ان سکوں سے سلاطین بہمنیہ کے نسب نامے۔ ولی بہمنی کے تاریخ تخت نشینی اور وفات اور ناموں کی تصحیح ہوتی ہے۔ یہ سکے مختلف اوزان اور حجم کے انتظامات سلطنت ہوتے تھے۔ ان پر عبارتیں بھی علیحدہ علیحدہ کندہ ہوتی تھیں۔ آپ کے سکوں کی قسموں اور ان کی عبارتوں کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔ اور آپ کے سکوں پر جو القاب درج ہیں اُن سے آپ کی معدلت گستری، آپ کے جود و کرم، مذہب پرستی اور حق پروری کا پتہ چلتا ہے۔ نقرئی سکے پر یہ القاب درج ہیں:—

السلطان العادل الباذل .... شہاب الدنیا والدین احمد شاہ

الناصر الدین الدیان المغازی .... السلطان

(مسی سکوں پر جو القاب ہیں وہ حسب ذیل ہیں)

المطیع .... ابوالمظفر

المنان .... احمد شاہ

بامر اللہ [1] .... السلطان

المنصور .... ابوالمغازی

بنصر اللہ .... احمد شاہ السلطان

المنان ۸۲۸ھ

المؤید .... ابوالمغازی

بنصر اللہ .... احمد شاہ السلطان

الملک المنان ۸۳۶ھ

احمد شاہ بن احمد بن حسن البہمنی

---

[1] عجائب خانہ باغ عامہ کے مہتمم صاحب سے ان سکوں کی عبارتیں حاصل کی گئی ہیں جس کے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے انتظامات سلطنت

لوازمات شاہی

تاریخ اسلام میں خلفائے عباسیہ کی وجہ سے سیاہ رنگ کو خاص امتیاز و شرف حاصل تھا جب ۷۴۸ھ میں امیران صدہ نے سلطان علاء الدین حسن گانگو بہمنی کو اپنا بادشاہ تسلیم کیا تو انھوں نے تیمناً و تبرکاً اسی رنگ کو اس کا نشان قرار دیا اسی لیے سلاطین بہمنیہ کا چتر، سراپردہ اور دہلیز سیاہ ہوتی تھی۔ ہندوستان میں قدیم سے چتر۔ تخت۔ تاج۔ اسپ۔ فیل اور میانہ لوازمات شاہی تصور کیے جاتے تھے اور سلاطین بہمنیہ بھی ان سب کی عمدگی اور نفاست کو اپنی سلطنت کے استحکام کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔

چتر چتر سیاہ ریشمی کپڑے کا تھا اور اُس کا قبہ قسم قسم اور رنگ برنگ کے قیمتی جواہرات سے مزیّن ہوتا تھا اور اُس کے کلس پہ ہما کی ایک مرصّع مورت نصب ہوئی تھی جس کے سر پر بطور تاج کے ایک بہت بڑا خوش آب یاقوت لگایا جاتا تھا۔ جس کو رائے بیجانگر نے سلطان علاء الدین حسن گانگو بہمنی کو نذر دیا تھا اور جس کی قیمت کی تشخیص سے دکن کے جوہری عاجز تھے۔

تخت سلطان علاء الدین حسن گانگو بہمنی کا تخت، سونے اور چاندی کا تھا محمد شاہ کی طبیعت غیرت پسند تھی اس لیے باپ کے تخت کو دربار میں سجدہ کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا یہاں تک کہ اس کے عہد سلطنت میں رائے تلنگانہ نے ایک تخت (جو اُس نے محمد تغلق بادشاہ دہلی کے نذر کرنے کے لیے تیار کروایا تھا) سلطان محمد شاہ کو دے دیا تو سلطان نے اُسے بڑی نعمت سمجھ کر دربار میں بچھوا دیا اور اپنے باپ کے تخت کو علیحدہ ایک گوشہ میں ہمیشہ کے لیے بیکار رکھوا دیا۔ جس کو سلطان فیروز شاہ بہمنی نے مدینہ منورہ بھیجدیا جہاں اُس کو توڑ کر سادات میں تقسیم کر دیا گیا یہی رائے تلنگانہ کا دیا ہوا تخت آخر وقت تک سلاطین بہمنیہ کے لیے باعثِ افتخار رہا۔ یہ تخت آبنوس کی لکڑی کا بنا ہوا تھا اور اس ترکیب سے بنایا گیا تھا کہ اٹھاتے وقت اس کا تختہ تختہ جدا ہوتا تھا۔ اس کا طول تین گز اور عرض ڈھائی گز تھا اوپر کے طرف سونے کے پتر جڑے ہوئے تھے جو فیروزہ کی میناکاری سے مرصّع تھے اسی وجہ سے اس کا نام تخت فیروزہ رکھا گیا تھا۔ اور سلاطین بہمنیہ نے اپنی شکوہ پسندی سے اس میں بہ کثرت بیش قیمت جواہرات جڑے تھے۔ سلطان محمد شاہ ثالث کے زمانے میں اس کی قیمت کا

اندازہ ایک کروڑ ہون یعنی ساڑھے تین کروڑ روپے کیا گیا تھا۔

سلطان علاء الدین حسن گانگو بہمنی نے دکن میں منصبداری دستار ایجاد کی تھی سلاطین بہمنیہ میں ولی بہمنی کے

تاج

اس کا رواج فیروز شاہ بہمنی تک جاری رہا۔ فیروز شاہ نے بجائے منصبداری دستار کے انتظامات سلطنت

تاج نماد دستار اختیار کی۔ فیروز شاہ کے زمانے سے آخر تک تاج پوشی کی رسم برابر جاری رہی۔ تاج سونے کا ہوتا تھا اور یاقوت، الماس اور مروارید سے مرصّع ہوتا تھا۔ اس تاج کی قیمت کا اندازہ چودہ لاکھ روپے کیا گیا تھا۔

اسپ، فیل، میانہ فرامین داب شاہی

شاہان بہمنیہ کے اصطبل میں عربی۔ عراقی اور عجمی ہر قسم کے گھوڑے رہتے تھے اور ان کا سامان زین و لگام مرصّع ہوتا تھا۔ ہاتھیوں کی بھی ان کے ہاں کمی نہ تھی۔ محمد شاہ اوّل نے تو تین ہزار ہاتھی جمع کیے تھے۔ مگر بعد میں بھی دو ہزار سے کم کسی وقت نہ تھے۔ فیل خاصہ پر عماری زرّین و مرصّع اور جھول زرباف و زرکار کی ہوتی تھی۔ میانہ بھی مرصّع ہوتا تھا اور اس پر زردوزی پردے پڑے رہتے تھے۔

سلاطین اسلام کے دستور کے مطابق سلاطین بہمنیہ کے فرامین شاہی کے پیشانی پر بادشاہ کے نام کا طغرا ثبت ہوتا تھا اور مہر لگائی جاتی تھی۔

سلاطین بہمنیہ کی اولاد کی شادی یا تو ان کے ہی خاندان میں ہوتی تھی یا بادشاہانِ قرب وجوار کے ہاں! اور بعض خاص صورتوں میں اُمراء و مشائخین کو بادشاہ کی دامادی کی عزت حاصل ہوتی تھی۔

بادشاہ کی تخت نشینی کے وقت اُمراء، وزراء، منصبدار، جاگیردار اور طرفدار نذریں پیش کرتے اور حسب حیثیت پیشکش اور ہدایا داخل کرتے تھے۔

بادشاہ کے اردلی میں دو سو منتخب سوار رہتے تھے جن کی تحویل میں شاہی سلحہ خانہ رہتا تھا، اس لیے انھیں سلحدار کہتے تھے۔ اس کے علاوہ چار ہزار سواروں کا باڈی گارڈ بھی رہتا تھا جس میں بڑی تنخواہوں کے منتخب سپاہی بھرتی کیے جاتے تھے۔ ان کے گھوڑے ساز و سامان اور وردیاں وغیرہ بیش قیمت اور بہت اعلیٰ درجے کی ہوتی تھیں۔

سلطان احمد شاہ باڈی گارڈ کا نام اصطلاحِ بہمنیہ میں "خاصہ خیل" تھا۔

دلی بہمنی کے انتظامات سلطنت

خطابات سلطنت بہمنیہ میں سب سے بڑا خطاب خانخاناں کا سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد خواجہ جہاں۔ خان جہاں اور خان زماں وغیرہ کا درجہ تھا۔ ملک التجار کا خطاب بھی بہت بڑے درجے کا تھا۔ یہ خطاب سلطان احمد شاہ ولی بہمنی نے اپنے تخت نشین ہونے کے بعد خلف حسن بصری کو دیا تھا چونکہ یہ شخص سوداگر تھا اس لیے یہ خطاب تجویز کیا گیا تھا۔ ملک المشائخ۔ ملک العلماء اور ملک الشعراء بھی بڑے خطابات تھے اس کے بعد ملک کا خطاب تھا۔ مثلاً شیر ملک۔ نظام الملک۔ عین الملک وغیرہ آخر درجہ کا خطاب خانی کا تھا۔ مثلاً ملو خان اور سارنگ خان وغیرہ۔

فوجی اصلاحات سلطان احمد شاہ نے ملکی اصلاحات کے ساتھ ساتھ فوجی اصلاحات کی طرف بھی خاص توجہ کی تھی۔ چونکہ اُس زمانے میں سلطنت بہمنیہ کو ہمیشہ مخالف سلطنتوں سے سابقہ پڑتا تھا اس لیے فوجی اصلاحات ضروری اور اہم تھیں۔

سلطان علاء الدین حسن گانگو کے زمانے سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ کمانداروں کے دو درجے ہوتے تھے یعنی پانصدی اور ہزاری۔ ان میں سے پانصدی کو سالانہ ایک لاکھ ہن اور ہزاری کو سالانہ دو لاکھ ہن ملتے تھے۔ یہ روپیہ یا تو نقد دیا جاتا تھا یا اس کے معاوضے میں جاگیر عطا کی جاتی تھی۔ سپاہیوں کو شاہی خزانہ سے تنخواہ نہیں دی جاتی تھی۔ کماندار اپنی مرضی کے مطابق سپاہیوں کو تنخواہ دیا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ ممالک محروسہ کے سپہ سالار کو امیر الاُمراء کا خطاب دیا جاتا تھا۔ اس خطاب کے ساتھ اس کو ہزار پانصدی کے منصب سے بھی سرفراز کیا جاتا تھا۔ پانصدی اور ہزاری کماندار اسی کے ماتحت ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ امیران صدہ اور امیران سہ صدی بھی اسی کے ماتحت تھے۔ امیر صدہ سو سپاہیوں کا اور سہ صدی تین سو کا افسر ہوتا تھا۔ یہ پایۂ تخت کا فوجی انتظام تھا۔

صوبہ داری فوجی انتظام یہ تھا کہ طرفدار ہی سرلشکر ہوا کرتا تھا۔ یہ اپنے صوبہ کی فوج کا سپہ سالار سمجھا جاتا تھا۔ کل سلطنت چار صوبوں میں تقسیم تھی۔ اس لیے چاروں طرفدار اپنے اپنے علاقوں کی فوج کے سرلشکر یعنی سپہ سالار ہوا کرتے تھے۔ امیر الامراء اور

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے انتظامات سلطنت

کمانداروں کا تقرر بادشاہ خود کرتا تھا۔ یہ بڑے فوجی عہدے تھے۔ ان کے علاوہ کئی چھوٹے چھوٹے عہدے ان عہدہ داروں کے ماتحت قایم تھے۔

حسن گانگو بہمنی کے زمانے میں پایہ تخت میں پچاس ہزار سوار اور پچیس ہزار پیدل فوج رہا کرتی تھی۔ لیکن محمد شاہ اور دیگر سلاطین بہمنیہ کے زمانے میں اس تعداد میں اضافہ ہوا۔ علیٰ ہذا القیاس پایہ تخت میں مستقل طور پر تمام سلاطین بہمنیہ کے زمانے میں سوار اور پیدل فوج ایک لاکھ رہنے لگی۔ اس فوج کے علاوہ چاروں صوبجات میں سرلشکروں کے ماتحت کسی حالت میں بھی چالیس ہزار سے کم فوج نہیں رہتی تھی۔ اس طرح کہ ہر ایک صوبے میں دس ہزار سوار اور پیدل فوج رہا کرتی تھی۔ ضرورت کے وقت صوبہ دار اپنی فوج کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں شامل ہو جاتا تھا اور جان و مال کو بادشاہ پر نثار کرتا تھا۔ اس کے علاوہ جاگیرداروں کے پاس بھی فوج ہوا کرتی تھی جو ضرورت کے وقت کام آتی تھی۔

آپ کے عہد میں ممالک محروسہ کے سپہ سالاری کی خدمت پر امیر الامراء عین الملک فائز تھا۔ اس کو ہزار پانصدی کے منصب سے بھی سرفراز کیا گیا تھا۔ میر علی کرد المخاطب بہ کاکرش ہزاری کماندار اور قاسم بیگ صف شکن پانصدی کماندار تھے۔ میر فرخ بدخشی۔ میر علی سیستانی۔ حسن خاں۔ فرخ خاں اور سید حسن بدخشی امیران صدی اور خسرو بیگ اوزبک۔ خواجہ حسن اردستانی۔ عالم خاں۔ لودھی خاں اور دلاور خاں اور عبداللہ خاں نبیرۂ اسمٰعیل منج امیران صدہ تھے۔ بیدار نظام الملک سرلشکر دولت آباد۔ عبدالقادر مخاطب بخان جہان سرلشکر برار۔ عبداللطیف مخاطب بہ خان اعظم سرلشکر تلنگانہ اور خلف حسن بصری سرلشکر گلبرگہ و بیجاپور مقرر ہوئے۔

قدیم فوجی انتظام میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ اس کے علاوہ فوجی عہدہ داروں اور سرلشکروں کے اختیارات بہت بڑھ گئے تھے۔ اس لیے آپ نے اپنے زمانے میں اس حالت کو ملک کے لیے خطرناک تصور کر کے اصلاحات جاری کیں۔ آپ نے تمام نامناسب باتوں کی اصلاح کی اور ان عہدہ داروں کے اختیارات کم کر کے ان کی

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے اس کے علاوہ ان کی فوج کی تعداد بھی محدود اور کم کردی گئی تھی۔ لیکن ان کے عہدے اور درجے وہی قایم رکھے جو قدیم سے جاری تھے جب آپ ضرورت خیال کرتے تو ان کے اختیارات اور ان کی فوج میں اضافہ بھی کرتے تھے اس کی وجہ سے فوجی سپہ سالاروں اور سرلشکروں کی قوت بالکل کم ہوگئی اور وہ سب آپ کے قابو میں آگئے! ور ان کے بغاوت کرنے یا بادشاہ کے خلاف سازش کرنے کا اندیشہ باقی نہیں رہا تھا غرض آپ نے ایک بڑی حد تک تمام فوجی انتظام کو مرکزی حکومت کے تحت کرلیا تھا۔

انتظامات سلطنت

ایک حد معیّن کردی! ور ذیلی عہدہ داروں میں بھی جو اہم تھے ان کا تقرر آپ خود کیا کرتے تھے۔

سلاطین بہمنیہ کی ساری فوج کئی لشکروں پر منقسم تھی۔ ہر لشکر کے ساتھ متعدد ہاتھی اور توپ خانے ہوتے تھے سلطان محمد شاہ اوّل کے زمانے سے توپیں اور باروت بنانے کے کارخانے سلطنت بہمنیہ میں قایم ہوئے تھے اور یہی پہلا مسلمان بادشاہ ہے جس نے دکن میں بڑا توپ خانہ[1] ترتیب دیا تھا اور اس سے پہلے مسلمانوں میں توپ کا استعمال اور رواج شروع نہیں ہوا تھا تاریخ فرشتہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت بیجانگر میں بہمنیوں سے قبل توپوں کا رواج تھا چنانچہ محمد شاہ اوّل نے جب ۷۶۷ھ م ۱۳۶۵ء[2] میں بیجانگر پر چڑھائی کی اور

---

[1] توپ کے موجد عرب ہیں۔ انھوں نے ہی اسے اوّل اوّل ایشیا اور یورپ کے ملکوں میں رواج دیا! ان کے اور ایرانیوں کے ذریعے توپ کا رواج سلطنت بہمنیہ میں ہوا۔ کیونکہ اس [illegible] لوگ کثرت سے دکن آیا کرتے تھے۔ پرتگیزوں کی جب ہندوستان [illegible] شروع ہوئی تو انھوں نے اقرار کیا کہ سلاطین دکن کے پاس ان سے کہیں بہتر اور بڑا توپ خانہ ہے۔

[2] فرشتہ اس مورخ کا یہ قول کہ دکن میں مسلمانوں سے پہلے ہندوؤں میں توپ کا استعمال شروع ہو گیا تھا، غلط ہے کیونکہ یہ مسلمہ ہے کہ دکن میں توپ کا استعمال مسلمانوں ہی نے شروع کیا تھا اس کے علاوہ برہان ماثر میں اس لڑائی کے حالات میں توپ کا ذکر نہیں ہے لہذا فرشتہ کی روایت کہ اس جنگ میں راجہ بیجانگر نے توپ کا استعمال کیا تھا غلط ہے۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے انتظامات سلطنت

فتحیاب ہوا تو کئی توپیں اس کے ہاتھ لگیں۔ سلاطین بہمنیہ کا توپخانہ بیجا نگر سے زیادہ بہتر اور عمدہ تھا بہمنیوں کے زمانے میں توپچی کی خدمت پر اکثر رومی اور ترکی مسلمان مامور تھے۔ توپ خانہ کے افسر اعلیٰ کو بہمنیوں کی اصطلاح میں میر آتش کہتے تھے۔ محمد شاہ اول کے زمانے میں میر آتش مقرب خاں بن صفدر خاں سیستانی تھا بادشاہی کارخانوں میں توپیں بنائی جاتی تھیں۔ گولے ڈھالے جاتے تھے اور بندوقیں بھی تیار ہوتی تھیں انھیں کارخانوں میں تلوار، خنجر اور نیزے وغیرہ آلات حرب بھی تیار کیے جاتے تھے اور باروت بنانے کے بھی متعدد کارخانے قایم تھے۔ غرض محمد شاہ کے زمانے میں آتش بازی اور جنگ کے نہایت عمدہ آلات مہیا کیے گئے تھے۔ ممالک مقبوضہ میں بھی تعلقداروں کو تاکید کی جاتی تھی کہ وہ ہر وقت آلات حرب اور سامان جنگ فراہم اور مہیا رکھا کریں۔ مرکزی حکومت کے علاوہ ہر صوبہ میں بھی متعدد کارخانے قایم تھے، جہاں ہتھیار بنائے جاتے تھے، اور صیقل گر ان کو صیقل کیا کرتے تھے۔ آپ کے زمانے میں بھی متعدد کارخانے پایہ تخت بیدر میں قایم ہو گئے تھے اور نامی گرامی کاریگر دور دراز مقامات سے آکر بیدر میں جمع ہو گئے تھے۔ ان کاریگروں کی اولاد ابھی تک بیدر میں آباد ہے جو عمدہ ہتھیار بنایا اور صیقل کیا کرتی ہے۔ اور ایک محلہ انھیں کے نام سے محلہ صیقل گراں اب تک موجود ہے۔

لڑائیوں میں توپیں زیادہ کام آتی تھیں اور محاصروں میں اپنی زہرہ گداز آواز سنا کر قلعہ کی دیواروں کو خاک میں ملاتی تھیں۔ توپوں کے علاوہ محاصروں میں منجنیقیں اور گوپھنیں بھی استعمال کی جاتی تھیں۔ بہمنیوں کی فوج میں سواروں کی کثرت تھی جو عموماً ترکی اور ایرانی ہوا کرتے تھے۔ پیدل فوج بہت کم ہوا کرتی تھی۔ سوارہ فوج تیر اندازی میں ماہر تھی۔ اور چھوٹے چھوٹے گھوڑے ان کی سواری میں ہوا کرتے تھے۔ ان سواروں کے گھوڑے تاتاریوں کے گھوڑوں سے مشابہ کیے جاتے تھے۔ ہر سوار کے پاس دو سپاہیوں کے ہتھیار رہتے تھے۔ اور زمانۂ سفر میں دو سواروں میں ایک ٹٹو دیا جاتا تھا جس پر ایک ماہ کا سامان رسد لدا ہوتا تھا۔

سلاطین[1] بہمنیہ کے ہاں جنگی بیڑہ بھی موجود تھا جو جہاں ضرورت ہوتی وہاں بھیجا جاتا تھا

---

[1] فرشتہ۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے انتظامات سلطنت

اُن کا بیڑہ تمام ہندوستان میں مشہور تھا۔ ان کے ماتحت وابھول گوا۔ مچھلی بندر وغیرہ بندرگاہ تھے جن میں بہ کثرت جہاز رہا کرتے تھے۔ جنگی جہازوں کے علاوہ تجارتی جہاز بھی تھے جو تجارت کا سامان لیکر ایران، مصر، شام اور عراق وغیرہ کو جاتے اور وہاں کا مال لیکر واپس آتے تھے جہاز سازی کے کارخانے بھی انھیں بندرگاہوں پر تھے۔ یہاں سے ہر سال کئی جہاز صدہا زائرین کو لیکر مکۂ معظمہ جایا کرتے تھے۔ غرض سلاطین بہمنیہ کی بحری قوت بہت مشہور تھی اور انتظامات بھی عمدہ تھے۔

اس فوج[1] کے علاوہ بادشاہ کی خاص باڈیگارڈ فوج بھی ہوا کرتی تھی جو بہمنیوں کی اصطلاح میں "خاصہ خیل" کہلاتی تھی۔ یہ خاصہ خیل ایک افسر کے ماتحت تھی جس کو سرخیل کہا جاتا تھا جو اپنی فوجی خدمت نائب کے ذریعے سے انجام دیتا تھا۔ یہ سوارہ فوج تھی جو چار ہزار جوانان یکہ پر مشتمل تھی۔ علاوہ جوانان یکہ کے وہ لوگ جن کو شاہی ہتھیار۔ نفیس تلوار۔ تیر۔ نیزہ اور علم کی حفاظت کرنے کی خدمت سپرد کی گئی تھی اسلحدار کہلاتے تھے۔ ان کی تعداد بھی دو سو تھی۔ ان کے افسر کو سرسلحداران کہتے تھے۔ ان کے سوائے باردار خاص بادشاہ کے محافظ ہوا کرتے تھے۔ ان کی تعداد بھی دو سو تھی جو ایک افسر کے ماتحت تھے جن کو نواہی کہتے تھے۔ اِن کا کام یہ تھا کہ بادشاہی دربار میں اُمرا اور سرلشکروں کو باریاب کرائیں اور لشکر شاہی کو حاضر کریں۔

پچاس اسلحدار اور ایک ہزار خاصہ خیل نوبت بنوبت روزانہ حاضر دربار رہتے تھے۔ دیگر اُمرا و منصبدار بھی چوکی اور پہرہ میں شریک ہوتے تھے۔ اس میں ایک افسر ہوتا تھا جس کو سرنوبت کہتے تھے۔ اور ان میں چوکی اوّل کے سرنوبت کو دوسرے سرنوبتوں پر فوقیت ہوتی تھی اُس کو افسر سرنوبت کہتے تھے آپ کے عہد میں سرنوبت[2] میمنہ کی خدمت پر محمد بن علی بادردی فائز تھا اور سرنوبت میسرہ پر عبد اللہ خاں اور عبد القادر بن عیسٰی بن محمود بن عماد الملک سر اسلحداران تھا۔ ان تمام کا کام یہ تھا کہ بادشاہ کے جان و مال کے محافظ رہیں محل شاہی پر رات دن پہرہ دیں اور کسی بیرونی شخص کو بغیر اجازت اور بغیر توسل بارداروں کے محل شاہی اور دربار میں داخل

---

[1] فرشتہ اور کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم۔

[2] برہان ماثر۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے انتظامات سلطنت

ہونے نہ دیں۔ سلاطین بہمنیہ کے سلح خانے میں فولادی تلواریں، فولادی خنجریں، کھٹاریں، سپر، آہنی زرہ، آہنی خود، نیزے، تیر و کمان، بندوق، گرز آہنی اور بارود کے متعدد کوٹھے تھے۔ بہمنیوں کے ہاں فیل خانہ، شتر خانہ اور گاڑی خانہ بھی تھا فیل خانے میں کسی وقت دو ہزار سے کم فیل نہ رہتے تھے۔ شتر خانے میں ایک ہزار سے زاید اونٹ اور گاڑی خانے میں دو سو تھیں، تین سو گاڑیاں دو ہزار مالوی اور گجراتی بیل اور خاص شاہی گھوڑے پانچسو سے کبھی کم نہیں رہتے تھے۔

بیدر میں پایۂ تخت کی منتقلی

جس زمانے میں سکندر رومی نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا دکن کے مشہور راجہ بیدر[1] فرزند راجہ پانڈو نے بیدر کو آباد کر کے اپنے نام سے موسوم کیا تھا اس کے علاوہ کتب رامائن اور مہابھارت میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ چونکہ اس زمانے میں یہاں بانس بہ کثرت تھا اور کنڑی میں بانس کو "ویدر" کہتے تھے یہ شہر ایک زمانے تک "ویدر" ہی مشہور رہا اور بعد میں کثرت استعمال سے "بیدر" ہو گیا۔ رایان ورنگل[2] بیدر کی نزہت بخش آب و ہوا اور دلفریب مناظر کی بہت قدر کرتے تھے اور ان کا دارالسلطنت گو ورنگل تھا لیکن سال میں ایک مرتبہ وہ ضرور اس کی سیر کرنے اور دیول دیر سنگیا[3] کی پوجا کے لیے آتے تھے۔ اسی خاندان کے ایک راجہ مسمی راجہ امر سنگھ نے بیدر میں ایک قلعہ بنایا تھا جو تالاب کے کنارے ابھی تک موجود ہے۔ رامائن اور پرانوں میں لکھا ہے کہ یہ جنوبی ہند کا مشہور شہر ہے۔ اور فرشتہ اور محمد شاہی میں مذکور ہے کہ بیدر راجایان دکن کا دارالسلطنت تھا راجہ بھیم سین نے اس کو دارالسلطنت بنایا تھا اس کی لڑکی کا نام دمن تھا جو راجہ نل

لہ۔ قوم بیدر جو شجاعت اور بہادری میں مشہور عالم ہے اسی راجہ کی نسل سے ہے۔

تلہ۔ ورنگل کا راج اہل ہنود کا بہت ہی قدیم اور مشہور راج ہے اس پر اندر بنس کے راجہ حکمران تھے۔

سلہ۔ یہ دیول اندرون قلعہ ارک قدیم قلعہ میں تالاب کے کنارے شمالی سرحد پر موجود ہے جس کی پوجا آج تک بھی ہوا کرتی ہے۔ بعض لوگ اس کو مہادیو کا دیول بھی کہتے ہیں۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے انتظامات سلطنت

حاکم مالوہ کی مثنوی تھی۔ فارسی میں اس قصہ کو فیضی نے نظم کیا ہے جو بہت مشہور ہے۔ سنہ ۷۲۲ھ مطابق ۱۳۲۲ء تک یہ شہر ورنگل کے راج میں شامل رہا لیکن جونا خاں فرزند غیاث الدین تغلق شہنشاہ دہلی نے پرتاب رودر دیو راجہ[1] ورنگل سے اس کو چھین لیا تھا۔

مسلمانوں کے زیر اثر آنیکے بعد یہ غیر ممکن تھا کہ اُس کی شان و شوکت اور آبادی میں روز افزوں ترقی نہ ہوتی۔ شہزادہ جونا خاں نے شہاب سلطان المخاطب بہ نصرت خاں کو دکن کی مفتوحہ سرزمین کا حاکم مقرر کیا اور اُس کا مستقر بیدر قرار دیا۔ مفتوحہ ممالک پر فاتحین کی ابتدائی حکومت "درشتی و نرمی بہم در بہ است" کے اعلیٰ اصول پر قایم ہوئی۔ اس سے بیدر کی شان و شوکت میں اور بھی ترقی ہوئی۔ یہ بات بہت ہی معمولی ہے کہ جس مقام اور جس اجلاس پر ماتحتین کے ساتھ جابرانہ سلوک کیا جاتا ہے اُس کی عظمت و شوکت، رعب و داب کا اثر غیر معمولی طور پر دلوں پر مرتسم ہو جاتا ہے۔ بیدر کی اعلیٰ حکومت شہزادہ کی قیادت کی زیر نگرانی کل مملکت دکن پر اپنی غیر معمولی شان و شوکت کا سکہ جمانے لگی۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد ۷۲۵ھ م ۱۳۲۵ء میں جب شہزادہ نے تاج و تخت پایا اور اپنا نام سلطان محمد تغلق رکھا تو دکن زیادہ تر اُس کے شجاعانہ و مردانہ کارناموں کا مرکز بن گیا اور قریب قریب اس کے ہر حصہ پر شہنشاہ دہلی کا پرچم اقبال لہرانے لگا۔ اب ملک کی وسعت نے یہ شکل پیدا کی کہ دہلی مرکز اور دارالسلطنت رہنے کے قابل نہیں رہی۔ بلکہ دیوگڑھ[2] یعنی دولت آباد پایہ تخت بنایا گیا۔ شہر دہلی کے علماء، فضلاء، صوفیائے کرام اور تمام باشندے جبراً و قہراً وہاں لائے گئے۔ اور دکن پر پوری پوری نگرانی قایم رکھنے کے ممکن وسائل آسان کر دیئے گئے۔ اس طرح ایک عظیم الشان شہر پر زوال آنے لگا لیکن دولت آباد حسب مراد نہ ہو سکا۔ بادشاہ کی اس حرکت نے عوام کو مغموم بنا دیا تھا جب اس سے گزر کر اس کی سیاستیں اور لغزشیں عموماً تکلیف دہ ہونے لگیں اور جب وہ بلا کسی غور و خوض کے سخت سے سخت سزائیں اور ناقابل برداشت احکام

---

[1] تاریخ فیروز شاہی مولفۂ ضیاء الدین برنی لیکن فرشتہ نے اس راجہ کا نام لدر دیو راجہ لکھا ہے۔

[2] تاریخ فیروز شاہی مولفۂ ضیاء الدین برنی۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے انتظامات سلطنت

نافذ کرنے کا عادی بن گیا تو اُمرائے دربار نے اُس کی اطاعت سے منحرف ہونے کی تدابیر سوچیں اور بالاتفاق دکن میں اپنی قوتیں بڑھانے اور اُس کو غصب کر لینے کی تجویزیں کرنے لگے۔ بیدر کا حاکم نصرت خاں بھی اس سازش میں شریک ہوگیا۔ مگر یہ راز بہت عرصہ تک پوشیدہ نہ رہ سکا۔ اور سلطان نے اُس کو معزول کر کے قتلغ خاں کو حکومت بیدر سے سرفراز کیا جو اس کا استاد اور کسی قدر معتمد علیہ شخص تھا۔ اب نصرت خاں نے آزادی کے ساتھ اُمرائے دکن سے ملکر بغاوت کے منصوبے باندھے، رعایا اور تمام راجاؤں کو اپنا موافق بنا لیا اور ۷۴۲ھ مطابق ۱۳۴۲ء میں جب بادشاہ مہمات دکن سے واپس ہوا تو سبھوں نے دولت آباد میں اپنے مرکوز خاطر کا اعلان کیا اور اسمٰعیل مغ کو ناصر الدین شاہ خطاب دے کر اپنا خود مختار بادشاہ بنا لیا۔ یہ خبر پاتے ہی محمد تغلق نے دولت آباد پر چڑھائی کی اور باغیوں کو شکستیں بھی دیں مگر اُسے سوائے نقصان کے کچھ فائدہ حاصل نہ ہوا۔ لاہور و گجرات کے فتنہ و فساد کو فرو کرنے کے لیے اسے واپس ہو جانا پڑا اور پھر دکن باغیوں کی جولاں گاہ بن گیا۔ علی شاہ نامی ایک باغی امیر اپنے چھوٹے سے لشکر کے ساتھ بیدر پر مسلّط ہوگیا۔ مگر قتلغ خاں حاکم بیدر نے بہت جلد اس کا قبضہ اٹھا دیا۔ اتنے میں سلطان محمد تغلق کا داماد عماد الملک تبریزی بھی ایک جرار فوج کے ساتھ بیدر پہنچ گیا اور باغیوں کی سرزنش شروع کر دی۔ اُمرائے دکن کی جانباز فوج بھی فوراً بسر کردگی حسن گانگو بہمنی سپاہ سالار دکن کو اس کے مقابلہ پر آگئی۔ اس فوج کی تعداد تیس ہزار تھی۔ اس کے علاوہ راجہ ورنگل نے جو حسن کا ستایا ہوا تھا پندرہ ہزار فوج سے تائید کی اور دکن کا نیا بادشاہ ناصر الدین بھی پانسو سواروں کے ساتھ آپہنچا۔ طرفین میں کشت و خون شروع ہوگیا اور معرکہ کی لڑائیاں ہوئیں۔ بالآخر پُر جوش دکنی غالب آگئے اور عین معرکۂ کارزار میں عماد الملک تبریزی مارا گیا۔ بیدر پر بہ فتح و ظفر قابض ہونے کے بعد حسن نے دولت آباد کا ارادہ کیا اور یکے بعد دیگر محمد تغلق کے تمام مقبوضہ قلعوں کو دکنی لیتے گئے۔ اس بغاوت اور سرکشی میں زیادہ تر جانبازی اور اولوالعزمی حسن ہی نے دکھائی تھی

لہ ۔ فرشتہ اور تاریخ فیروز شاہی مولفہ ضیاء الدین برنی ۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے انتظامات سلطنت

اور اکثر بلکہ کل فتوحات اسی کے ہاتھ پر ہوئی تھیں اس لیے ناصر الدین شاہ نے بطیب خاطر اس کو حکومت دے دی اور ۲۴ ربیع الثانی ۷۴۸ھ م ۱۳۴۷ء روز جمعہ کو تاج شاہی باضابطہ اُس کے حوالہ کر دیا۔ نئے بادشاہ نے اپنا لقب سلطان علاء الدین حسن گانگو بہمنی رکھا اور گلبرگہ کو حسن آباد نامزد کر کے اپنا دار السلطنت قرار دیا۔ اور دکن کی اعلیٰ حکومت کا مستقر اٹھ جانے سے سلطان علاء الدین حسن گانگو کے ہاتھوں بیدر کی روز افزوں ترقی کو نقصان پہنچا اور اس کو تلنگانہ کے ساتھ ملا کر دکن کا منجملہ چار صوبوں کے ایک صوبہ بنا دیا گیا جس کے طرفدار کو اعظم ہمایوں کا خطاب دیا گیا تھا۔

سلطان احمد شاہ خاندان بہمنیہ کے نویں بادشاہ تھے آپ کے عہد سلطنت تک تاجدارانِ بہمنیہ کا پایہ تخت گلبرگہ تھا آپ پہلے بادشاہ ہیں جنھوں نے بجائے گلبرگہ کے اپنا پایہ تخت بیدر قرار دیا اور اپنی زندہ دلی اور جوہر شناسی کی بدولت اس سرزمین کی اس قدر قدر کی کہ اُسے معراج کمال تک پہنچا دیا اور آپ کی نظر سے یہاں کے پوشیدہ معادن بھی مخفی نہیں رہ سکے۔ اس کی کیفیت یہ ہے[1] کہ تقریباً کل ممالک تلنگانہ اور مرہٹواڑی اور کرناٹک فتح اور ہوشنگ شاہ والی مالوہ (مانڈو) کو شکست دینے کے بعد شہزادوں اور چند مخصوص درباریوں کے ساتھ ایک روز آپ بتقریب شکار سواد بیدر میں داخل ہوئے۔ اثنائے سیر میں آپ کی نظر ایک صحرا پر پڑی جو نہایت پُر فضا تھا آپ اس کے نظارہ سے بہت خوش ہوئے۔ شکار[2] کے لیے کُتے کو لومڑی پر چھوڑا۔ لومڑی گھبرا کر کُتے پر جھپٹی، کُتا عاجز آکر پلٹ گیا آپ نے یہ حال دیکھ کر ساتھی اُمراء سے فرمایا کہ اس سرزمین کی آب و ہوا میں شجاعت و شہامت کا اثر معلوم ہوتا ہے کہ لومڑی کُتے پر غالب آگئی، اس مقام کو ضرور پایہ تخت بنانا چاہیئے۔ اُمراء نے عرض کی کہ بادشاہ کا خیال نہایت مبارک ہے اور گویا ایک الہام غیبی ہے کہ جو قلب مبارک پر نازل ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بیدر مملکت دکن کے وسط میں واقع ہے۔ اور آب و ہوا کے لحاظ سے بھی

---

[1] فرشتہ۔

[2] اس قسم کی روایت اور دوسرے شہروں کے متعلق بھی مشہور ہے لہذا تبدیل پایہ تخت کی یہ وجہ نہیں ہو سکتی۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے انتظامات سلطنت

ہندوستان کا بہترین شہر ہےلہ ۔ "سلطان سورتی لہ میں اس واقعہ کو اس طرح لکھا ہے کہ آپ شکار کے لیے بیدر کے قریب تشریف لائے جہاں بانس بن تھا مگر آب و ہوا نہایت پاک و صاف اور منظر نہایت خوشگوار تھا۔ اثنائے شکار میں اتفاقاً آپ کی نظر ایک لومڑی پر پڑی جو پلٹ کر شاہی شکاری کتوں سے مقابلہ کرنے لگی۔ یہ دیکھ کر آپ نے خیال کیا کہ یہ اس مقام کی آب و ہوا کا

لہ ۔ بیدر کے متعلق فرشتہ کا بیان ہے کہ میں نے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کی سیاحت کی ہے لیکن لطافت اور خوبی میں اس سرزمین کا نظیر میری نگاہوں سے نہیں گذرا اس مقام کی خاک شنجرف کی طرح سُرخ ہے۔ برسات کے موسم میں جو ہندوستان کی ایک عمدہ فصل ہے کیچڑ بالکل نہیں ہوتی اس لیے کہ شہر سے دس کوس کے جوار تک تمام سرزمین سُرخ ہے اور اس میں لیسندہ مادہ موجود نہیں ہے۔ سیر و شکار کے وقت ساون بھادون میں گھوڑا نہیں تھکتا گھوڑوں کے سم اور آدمیوں کے قدم گِل آلود نہیں ہوتے۔ کیچڑ کے چھینٹے سر پر نہیں پہنچتے اور پاؤں بھی نہیں پھسلتا۔ ہاتھ میں جوتیاں اور پائینچا چڑھانے کی نوبت نہیں آتی۔ ادھر بارش ہوئی اُدھر پانی جابجا بہ گیا۔ اور شہر کے گلی کوچے صاف ہوگئے۔ علاوہ اس کے لطف یہ ہے کہ کپڑے اور بدن سُرخ نہیں ہوتے۔ خراسان اور عراق کے اکثر میوے یہاں پیدا ہوتے ہیں۔ خواجہ محمود گاواں نے اپنے زمانے میں زعفران، امرود اور ہر قسم کے انگور کے درخت بھی یہاں نصب کرائے تھے۔ اس زمانے میں اس شہر کا کوئی سرپرست نہیں ہے اور عالیجاہ فرمانرواؤں کا یہ پایہ تخت ہے۔

لہ ۔ یہ کتاب قلمی اور قدیم مرہٹی میں ہے۔ اس میں صرف سلاطین بہمنیہ گلبرگہ اور اور بیدر کے حالات درج ہیں۔ یہ کتاب موضع سول پور ضلع بیدر کے پٹیل کے پاس ہے۔ میں نے اس کے پاس سے کتاب مذکور حاصل کی ہے۔ اور مسٹر جوشی پروفیسر مرہٹی کلیہ جامعہ عثمانیہ کی مدد سے استفادہ کیا ہے۔ کتاب بوسیدہ ہونے کی وجہ سے سنہ تالیف کا پتہ نہیں چلتا۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے انتظامات سلطنت

اثر ہے جس نے اس جانور کو اس قدر ہمت والا بنا دیا ہے۔ آپ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ گھوڑوں پر اس کا پیچھا کیا۔ تعاقب کرتے کرتے سب لوگ تھک کر ایک سایہ دار درخت کے نیچے ٹھیرے اور پانی کی تلاش کرنے لگے۔ وہاں انھوں نے ایک ضعیف چرواہے کو دیکھا اور اس سے دریافت کیا کہ پانی کہاں ملے گا اس نے ایک چشمہ بتایا جس پر ایک پتھر ڈھنکا ہوا تھا اس پتھر کو وہ لوگ نہ اٹھا سکے اور اس نے اپنی لکڑی سے اس کو ہٹا دیا۔ سب لوگوں نے اس چھوٹے سے چشمہ سے سیر ہو کر پانی پیا۔ آپ نے اس کے استدراج پر تعجب کرکے اس کا اور مقام کا نام دریافت کیا۔ اس نے جواب دیا کہ اس کا نام بھکنڈہ اور مقام کا نام بیدر ہے۔ آپ نے اُس سے اِس مقام پر ایک قلعہ تعمیر کرنے کی خواہش ظاہر کی جس کو اس نے پسند کیا اور اُس نے اپنی یہ خواہش ظاہر کی کہ قلعہ میں اس کے نام پر ایک مندر تعمیر اور ایک گاؤں آباد کیا جائے۔ آپ نے مبارک ساعت میں قلعہ بیدر کا سنگ بنیاد رکھا اور قلعہ میں چشمہ کے مقام پر ایک تالاب بنا کر اس کی استدعا کے مطابق اس کا نام تالاب بھکنڈہ رکھا۔"[1]

نجومیوں اور اختر شناسوں کو طلب کیا گیا اور ان کے مشورے سے قرار پایا کہ بیدر کو پایۂ تخت بنانا مبارک ہے تو نیک ساعت دیکھ کر شہر کی بنیاد ڈالی اور اس کو آباد کرکے نام اس کا محمد آباد بیدر[2] رکھا۔ ماہرین فن مہندسوں سے شہر اور عمارتوں کے نقشے کھنچوائے گئے اور دور دراز ممالک سے نہایت مشہور اور عقلمند کاریگروں، سنگتراشوں، معماروں اور انجینیروں کو طلب کرکے یہاں قلعہ[3]، حصار، محلات شاہی، مسجد اور باغات کی تعمیر شروع کرائی۔ اور بتاریخ ۲۲ رجب ۸۳۲ھ م ۱۴۲۹ء[4] آپ نے تخت بیدر پر جلوس فرمایا۔ یہاں عالیشان عمارتیں، شاہی محلات، امراء کے شاندار قصر، قلعہ، باغات اور مساجد وغیرہ چار سال کے عرصے میں یعنی ۸۳۶ھ م ۱۴۳۲ء میں

---

[1] ۔ فرشتہ۔

[2] ۔ برہان مآثر۔ لیکن فرشتہ نے احمد آباد لکھا ہے جو غلط ہے۔

[3] ۔ ان عمارات کے مفصل حالات "احمد شاہ کے زمانے کا فن تعمیر" میں بیان کیے گئے ہیں۔

[4] ۔ تاریخ فرشتہ اور منتخب اللباب جلد سوم مولفہ خافی خاں میں ۸۳۲ھ م ۱۴۲۹ء ہیں

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے انتظامات سلطنت

تیار ہو گئے۔ زمین کی صلاحیت اور اس کے قدر دان کی قابلیت سے ہر طرف گل و گلزار نظر آنے لگا۔ صنعت و حرفت و پیداوار میں بیحد ترقی ہوئی اور باخدا سلطان کی بیدریغ فیاضیوں کی بدولت دنیا کے ہر گوشہ سے ملک میں علماء، فضلا اور ہر قسم کے ہنرمند جمع ہو گئے۔

تذکرۃ الملوک مولفہ ملا رفیع الدین ابراہیم بن نور الدین توفیق شیرازی میں لکھا ہے کہ "شہر محمد آباد میں جو اب شہر بیدر کے نام سے مشہور ہے سلطان احمد بہمنی سلطان فیروز کے قتل کے بعد تخت پر بیٹھا اور ہر طرف سے اطمینان حاصل کر کے اپنی جگہ مستقل ہوا۔ ایک روز شکار کے ارادہ سے حوالی بیدر میں گیا۔ ایک کتے نے خرگوش کا تعاقب کیا اور خرگوش نے پلٹ کر کتے کا مقابلہ کیا اور کتے پر غالب ہوا۔ یہ حال مشاہدہ کر کے آپ نے کہا کہ آب وہوا اس زمین کی شجاع و دلیر بناتی ہے۔ کیونکہ خرگوش کتے پر غالب آیا ہے۔ اگر ہم اس جگہ شہر آباد کریں اور پایہ تخت قرار دیں تو جو آدمی یہاں پیدا ہوں گے اور اس آب وہوا میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تبدیل پایہ تخت ہونا لکھا ہے۔ سلسلۂ آصفیہ جلد سوم تاریخ دکن حصۂ اول میں ۸۳۳ھ میں تبدیل ہونا تحریر ہے۔ ترجمہ تاریخ فرشتہ جلد سوم سررشتہ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ سرکار عالی میں لکھا ہے کہ یہ واقعہ ۸۳۲ھ/۱۴ کا نہیں ہے بلکہ ۸۳۰ھ کا ہے۔ مولوی غلام یزدانی صاحب ناظم آثار قدیمہ سرکار عالی نے اپنی کتاب آثار قدیمہ بیدر" میں تبدیلیٔ پایہ تخت کا سنہ ۱۴۲۹ء میں ہونا، فرشتہ اور منتخب اللباب کے حوالے سے لکھا ہے۔ لیکن قلعہ کی عمارات کی تعمیر ۸۳۰ھ م ۱۴۲۶ء میں شروع ہو کر چھ سال کے عرصہ میں یعنی ۸۳۶ھ م ۱۴۳۲ء میں ختم ہونا لکھا ہے۔ فرشتہ نے بھی قلعہ کی عمارات کی تعمیر کا سنہ ۱۴۳۲ء میں شروع ہو کر چار سال کے عرصہ یعنی ۸۳۶ھ م ۱۴۳۲ء میں ختم ہونا لکھا ہے۔ تعمیر کی ابتدا کا جو سنہ سررشتہ تالیف و ترجمہ نے دیا ہے اس کی تائید مولوی غلام یزدانی صاحب کی کتاب سے بھی ہوتی ہے۔ لہذا ۸۳۲ھ کے بجائے ۸۳۰ھ کو صحیح تصور کرنا چاہیئے لیکن یہ تبدیل پایہ تخت کا صحیح سنہ نہیں ہے۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے انتظامات سلطنت

نشو ونما پائیں گے وہ یقیناً شجاع اور بہادر ہوں گے۔ دوسرا یہ کہ چونکہ شہر حسن آباد میں سلطان فیروز شاہ کا قتل واقع ہوا ہے اس لیے حسن آباد کو پایہ تخت قایم رکھنا مبارک نہ ہوگا۔ پس ساعت نیک معلوم کرکے محمد آباد میں شہر کی بنیاد ڈالی گئی اور تھوڑے ہی عرصہ میں شہر تیار ہوا اور بادشاہ نے اپنی زندگی یہاں عیش وکامرانی سے گذاری۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے تخت نشین ہونے کے بعد ہی ۸۲۵ھ م ۱۴۲۲ء میں بیدر کو آباد کرکے پایہ تخت قرار دیا۔ اور بھائی کے قتل کی بدنامی کی وجہ سے گلبرگہ سے پایہ تخت کو تبدیل کرکے بیدر میں منتقل ہوئے۔ بیدر کا قیام پسند آنیکے متعلق تذکرۃ الملوک نے جو قصہ بیان کیا ہے اس میں اس نے فرشتہ کی پیروی کی ہے۔ اس نے بجائے لومڑی کے خرگوش کا نام لکھا ہے۔ باقی قصہ ایک ہی ہے۔

برہان ماثر کے مولف علی بن عزیز اللہ طباطبائی مازندرانی نے لکھا ہے کہ آپ تخت نشینی کے دوسرے سال ماہ رجب میں یعنی رجب ۸۲۶ھ م ۱۴۲۳ء میں[1] شہزادوں، امراء، وزراء اور تمام خدام وحشم کے ساتھ گلبرگہ سے پایہ تخت کو تبدیل کرکے تخت بیدر پر جلوس فرمایا۔ پایہ تخت کی تبدیلی کی وجہ اس نے یہ لکھی ہے کہ آپ نے بیدر کی بہترین آب وہوا اور پر فضا مقام دیکھ کر شہر آباد کیا جس کا نام محمد آباد بیدر رکھ کر دارالسلطنت قرار دیا۔ اور قلعہ اور دیگر عالیشان محلات وعمارات تعمیر کرائے۔ اس مولف نے بھی مقام بیدر اور اس کی آب وہوا کی بہت تعریف کی ہے۔

تبدیلی پایہ تخت کی تاریخ اور واقعات میں مورخین کا اختلاف ہے۔ اوپر کے قصے تاریخ فرشتہ۔ منتخب اللباب جلد سوم مولفہ خافی خاں۔ تذکرۃ الملوک اور سلطان سوری میں

---

[1] کیمبرج ہسٹری کے مولف نے بھی تبدیلی پایہ تخت میں برہان ماثر کی تائید کی ہے لیکن سنہ میں فرشتہ کی یعنی اس کا بیان ہے کہ آپ نے ۱۴۲۹ء میں بیدر کو پایہ تخت قرار دیا اور کئی سرویروں، معماروں اور مزدوروں کو طلب کرکے قدیم قلعہ کے بازو نیا شہر آباد کیا اور اس کا نام محمد آباد بیدر رکھا۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے انتظامات سلطنت

ایک دوسرے سے کسی قدر اختلاف کے ساتھ مذکور ہیں۔ اس قسم کے قصے دوسرے شہروں کے متعلق بھی مشہور ہیں۔ ان واقعات کی وجہ سے آپ جیسے اُولوالعزم بادشاہ کا تبدیل پایۂ تخت کرنا خلاف قیاس اور غلط ہے اور نہ عقل اس کو تسلیم کرتی ہے۔ پس میری رائے میں تبدیل پایہ تخت گلبرگہ بہ بیدر نظم و نسق اور سیاسی نقطہ نظر سے کیا گیا تھا۔ آپ کی اور آپ کے پیشرو سلاطین کی فتوحات سے تقریباً تمام ملک دکن سوائے بیجا نگر کی چھوٹی ریاست کے آپ کے زیر حکومت آگیا تھا۔ اب ملک کی وسعت نے یہ شکل پیدا کی کہ گلبرگہ مرکزاور دار السلطنت رہنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ ایسی حالت میں جو کوئی لائق اور مدبر بادشاہ ہوگا وہ اپنا دار السلطنت ایسے مقام کو بنائے گا جو اس کے مقبوضہ ملک کے بیچ میں واقع ہو جہاں سے ہر مقام پر عمدگی سے نگرانی اور انتظام سلطنت کیا جا سکے اور ضرورت کے وقت آسانی سے فوجیں جنگ کے لیے روانہ کی جا سکیں چونکہ آپ بھی ایک لائق اور مدبر بادشاہ تھے اس لیے کسی حالت میں بھی آپ سے توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ آپ گلبرگہ پایہ تخت قایم رکھیں گے اور یہ تمام باتیں بیدر سے پوری ہو سکتی تھیں۔ کیونکہ بیدر مملکت بہمنیہ کے بیچوں بیچ واقع تھا یعنی اس کے جنوب میں بیجانگر مشرق میں اڑیسہ، شمال میں مالوہ وخاندیس اور مغرب میں گجرات کی سلطنتیں تھیں۔ اور یہاں سے سلطنت کے ہر علاقے پر اچھی نگرانی ہو سکتی تھی اس لیے آپ نے بجائے گلبرگہ کے بیدر کو پایہ تخت بنایا جو بہت مفید اور کارآمد و کامیاب ثابت ہوا اور سلطنت بہمنیہ کے خاتمہ تک دار السلطنت قایم رہا اور جغرافیائی حالت کے لحاظ سے بھی سلطنت بہمنیہ کا پایہ تخت بیدر کو ہی ہونا چاہیئے تھا کیونکہ بیدر سطح سمندر سے ۲۳۳۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور اس کا عرض البلد شمالی ۱۷ درجہ ۵۴ دقیقہ ۵ ثانیہ اور طول البلد شرقی ۷۷ درجہ ۳۴ دقیقہ ۱۲ ثانیہ ہے۔ کسی دوسرے مقام میں یہ باتیں نہیں پائی جاتی تھیں۔ اس لیے بیدر کو پایہ تخت بنانے کی ان حسب بالا وجوہ کے سوا اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی۔ مورخین کی بیان کی ہوئی تمام روایات غلط معلوم ہوتی ہیں۔

سنہ تبدیلی پایہ تخت میں مجھے برہان ماثر کی روایت صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ سررشتہ آثار قدیمہ حیدر آباد دکن میں آپ کے زمانے کا ۸۲۷ھ کا بیدر میں ضرب کیا ہوا سکہ موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۸۲۷ھ سے قبل یعنی ۸۲۶ھ میں بیدر کو

سلطان احمد شاہ پایہ تخت بنایا گیا تھا۔ لہٰذا فرشتہ، تذکرۃ الملوک وغیرہ کے دیئے ہوئے سنین بالکل غلط اور ولی بہمنی کے برہان ماثر کا دیا ہوا سنہ صحیح ہے۔

انتظامات سلطنت

طیلسائین عثمانیہ کی پانچویں سالانہ کانفرنس

روداد

طیلسائین عثمانیہ کی پانچویں سالانہ کانفرنس بمقام سٹی کالج بتاریخ ۱۵؍ آذر ۱۳۴۲ف روز چہارشنبہ بوقت ۱۰ ساعت صبح منعقد ہوئی۔ مسٹر بی۔ ین چوبے کی صدارت میں عبدالسلام صاحب ذکی بی۔ اے (عثمانیہ) کی حمد سے جلسہ کی کارروائی کا آغاز ہوا اس کے بعد گنڈے راؤ صاحب ہروالکر بی۔ اے۔ یل۔ یل۔ بی (عثمانیہ) نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں ملک کی عام حالت پر روشنی ڈالتے ہوئے نواب مرزا یار جنگ بہادر کے علمی ذوق کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ کلیم الدین صاحب انصاری کی قابلیت کے اعتراف کے بعد ملک کی عام تعلیمی حالت اور نوجوانوں کی جد و جہد پر مناسب تبصرہ کیا۔

اس کے بعد نواب مرزا یار جنگ بہادر صدر المہام عدالت و امور مذہبی نے افتتاحی تقریر فرمائی۔ آپ نے کہا کہ تعلیم کے جو درخت نصب کیئے گئے وہ اب ملک کے مخلص خادموں کی صورت میں پھل دے رہے ہیں اور چند کلیاں ایسی ہیں جو ابھی کھلنے والی ہیں آپ نے فرمایا کہ اس باغ کے ایک مزدور کی حیثیت سے مجھے انھیں دیکھ کر مسرت ہوتی ہے۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ آپ کی تحریکات کو گورنمنٹ وقعت کی نگاہوں سے دیکھتی ہے اس لیئے ان کو پیش کرنے میں احتیاط اور کافی غور کر لینا چاہیے تاکہ گورنمنٹ ان کو نہ صرف قبول کرے بلکہ ان پر عمل کرنے کی بھی سعی کرے۔

زندگی کا نصب العین یہ ہے کہ ہر جاندار سے خواہ وہ انسان ہو یا حیوان محبت کا

برتاؤ کرنا چاہیئے اور تمام بنی نوع انسان کی خلوص کے ساتھ خدمت کرنا چاہیئے یہی اصول صحیح انسانیت تک پہنچاتا ہے۔

نواب فخر نواز جنگ بہادر کی تحریک اور راجہ گرو داس صاحب کی تائید صدارت کے بعد صدر کانفرنس، محمد کلیم الدین صاحب انصاری کرسی صدارت پر تشریف فرما ہوئے۔ ڈاکٹر سید حسین صاحب سابق صدر کانفرنس نے نواب مرزا یار جنگ بہادر اور مولوی کلیم الدین صاحب انصاری کو پھول پہنائے۔

۱۰ ر ۴۵ منٹ پر صدر کانفرنس نے اپنا خطبہ شروع فرمایا آپ نے اظہار تشکر کے بعد جامعہ عثمانیہ کے اخراجات، ملک کی عام تعلیمی حالت اور حیدر آباد کے دیگر اداروں کا ذکر کرنے کے بعد ملک کے اہم مسئلہ یعنی شرکت وفاق کے متعلق بھی اشارتاً اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ انجمن طیلسانئین کے دائرۂ عمل پر بحث کرنے کے بعد آپ نے یقین دلایا کہ جو ذمہ داری آپ کے سپرد کی گئی ہے اس کو حسن وخوبی انجام دینے کی حتی المقدور سعی فرمائیں گے۔

خطبۂ صدارت کے بعد صدر کانفرنس نے میر سکندر علی صاحب وجد بی اے (عثمانیہ) کو اپنی نظم "طیلسانئین عثمانیہ سے" سنانے کے لیے طلب کیا موصوف کی نظم پسند کی گئی اور عوام کے اصرار پر صدر جلسہ نے آپ کو دوبارہ طلب کیا وجد صاحب نے پھر ایک نظم بعنوان "عبدالرزاق لاری" سنائی۔

بعد ازاں کرسی صدارت سے تحریک اظہار عقیدت پیش ہوئی جس کو حاضرین نے استادہ ہو کر منظور کیا۔

"طیلسانئین عثمانیہ کی یہ کانفرنس خدام اعلیٰ حضرت بندگان عالی سلطان العلوم مدظلہ العالی کی بارگاہ معارف گستر میں اپنی غیر متزلزل اور مستقل عقیدتمندی اور کامل وفاشعاری کا اظہار کرتی ہے اور ملک کی علمی ترقی اور مقاصد جامعہ عثمانیہ کی تکمیل پر ذات ہمایونی کی جو عمیق اور لازوال شاہانہ توجہ مبذول ہے اس پر یہ کانفرنس اپنی حقیقی سپاس گزاری کا اظہار کرتی ہے۔"

اسی موقع پر نواب مرزا یار جنگ بہادر نے سر تیج بہادر سپرو کو (جو اس زمانے میں حیدر آباد

آئے ہوئے تھے اور جنھیں کانفرنس میں مدعو کیا گیا تھا) پھول پہنائے، اس کے بعد سر سید روفتے مختصراً تنقید فرماتے ہوئے کہا کہ صنعتی تعلیم کی تجویز سے آپ کو پورا اتفاق ہے۔ آپ نے کہا کہ جب تک علم کے ساتھ عمل کی آمیزش نہ ہو نوجوانوں کے تمام جذبات پامال اور ان کی زندگانیاں ناکام ہوں گی۔

ٹھیک بارہ بجے صدر کانفرنس نے جلسہ برخاست کرتے ہوئے نمایش تصانیف کا اعلان کیا جو سٹی کالج ہی میں منعقد ہوئی تھی

اجلاس دوم۔ ۱۵ ر آذر کی دوپہر کو دن کے ٹھیک دو بجے کانفرنس کا دوسرا اجلاس شروع ہوا۔ کرسی صدارت سے حسب ذیل تحریکات پیش و منظور ہوئیں:۔

تحریک نمبر (۲)

"یہ کانفرنس حالیہ بلدی انتخابات میں عثمانیہ بلدی جماعت کو جو شاندار کامیابی حاصل ہوئی اس پر اظہار مسرت کرتی اور ارکان منتخب اور بلدی جماعت سے توقع کرتی ہے کہ آیندہ تین سال میں ان کی حقیقی کارگزاری بھی شاندار رہے گی۔"

تحریک نمبر (۳)

"جدید ہندوستان کے ایک مخلص ماہر تعلیمات ڈاکٹر سر سید راس مسعود، نواب مسعود جنگ مرحوم نے جامعہ عثمانیہ کے قیام و ترقی کے لیے بڑی سرگرمی سے کوشش وسعی کا حق ادا کیا تھا۔ کلیۂ جامعہ عثمانیہ کے ابتدائی دور میں اس کی صدارت کے فرائض بھی انجام دیئے تھے۔ ان کا بے وقت انتقال ملک کے لیے ایک عظیم نقصان ہے۔ یہ کانفرنس ان کے ناگہانی انتقال پر اپنے گہرے رنج و ملال کا اظہار کرتی اور مرحوم کے پسماندگان کو اپنی مخلصانہ ہمدردی کا یقین دلاتی ہے۔"

تحریک نمبر (۴)

"یہ کانفرنس ڈاکٹر احمد عبدالوحید خاں ام۔بی۔بی۔ایس اور شیخ چاند ام۔اے کے عالم شباب میں انتقال پر گہرے افسوس کا اظہار کرتی ہے اور ان کے پسماندگان کو اپنی حقیقی ہمدردی کا یقین دلاتی ہے۔"

اس کے بعد سید ابوالفضل صاحب بی۔ اے۔ یل۔ یل۔ بی (عثمانیہ) نے اپنا مقالہ بعنوان "سلطان العلوم اور ان کے اسلاف کے علمی کارنامے" سنایا۔ آپ نے حضرت آصفجاہ اول، فیروزجنگ اور آصفجاہ ثانی کے عہد کی علمی ترقی پر روشنی ڈالتے ہوئے عصر حاضر کی ترقیات کا مناسب تذکرہ کیا۔

اس کے بعد عبدالقادر صاحب جیلانی نے پانچویں تحریک پیش کی:۔

"یہ کانفرنس اس امر کو ضروری خیال کرتی ہے کہ طلباء کو جامعہ عثمانیہ میں ام۔ اے اور یل۔یل۔بی کے ایک ساتھ مکمل کرنے کی اجازت دی جائے جیسا کہ اوائل دور میں طریقہ تھا۔"

محرک نے کہا کہ بڑی خوش نصیبی ہوگی کہ کم سے کم مدت میں جامعہ کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کی جائیں۔ بلحاظ قابلیت طلباء میں اس کی صلاحیت موجود ہے لیکن عدم استطاعت کے باعث وہ صرف ام۔ اے یا صرف یل۔یل۔بی ہی کی ڈگری پر اکتفا کرتے ہیں اگر ایک ساتھ تکمیل کا موقع ملے تو مناسب ہوگا۔

مسٹر بی۔ این چوبے نے تائید کی اور کہا کہ ابتدائی دور میں یہ سہولت مہیا کی گئی تھی اور بظاہر کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ کیوں ایک ساتھ دو ڈگریوں کے حاصل کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔

غلام محمد خاں صاحب ام۔ اے نے مخالفت کی۔ آپ نے یہ باور کرایا کہ موجودہ معیار مقابلۃً بلند ہے ام۔ اے کی تعلیم کو باضابطہ طور پر انجام دینے کے بعد یل۔یل۔بی کو بھی ساتھ ہی مکمل نہیں بنایا جاسکتا۔ چوبے صاحب نے علیگڈھ کی مثال دی ہے لیکن وہاں ام اے کے امتحانوں میں مقالے نہیں لکھائے جاتے اس لیے اس تحریک کو منظور کرنے کے معنی معیار تعلیم کو کم کرنا ہے۔

صاحبزادہ میر وزیر علی خاں صاحب بی۔ اے نے بھی مخالفت کی۔

محمد داور حسن صاحب بی۔ اے۔ یل۔یل۔بی نے بھی مخالفت کی اور کہا کہ ام اے کے طلباء کو بلند تر پرواز کے لیے زیادہ مہلت اور یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے ام۔ اے اور یل۔یل۔بی کے درس ایک ساتھ حاصل کرنے سے خیالات کی تحدید اور علوم کی تحقیقات میں رکاوٹ ہوگی۔

تحریک بغلبۂ آراء نامنظور ہوئی۔

محمد فاروق صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) ایچ۔ سی۔ ایس نے "مجلس بلدیہ" کے موضوع پر ایک مقالہ سنایا۔

اس مقالہ میں ہندوستان کے دوسرے مجالس بلدیہ کا حیدرآباد کی مجلس بلدیہ سے تقابل کیا گیا تھا۔ مقالہ کارآمد معلومات پر مشتمل تھا۔

محمد فاروق صاحب کا مقالہ ختم ہونے پر صاحبزادہ میر وزیر علی خاں صاحب بی۔ اے نے چھٹی تحریک پیش کی جو حسب ذیل ہے:۔

"یہ کانفرنس اس امر کو ضروری خیال کرتی ہے کہ ملک میں صنعت و حرفت کی ترقی اور اس کی تنظیم کی تجاویز پر غور کرنے کے لیے ایک کمیشن کا تقرر عمل میں لایا جائے۔"

محرک نے کہا کہ ملک کی عام ترقی کے پیش نظر ضروری ہے کہ صنعت و حرفت کو فروغ دیا جائے۔ اسی پر ملک کی ترقی کا دارومدار ہے اس لیے جملہ مواقع سے مستفید ہونے کے لیے ایک اسکیم پیش ہو اور اس مقصد کے لیے ایک کمیشن قایم کیا جائے۔

مسٹر بی ۔ین چوبے نے تائید کی۔ احمد عبداللہ صاحب مسدوسی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی نے مزید تائید کی۔

محمد داور حسین صاحب نے ترمیم پیش کی کہ "صنعت و حرفت" کے الفاظ کی بجائے "ممکنہ معاشی ذرایع کی تحقیق و ترقی و تنظیم" کے الفاظ قایم کیے جائیں۔ بالآخر تحریک مرمہ صورت میں منظور ہوئی کہ "یہ کانفرنس سرکار عالی سے درخواست کرتی ہے کہ ملک میں ممکنہ معاشی ذرایع کی تحقیق و ترقی اور تنظیم کی تجاویز پر غور کرنے کے لیے سرکاری و غیر سرکاری ارکین پر مشتمل ایک کمیشن کا تقرر عمل میں لائے۔"

اس تحریک کے بعد غلام دستگیر صاحب رشید ام۔ اے (عثمانیہ) نے اپنا مقالہ بعنوان "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" سنایا جو اقبال کی مثنوی پر ادبی تبصرہ ہے۔ مقالہ کا عنوان اس مثنوی کا ایک مصرعہ ہے۔ ۴ ر ۲۵ منٹ پر آپ کے مقالہ کے ختم پر جلسہ برخاست ہوا۔

۱۶ ر آذر روز پنجشنبہ ۱۰ ر ۱۰ منٹ پر کانفرنس کا تیسرا اجلاس عبدالقادر صاحب جیلانی بی۔ اے کے مقالہ سے شروع ہوا جس کا عنوان "دیہات سدھار اور عثمانیین کے فرایض" تھا۔

مرزا شکور بیگ صاحب بی۔ اے۔ ال ال۔ بی نے حسب ذیل ساتویں تحریک پیش کی۔

"اس کانفرنس کی رائے میں اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ اہل ملک کو بذریعہ قانون

ترک مسکرات کا پابند بنایا جائے۔"

محرک نے کہا کہ خطبۂ صدارت میں اس امر پر کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے لیکن اس پر زور دینے کے لیے اس کو کانفرنس میں پیش کیا جا رہا ہے تاکہ عملی صورت جلد حاصل ہو سکے۔ امریکہ میں شراب نوشی جزو زندگی ہے اس لیے وہاں کوششیں ناکام رہیں۔ چونکہ یہ ایک مسلمہ خرابی ہے اس لیے قانون کے ذریعہ جرم قرار دینا ناگزیر ہے۔

شنکر جی صاحب بی۔ اے نے اس کی تائید کی اور کہا کہ یہاں مدراس سسٹم رائج ہے ہماری حکومت ایک مرتبہ مدراس کے طریقۂ عمل کو بہترین سمجھ کر رائج کر چکی ہے تو اب مدراس ہی کی پالیسی پر اس کو ترک کرنے کے لیے قانون وضع کرے۔

داور حسین صاحب نے ترمیم پیش کی کہ تحریک کے الفاظ حسب ذیل ہوں: "اس کانفرنس کی رائے میں اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ حکومت سرکار عالی امتناع مسکرات کے لیے قانون وضع کرے۔"

سید محمد اکبر صاحب وفا قانی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی نے تحریک کی مخالفت کی اور کہا کہ انسانی فطرت یہ ہے کہ موانعات حائل ہوں تو شوق بڑھتا جاتا ہے۔ امریکہ میں ناکامی کا جو سبب ہے وہی ہندوستان اور حیدرآباد میں بھی ہے۔ مقام کے فرق سے انسان کی فطرت میں فرق نہیں ہوتا۔ بلاشبہ مدراس میں یہ سعی کی جا رہی ہے کہ مسکرات کو ترک کرا دیا جائے لیکن اس کا عملی نتیجہ ہمارے آگے موجود نہیں ہے۔

عبدالسلام صاحب ذکی نے مزید مخالفت کی۔

مرزا شکور بیگ صاحب نے دوبارہ اس پر بحث کی اور کہا کہ اس وقت کوئی قانون وضع نہیں ہو رہا ہے کہ اس کے وضع کرنے کے بعد اس کی تعمیل کے طریقوں پر غور کیا جائے۔ اگر حکومت یہ منظور کر لے کہ عوام کو ترک مسکرات کا پابند کرایا جائے تو اس کے لیے قانون وضع کرنے وقت اس امر پر بھی غور کرے گی کہ اس کے روبہ عمل لانے کے لیے کیا ذرایع ہیں۔

تحریک مرمیمہ صورت میں بغلبۂ آرا منظور ہوئی۔

آٹھویں تحریک محمد عبدالرؤف صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی نے پیش کی کہ:-

اُس کانفرنس کی رائے میں یہ امر مناسب ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے سپوتوں کی علمی و ادبی کوششوں کو ایک ہی مرکز پر جمع کیا جائے تاکہ مقاصد کی کامیابی زیادہ یقینی ہو جائے۔"

غلام دستگیر صاحب رشید نے اس کی تائید کی۔

نندا پورکر صاحب نے تحریک کی تائید کی۔ عبدالسلام صاحب ذکی نے ترمیم پیش کی کہ جامعہ عثمانیہ کے سپوتوں کی بجائے "اراکین انجمن طیلسانئین" رکھا جائے۔ محمد علی صاحب ایم۔اے اور عبداللہ صاحب سدوسی نے علی الترتیب ترمیمات پیش کیں کہ ایک ہی مرکز کی بجائے ایک ہی "نقطہ اتحاد پیدا کیا جائے" "ایک ایسا مرکزی ادارہ قایم کیا جائے کہ جس کے ساتھ جامعہ عثمانیہ کے سپوتوں کی علمی و ادبی کوششوں کا الحاق ہو سکے۔"

بالآخر حسب ذیل مرمہ شکل میں یہ تحریک بہ اتفاق آرا منظور ہوئی۔

اُس کانفرنس کی رائے میں یہ امر مناسب ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے سپوتوں کی منتشر علمی و ادبی کوششوں کو ایک ہی مرکز پر جمع کیا جائے تاکہ مقاصد کی کامیابی زیادہ یقینی ہو جائے اور اس غرض کی تکمیل کے لیے انجمن طیلسانئین عثمانیہ کے سپرد یہ کام کیا جائے۔

اس کے بعد ڈاکٹر محی الدین صاحب قادری زور نے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا اور کہا کہ اعلی تعلیم تربیت اور معاشری سہولتوں کے باوجود وہ باتیں پیدا نہیں ہوتیں جو اس ماحول میں ہونی چاہئیں۔ ایک عرصہ سے مرکزیت کے قیام کی کوشش ہوتی رہی۔ سات سال قبل حیدرآباد اکاڈمی قایم کر کے جامعہ عثمانیہ کے علاوہ دیگر جامعات کے اعلی تعلیم یافتہ اصحاب کو مدعو کیا گیا تھا اس کے مقاصد کا اہم جز یہ تھا کہ علمی یگانگت پیدا کی جائے۔ لیکن ایک طرف شخصی اختلافات اور دوسری طرف بعض لوگوں کے شبہات کہ یہ جماعت سیاسی ہے، اس قسم کے اجتماعی اداروں کو ناکام بناتے ہیں۔ یہ ایک عرصہ قبل کا واقعہ ہے لیکن اب حالات موافق ہیں اس لیے ایک مرکزی ادارہ قایم ہونا چاہیئے۔

اس کے بعد جمیل احمد صاحب برنی بی۔اے نے اپنا مقالہ بہ عنوان "ہماری معاشرت میں خواتین کا حصہ" سنایا جس کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

اجلاس چہارم۔ ۲ ر ۴۰ منٹ پر چوتھا اجلاس شروع ہوا محمد غوث صاحب ایم۔اے نے تحریک نمبر (۹) پیش کی جو حسب ذیل ہے:۔

"اُس کانفرنس کی رائے میں یہ امر ضروری ہے کہ جامعہ عثمانیہ میں تلنگی، مرہٹی اور کنڑی کی پروفیسریاں قایم کی جائیں۔"

صاحبزادہ میر وزیر علی خاں صاحب نے اس کی تائید کی۔ سید محمد اکبر وفاقانی صاحب نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ تحریک کے الفاظ سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ بحالت موجودہ ان زبانوں کی تعلیم کا انتظام نہیں ہے۔ محمد فاروق صاحب نے مزید مخالفت کی اور خطبۂ صدارت کے حوالے سے کہا کہ نہ صرف اخراجات کی کفایت ہونی چاہیئے بلکہ ہر جامعہ چند شعبہ ہائے علوم کو مخصوص کر لے تاکہ دنیا بھر میں اس کے لیے خصوصیت حاصل ہو جائے۔ طلبا ان زبانوں کی جانب راغب نہیں ہوتے اس لیے کہ آج کل ان کی طلب نہیں ہے۔ میر احمد علی خاں صاحب ام۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی نے کہا کہ محمد فاروق صاحب نے خطبۂ صدارت کی غلط توضیح کی۔ وہاں کفایت کا مطلب یہ ہے کہ جو رقم صرف ہو رہی ہے وہ جائز طور پر صرف ہو۔ نہ کہ علوم کی اشاعت میں اس کفایت کی پالیسی سے رکاوٹ پیدا کی جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو تعلیم کی تحدید پر جو رکاوٹ عائد کی گئی ہے اس کے خلاف احتجاج نہ کیا جاتا۔ داور حسین صاحب کی مزید تائید کے بعد عبدالقادر صاحب جیلانی نے مخالفت کی اور کہا کہ جامعہ عثمانیہ میں ان زبانوں کی تعلیم کا بخوبی اہتمام کیا گیا ہے اس لیے کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ پروفیسریاں قایم کی جائیں۔ غلام محمد خاں صاحب نے تحریک کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ ام۔ اے کی جماعتیں کھولی جائیں۔ ڈاکٹر سید حسین صاحب پروفیسر نے ترمیم پیش کی کہ تحریک کے آخر میں یہ الفاظ بڑھائے جائیں کہ "پبلک سے اپیل کی جائے کہ وہ ان زبانوں کی تعلیم سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے۔" بالآخر یہ تحریک یوں منظور ہوئی کہ "اس کانفرنس کی رائے میں جامعہ عثمانیہ میں تلنگی، کنڑی اور مرہٹی میں ام۔ اے کا درجہ کھولا جائے اور پبلک سے اپیل کی جائے کہ وہ ان زبانوں کی تعلیم سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے۔"

بعد ازاں غوث محمد صاحب صدیقی بی۔ اے۔ ڈپ ایڈ نے اپنا مقالہ بعنوان "عہد حاضر میں تعلیمی رجحانات" سنایا۔ یہ ایک مبسوط مقالہ تھا۔

تحریک نمبر ۔۔۔ کو محمد غوث صاحب ام۔ اے نے پیش کیا اور شنکر جی صاحب نے تائید کی۔ کسی بحث کے بغیر یہ اتفاق آرا منظور ہوئی جو حسب ذیل ہے:۔

اُس کانفرنس کی رائے میں اب وقت آگیا ہے کہ جامعہ عثمانیہ میں مابعد ایم۔اے ریسرچ پر ڈگری عطا کی جائے۔ کانفرنس کو پوری توقع ہے کہ جلد اس جانب جامعہ اپنی توجہ مبذول کرے گی۔"

تحریک نمبر (۱۱) کو سید محمد اکبر وفاقانی صاحب نے پیش کیا جس پر گرم بحث ہوئی۔ محمد فاروق صاحب نے مخالفت میں بحث کی۔ محمد عبدالرؤف صاحب اور داور حسین صاحب کی تائید کے بعد بہ اتفاق آرا یہ تحریک منظور ہوئی:۔

"یہ کانفرنس محسوس کرتی ہے کہ محکمۂ بلدیہ نے ایک مخصوص کمپنی کو شہر حیدرآباد کے تشہیری وسائل کا جو ٹھیکہ دے دیا ہے اس کی وجہ سے ملکی صنعت کی ترقی میں سخت رکاوٹیں پیدا ہوگئی ہیں۔ یہ کانفرنس حکامِ متعلقہ سے اس امر کا مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اس قسم کے ٹھیکہ کے طریقہ کو ملکی مفاد کے پیش نظر فوراً مسدود فرمادے۔"

تحریک نمبر (۱۲) کو محمد غوث صاحب نے پیش کیا۔ شنکرجی صاحب نے تائید کی۔ تحریک یہ تھی کہ:۔

"اُس کانفرنس کی رائے میں یہ امر مناسب ہے کہ جامعہ عثمانیہ میں جو تقررات عمل میں لائے جاتے ہیں ان کے متعلق مستقل قواعد ترتیب دیئے جائیں۔"

ڈاکٹر سید حسین صاحب نے ترمیم پیش کرتے ہوئے تحریک کو حسب ذیل صورت میں پیش کیا:۔

"اُس کانفرنس کی رائے میں یہ امر مناسب ہے کہ جامعہ عثمانیہ اور دیگر محکموں میں جو تقررات عمل میں لائے جائیں اس کے متعلق مستقل قواعد ترتیب دیئے جائیں اور اس امر کا لحاظ رکھا جائے کہ جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل طلبا کو ہمیشہ ترجیح حاصل رہے۔" محرک نے اس کو قبول کرلیا اور تحریک منظور ہوئی۔ صدر کانفرنس کی اختتامی تقریر اور معتمد کے شکریہ و دعا کے بعد کانفرنس کے اجلاس شام کے پانچ بجے بخیر و خوبی ختم ہوئے۔

۷ ارآذر روز جمعہ شب کے آٹھ بجے بمقام سٹی کالج بتقریب کانفرنس ڈنر ترتیب دیا گیا تھا۔ مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب سابق صدر جامعہ نے اعلیٰحضرت بندگان عالی کا، کلیم الدین صاحب انصاری نے جامعہ کا اور محمد بن عمر صاحب نے طیلسانئین کا جام صحت تجویز کیا جس کے بعد سید ریاض الحسن صاحب ہاشمی نے حاضرین کا اور مولوی سید محمد اعظم صاحب

پرنسپل سٹی کالج کا (جن کی ہمدردی کے باعث کانفرنس کے انعقاد میں سہولت واقع ہوئی) شکریہ ادا کیا۔

۱۸؍آذر روز ہفتہ شب کے ساڑھے آٹھ بجے لاسلکی نشرگاہ سرکار عالی سے طیلسانئین کا مرتب کردہ ایک پروگرام نشر کیا گیا جو عام طور پر پسند کیا گیا۔ وہ یہ تھا:۔

۱۔ تعارفی تقریر صاحبزادہ میکش ۲۔ تقریر انجمن طیلسانئین

نظمیں۔ وجد۔ ساز۔ مخدوم۔ اعجاز

تقاریر۔ ج نقوی صاحبہ بی۔اے (عثمانیہ) و لطیف النساء بیگم صاحبہ بی۔اے (عثمانیہ)

تنقید و تبصرہ

تجرباتِ تعلیم تالیف مولوی حبیب احمد صاحب فاروقی بی اے، ڈپ ایڈ (عثمانیہ) پونیا تقطیع ضخامت (۲۰۴) صفحے قیمت (عہ) ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ مصطفےٰ بازار، عابد روڈ حیدر آباد دکن۔

تجرباتِ تعلیم فن تعلیمیات کا ایک نہایت دلچسپ اور نیا موضوع ہے۔ خود انگریزی زبان میں بھی اس موضوع پر بہت زیادہ ادب نہیں ہے۔ اُردو تو اس سے بالکل خالی تھی مولوی حبیب احمد صاحب نے اُردو میں سب سے پہلے اس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے، اور بہت محنت اور سلیقے سے یہ کتاب تالیف کی ہے۔ تعلیم کا مسئلہ روز بروز اہمیت حاصل کرتا جا رہا ہے اور ترقیٔ تعلیم کے ساتھ ساتھ مسئلۂ تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر کارآمد اور مفید کتابوں کی ضرورت بھی بہت شد و مد سے محسوس کی جا رہی ہے۔ جیسا کہ مولوی سجاد مرزا صاحب پرنسپل کلیۂ تعلیم المعلمین نے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے:۔ "فاروقی صاحب نے اس کتاب کی بروقت تالیف سے اُردو داں اشخاص اور بالخصوص مدرسین پر احسان کیا ہے"۔ لائق مولف نے شروع میں تجرباتِ تعلیم کی ابتداء پر روشنی ڈالتے ہوئے اس موضوع کے مختلف اجزا تعلیمی امداد و شمار، ذہنی آزمایشات، امتحان، درسی آزمایشات، قوانین اکتساب اور انفرادی تفرقات پر سیر حاصل فنی بحث کی ہے، اور آخر میں حوالے کی کتابوں کے نام اور تعلیمی اصطلاحوں کی جو حال میں اُردو ادب میں رائج ہوئی ہیں، فرہنگ بھی دی ہے۔ اگرچہ یہ ایک فنی کتاب ہے

لیکن طرزِ بیان میں کوئی الجھن اور پیچیدگی نہیں، بلکہ اکثر و بیشتر مطالب صاف اور سلیس پیرائے میں پیش کیے گئے ہیں۔ اصطلاحات بھی جو استعمال کی گئی ہیں ممکنہ حد تک سلیس ہیں۔ دو تین اصطلاحیں لایق مولف کے قابل توجہ ہیں، جیسے اسٹاٹسٹکس کے لیے اعداد و شمار کی بجائے شماریات، اور اسٹاٹسٹکل میتھڈ کے لیے اعداد شماری طریقے کی بجائے شمارِیاتی طریقہ۔ ریڈنگ کے لیے قراءت برا نہیں، لیکن خواندگی شاید زیادہ سلیس ہو۔ بی ہے ویر کے لیے کردار کی بجائے برتاؤ زیادہ سلیس ہونے کے علاوہ یہ اس وجہ سے بھی بہتر ہے کہ کردار کا لفظ کیا رکٹر کے لیے ایک مسلمہ اصطلاح کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ مدرسوں کے لیے یہ کتاب ہر آئینہ قابلِ مطالعہ ہے۔ طباعت اور کتابت بھی نہایت اچھی ہے۔

مبادیاتِ کشافہ | تالیف مولوی علی موسیٰ رضا صاحب مہاجر بی اے (عثمانیہ) مددگار کمشنر بوائے اسکاوٹس۔ کراؤن تقطیع ضخامت (۲۴۰) صفحے قیمت (عمار) ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ مصطفےٰ بازار حیدر آباد دکن۔

کشافی، یا جیسا کہ مولف کتاب نے لکھا ہے "کشافہ" (اسکاوٹنگ) ایک جدید تعلیمی تحریک ہے جو جنگِ عظیم کے بعد شروع ہوئی اور اپنی بہت سی دلکشیوں کی وجہ سے ہندوستان کے مدرسوں میں بڑی تیزی سے رائج ہو گئی ہے۔ اس تحریک میں کھیلوں اور دوسری تفریحوں کے ساتھ ساتھ جسمانی اور اخلاقی تربیت کے جو پہلو شریک ہیں اس کی وجہ سے یہ تحریک نہایت ہی کارآمد اور لایق اجرا ہے۔ ریاست حیدر آباد میں بھی کم و بیش تمام سرکاری مدرسوں اور بعض امدادی مدرسوں میں بھی اس تحریک کو مقبولیت حاصل ہے اور سرکارِ عالی نے اس کی تنظیم و ترویج کے لیے سررشتۂ تعلیمات کے تحت ایک جداگانہ محکمہ بھی قایم فرما دیا ہے۔ حالیہ ترقیوں اور ملکی ضروریات کے مدنظر ہندوستان کے بعض صوبوں نے اس تحریک میں حسبِ ضرورت اصلاحیں اور اضافے کر کے اس کو بالکل اپنا لیا ہے جس سے اس کا فائدہ اور بھی بڑھ گیا ہے۔ اب اس موضوع پر اردو میں تصنیف و تالیف کا بھی بعض حضرات کو خیال پیدا ہوا اور چند متفرق رسالے شایع بھی ہوئے لیکن پیشِ نظر کتاب اس موضوع پر ایک بسوط اور حاوی تالیف ہے، لایق مولف نے جو بارہ سال سے کشافی کا علمی اور

تنظیمی تجربہ رکھتے ہیں، بہت محنت اور کاوش سے اس کو ترتیب دیا ہے اور کشافوں کے لیے ہر طرح کارآمد بنانے کی کوشش کی ہے۔ اکثر حرکات، اعمال اور اشیا کی وضاحت کے لیے تصویریں بھی دی ہیں۔ اس تحریک کی بہت سی اصطلاحات کا اردو ترجمہ استعمال کیا ہے اور کئی اصطلاحات جو اُردو میں کافی رواج رکھنے کی وجہ سے لائق ترجمہ نہیں ہیں، انھیں جوں کا توں انگریزی ہی رہنے دیا ہے۔ اگر آخر میں اُردو اصطلاحوں کی فرہنگ بھی ہوتی تو بہتر تھا۔ ہماری رائے میں اسکاوٹنگ کے لیے کشافہ محل نظر اور قابل توجہ ہے۔ اگرچہ یہ اصطلاح آج کل استعمال کی جا رہی ہے، لیکن وضع اصطلاحات کے اردو زبان میں جو مروجہ طریقے ہیں ان کے مدنظر اس کی بجائے کشافی کا لفظ زیادہ صحیح اور سلیس ہوگا۔

قانون بین الممالک کے اصول اور نظیریں

تالیف جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب ایم اے، ایل ایل بی (عثمانیہ) ڈی فل، ڈی لٹ (بون) لکچرار قانون جامعہ عثمانیہ۔ اردو تقطیع ضخامت (۲۰۸) صفحے قیمت عہ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ مصطفیٰ بازار حیدرآباد

اگرچہ اُردو میں عام قوانین اُن کی شرحوں اور نظائر عدالت کے مجموعے بہت شائع ہوتے رہتے ہیں لیکن بین الاقوامی قانون ایک بالکل نیا موضوع ہے جس کو اُردو میں سب سے پہلے جامعہ عثمانیہ کے ایک ہونہار سپوت اور اس کے شعبۂ قانون کے لائق لکچرار ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے روشناس کرایا ہے۔ فاضل مولف نے ابتدا میں بین الاقوامی قانون کی تاریخ، اس کے مقاصد وغیرہ پر بہت دلچسپ اور پُر از معلومات بحث کی ہے۔ اس کے بعد بین الاقوامی تعلقات کی مختلف صورتوں مسالمانہ (دوستانہ) مخاصمانہ اور غیر جانبدارانہ پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اگرچہ فاضل مولف نے دیباچے میں اعتذار کیا ہے کہ تھوڑی سی مدت میں انھوں نے جامعہ عثمانیہ کے طلبۂ قانون کے آگے جو لکچر اس موضوع پر دیے تھے انھی کو قلمبند کر کے یہ چھوٹا سا رسالہ طلبا کی امتحانی ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر مرتب کیا گیا ہے لیکن باوجود اس کے یہ کتاب بہت اعلیٰ اور عام مطالعے کے لیے بھی نہایت مفید ہے۔ اس کے مختلف حصے اور خصوصاً پہلا باب جس میں تاریخی امور پر روشنی ڈالی گئی ہے مولف کے وسیع مطالعے کا نتیجہ ہے۔

کتاب کے شروع میں املا اور اعراب کے عنوان سے جرمن، فرانسیسی، اطالوی اور انگریزی کے بعض مخصوص تلفظوں کو صحیح اور اصلی طور پر اُردو میں ادا کرنے کے لیے چند جدید اعراب اور اشارے بھی تجویز کیے گئے ہیں اور پوری کتاب پر جہاں اس قسم کے الفاظ آئے ہیں، ان اعراب اور اشاروں کو بڑی توجہ کے ساتھ استعمال کرکے پڑھنے میں سہولتیں پیدا کی گئی ہیں! اس کتاب میں ایک اور جدت یہ کی گئی ہے کہ بعض الفاظ کو جن کا تلفظ الگ اور املا الگ ہے، پڑھنے والوں کی سہولت کی خاطر اس طرح لکھا گیا ہے کہ ان کا املا تلفظ کے مطابق ہو گیا ہے جیسے علا حدگی، دعوا، لہازا وغیرہ۔ اگرچہ یہ مروجہ املا کے خلاف ہیں لیکن اُردو تحریر کی اصلاح و ترقی کے مدنظر لایق توجہ اور قابل حوصلہ افزائی ہیں۔

مسعود نمبر رسالۂ اُردو انجمن ترقیٔ اُردو اورنگ آباد قیمت (عمار)

نواب مسعود جنگ مرحوم کی یادگار میں جو انجمن ترقیٔ اُردو کے صدر نشین اور اس کے بہت بڑے سرپرست تھے، مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اُردو نے اپنے رسالۂ اُردو کا جنوری نمبر نہایت اہتمام سے مسعود نمبر کے نام سے شایع کیا ہے۔ اس میں نواب صاحب مرحوم کے بہت سے انگریز دوستوں اور بعض مستشرقوں کے تعزیتی بیانات، بعض پُر درد نظمیں اور کئی پُر از معلومات مقالے شامل ہیں۔

نواب صاحب مرحوم نہ صرف مسلمانوں کے بلکہ سارے ہندوستان کے ایک بڑے ماہر تعلیم اور دردمند قومی کارکن تھے۔ انھوں نے جامعہ اسلامیہ علی گڑھ کی اس نازک موقع پر جبکہ اس کا وقار معرض خطر میں پڑ گیا تھا، اپنی قابلیت اور جوش عمل سے جو خدمت انجام دی اور اس عظیم قومی درسگاہ کو اس کی سابقہ عظمت دوبارہ دلانے کے لیے جو انتھک کوشش کی وہ بجائے خود ان کا ایسا کارنامہ ہے جو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اُردو زبان کے ساتھ انھیں جو گہری دلچسپی اور ہمدردی تھی وہ انجمن ترقی اُردو کی ترقی اور اس کے دائرۂ عمل کی روز افزوں وسعت سے ظاہر ہے۔ انھوں نے تن، من، دھن سے انجمن کی فلاح و فوز کے لیے کام کیا اور حق یہ ہے کہ بہت کیا! اور معتمد انجمن ترقی اُردو قابل شکریہ ہیں کہ انھوں نے اُردو کے اس قابل فخر محسن کی یادگار قایم فرمائی۔

حیدرآباد انجینرنگ گزٹ ہفتہ وار، زیر ادارت مولوی میر نظام الدین حسین خاں صاحب شمسی۔ روبکاری تقطیع، چندہ سالانہ عام (ﷲ)، طلبہ وغیرہ سے رعایتی (ﷲ)۔ دفتر گزٹ واقع گول بنگلہ افضل گنج۔

حیدرآباد میں تعمیری اور انجینری کاروبار کی روزافزوں ترقی کے مدنظر اس گزٹ کی برموقع اجرائی کے لیے جناب شمسی صاحب قابل مبارکباد ہیں۔ اس کا پانچواں نمبر جو ہمارے پیش نظر ہے ایک خصوصی اشاعت ہے جس میں متعدد تصاویر، کئی دلچسپ مقالے اور بہت سی کارآمد معلومات درج ہیں خصوصاً نظام ساگر کی تعمیر اور اس سے آب پاشی کی سہولتوں کے متعلق بہت ہی مفید مضمون لکھا گیا ہے۔ انگریزی مضامین کا حصہ بھی بہت ہی اچھا ہے۔ اس دفعہ حیدرآباد میں کل ہندروڈ کانگریس اور ادارہ مہندسین ہند (انسٹی ٹیوشن آف انجینرز انڈیا) کے اٹھارویں سالانہ اجلاس کے انعقاد کے موقع پر یہ خصوصی اشاعت عمل میں لائی گئی ہے جو اردو میں اپنی نوعیت کی ایک ہی چیز ہے۔ سرورق بھی بہت ہی دلکش اور کئی رنگی ہے۔ اس گزٹ سے نہ صرف تعمیرات اور آب پاشی سے تعلق رکھنے والے اصحاب ہی استفادہ حاصل کرسکتے ہیں، بلکہ عام پبلک کو بھی اس کی سرپرستی کرنی چاہیئے۔

تبسم پارے از ح ب ی ب قیمت ۲؎، ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ مصطفے بازار و مکتبہ علمیہ چار مینار حیدرآباد۔ یہ تین مزاحیہ مضامین کا مختصر مجموعہ ہے جو مجموعی حیثیت سے اپنی اپنی جگہ کافی دلچسپ اور مصنف کی خوش مذاقی کے آئینہ دار ہیں لیکن یہ مختصر ترین مجموعہ بھی "مقدمہ" کی گراں باری سے سبکدوش نہیں، شاید یہ بھی مزاح کی کوئی لطیف قسم ہے، تاہم مقدمہ نویسی کے روزافزوں خبط کی نسبت فاضل مقدمہ نگار مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب رقمطراز ہیں کہ:۔

"ایک بڑے مقنن کا قول ہے کہ دنیا میں جتنا قانون پھیلتا ہے اتنی ہی مقدمہ بازی بڑھتی ہے اگر یہ مقولہ صحیح ہے تو میری یہ رائے بھی غلط نہیں ہوسکتی کہ جتنی تصنیف بڑھتی ہے مقدمہ نویسی میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مقدمہ کیا بلا ہے۔ اگر کوئی کتاب بری ہے تو کوئی مقدمہ اس کو اچھا نہیں کرسکتا، اور اگر اچھی ہے تو اس کو مقدمے کی ضرورت نہیں کسی نے سچ کہا ہے کہ:۔

ع حاجت مشاطہ نیست روئے دلارام را"

ہمارے خیال میں یہ گراں قدر رائے اس قابل ہے کہ ہماری زبان کے مصنفین اور مولفین اس پر اپنے فرصت کے لمحات میں غور فرمائیں۔ س م ح

آخری رسول از جناب ابو القا دری صاحب۔ قیمت (۱/۸) ملنے کا پتہ، مکتبۂ علمیہ چار مینار و دیگر کتب فروش حیدرآباد۔

یہ آنحضرت صلعم کی پاکیزہ سیرت، فقید المثال کردار، غزوات بدر و احد اور دیگر اہم واقعات کا تذکرہ ہے جو نہایت ایجاز و اختصار کے ساتھ مسلمان عورتوں اور بچوں کو مادہ پرست مغرب کے زہریلے تاثرات سے محفوظ و مصئون رکھنے کے لیے عام فہم زبان میں لکھا گیا ہے۔ مضمون جانے کو نہایت اچھا ہے۔ ابو البیان خواجہ بہاء الدین صاحب نے اس کتاب کو شایع کر کے خدمت اسلام کی ایک اچھی مثال قایم کی ہے۔ س م ح

برہان مآثر ناشر مجلس مخطوطات فارسیہ حیدرآباد دکن۔ دوہری ڈمی تقطیع ضخامت (۶۳۲) صفحے۔ قیمت (۶ روپے) ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ مصطفیٰ بازار حیدرآباد دکن۔

مجلس مخطوطات فارسیہ جو دولت آصفیہ دام اقبالہا کی علم نوازی سے فارسی ادب اور خاص طور پر دکن کی تاریخی کتابیں جو فارسی زبان میں ہیں ان کے شایع کرنے کے لیے عالیجناب آنریبل نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر کے زیر صدارت قایم اور مصروف عمل ہے یہ کتاب اسی مجلس کے سلسلۂ مطبوعات کی دوسری کڑی ہے دکن کی ایک بہت ہی قدیم و معتبر و مکمل تاریخ ہے مشہور تاریخ فرشتہ کی تصنیف سے قبل ۱۰۰۰ھ میں جبکہ حیدرآباد آباد کیا گیا ہے لکھی گئی ہے اور فرشتہ کے برخلاف اس کے مصنف علی بن عزیز اللہ نے صرف سلاطین دکن کے حالات لکھے ہیں۔ مجلس نے اس کار آمد کتاب کی اشاعت سے تاریخی ادب میں ایک نہایت بیش قیمت اضافہ کیا ہے جس کے لیے وہ اہل علم کی شکریے کی مستحق ہے۔ کتاب کے مقابلے اور صحت میں بھی بہت ہی اہتمام کیا گیا ہے۔ پوری کتاب جامعہ ملیہ کے جرمن ٹایپ میں چھپی ہے اور طباعت کی خوبی کے لیے معتمد مجلس نے مطبع مذکور کی تحسین بھی کی ہے لیکن ٹایپ بہت ہی خراب اور غیر مقبول ہے پڑھنے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے اگر یہ کتاب اس کی بجائے لیتھو اور نستعلیق خط میں شایع کی جاتی تو اس کا افادہ بہت زیادہ ہو سکتا تھا۔ خود ادارہ جامعہ ملیہ اپنی مطبوعات کے لیے یہ ٹایپ استعمال نہیں کرتا اور انجمن ترقی اردو اپنی علمی کتابیں ٹایپ میں شایع کرتی ہے تو تعجب ہے کہ مجلس مخطوطات فارسیہ نے کیوں خواہ مخواہ اس تکلیف دہ ٹایپ کو پسند کیا۔ اس کی طباعت بھی گراں پڑتی ہے اور اسی کی وجہ سے اس کتاب کی قیمت بھی مطبوعات دار الترجمہ کی طرح بہت زیادہ رکھی گئی ہے۔

عثمانین کی کتابیں

۱۔ پروفیسر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

۱۔ اردو شہ پارے جلد اول ....
۲۔ روح تنقید ....
۳۔ تنقیدی مقالات ....
۴۔ اردو کے اسالیب بیان ....
۵۔ ہندستانی لسانیات ۱ال
۶۔ تین شاعر (میر تقی میر، میر حسن اور میر انیس) ....
۷۔ دیوان زادہ حاتم ....
۸۔ تازیانہ (ایک معاشرتی قصہ) ....
۹۔ طلسم تقدیر (حیدرآباد سے متعلق ایک تاریخی قصہ) ....
۱۰۔ گارساں تاسی .... مجلد
۱۱۔ گلزار ابراہیم .... مجلد
۱۲۔ محمود غزنوی کی بزم ادب ۱ار
۱۳۔ فن انشا پردازی ....
۱۴۔ عہد عثمانی میں اردو کی ترقی ....
۱۵۔ کیفیت سخن (کلام کیفی حیدرآبادی) ... ۱۲۰۰ار
۱۶۔ متاع سخن (کلام نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز) ۱۲ار
۱۷۔ [illegible] سخن (کلام ڈاکٹر احمد حسین مائل) ... ۱۲۰۰ار
۱۸۔ مرقع سخن جلد اول و دوم فی جلد
۱۹۔ سیر گولکنڈہ ۱۵ار
۲۰۔ گولکنڈے کے ہیرے جلد ۱۲ار

۲۔ پروفیسر عبدالقادر سروری

۱۔ دنیائے افسانہ ....
۲۔ کردار اور افسانہ ....
۳۔ جدید اردو شاعری جلد ....
۴۔ حیدرآباد کی تعلیمی ترقی ....
۵۔ چینی اور جاپانی افسانے ۹
۶۔ انگریزی افسانے ....
۷۔ سراج سخن (کلام شاہ سراج اورنگ آبادی) ۱ار

۳۔ سید محمد ام اے

۱۔ ارباب نثر اردو (فورٹ ولیم کالج کے اردو نثر نگاروں کا تذکرہ) ۱ال
۲۔ مثنویات میر ۱ال
۳۔ گلشن گفتار (اردو شعرا کا قدیم ترین تذکرہ) ۱۲ار
۴۔ نصائد ایمان ۸ار
۵۔ ایمان سخن (کلام شیر محمد خاں ایمان) ۱۲۰ار
۶۔ ابتدائی قواعد فارسی ۱۲ار
۷۔ یادگار ولی ۱ال

۱۳۔ گرو داس بی اے ایل ایل بی

۱۔ جیون چرتر (راجہ تیج رائے آنجہانی کی سوانح عمری)

۱۴۔ میر حسن ام اے

۱۔ ورڈسورتھ اور اسکی شاعری ۔۔۔ ۸؍

۲۔ ہوش کے ناخن (ڈراما) ۔۔۔۔۔۔ ۱۰؍

۱۵۔ محمد تقی الدین ام اے

۱۔ ٹیگور اور اسکی شاعری ۔۔۔۔۔۔۔

۱۶۔ نبی الحسن شمیم بی اے

۱۔ شعاع امید (مصنف کی نظموں کا مجموعہ) ۔۔۔۔

۲۔ شمیم سخن (״ ״ غزلیات کا مجموعہ) ۔۔۔۔

۳۔ عالم حسیات (״ ״ غزلوں اور نظموں کا مجموعہ) ۔۔۔۔

۱۷۔ احمد بن عبداللہ بی اے

۱۔ کیفی تشریح (طلبائے انٹر سائنس کے لیے) ۔۔ ۱۲؍

۲۔ عملی کیمیا (طلبائے انٹرمیڈیٹ کے لیے) ۔۔ عا؍

۱۸۔ اعظم خاں ام اے

۱۔ سید الانبیاء (کارلائل کے مشہور لکچر ... کا اردو ترجمہ) عہ

۲۔ رہنمائے صحت (مہاتما گاندھی کی کتاب ... کا ترجمہ) عہ

۱۹۔ سنکٹ پرشاد بی اے ایل ایل بی

۱۔ حیدرآباد اور ہندو مسلم زندگی ۔۔۔۔ ۶؍

۲۰۔ ڈاکٹر سید جعفر حسن پی ایچ ڈی (لندن)

۱۔ منتخبات کلام ہندی (ہندی کلام کی تشریح و تبصرہ) عا؍ ۱۲؍

۲۱۔ ڈاکٹر حمید اللہ پی ایچ ڈی (جرمنی)

۱۔ نیلگری (نیلگری کے متعلق عام فہم معلومات) ۔۔۔۔۔ ۴؍

۲۔ قانون بین الممالک ۔۔۔۔۔۔۔۔ عہ ۴؍

۲۲۔ سدرشن راج ام ایس سی

۱۔ طبعیات مکمل (عثمانیہ میٹرک کے طلبائے سائنس کے لیے)

۲۳۔ سردار خاں

۱۔ جدید نصاب طبعیات (دو جلدیں عثمانیہ میٹرک کے لیے) فی عصہ

۲۔ جدید نصاب کیمیا (״ ״ ״) عا؍

۲۴۔ عباس حسین لطفی بی اے

۱۔ مثنوی بیوی (ایک دلچسپ انگریزی ناول کا ترجمہ) ۔۔ ۱۲؍

۲۵۔ محمد عبدالرحمن مدیر "وقت"

۱۔ قواعد اردو (طلبائے مدارس وسطانیہ کے لیے) ۔۔۔۔۔ ۱۲؍

۲۔ سیرت و کردار (بچوں کے لیے اخلاقی کتاب) ۔۔۔۔۔ ۸؍

۲۶۔ محمد عبدالحفیظ بی اے بی ٹی ام اے (ڈنبرا)

ایف ایس سی (لندن)

۱۔ مبادیات سائنس حصہ اول و دوم (عثمانیہ میٹرک کیلئے) عا؍ ۱۲؍

۲۔ حفظ صحت (طلبائے مدارس کے لیے) ۔۔۔۔۔ ۴؍

۲۷۔ محمد عبدالسلام ذکی بی اے بی ٹی

۱۔ شہادت نامہ (حضرت امام حسینؑ کے واقعات شہادت) عصہ

۲۔ گلزار اطفال (بچوں کے لیے) ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۸؍

۳۔ چمن زار حکایات (״ ״) ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶؍

۴۔ جذبات عالیہ (حمد اور قومی نظموں کا ترجمہ) ۸؍

۴۔ شیخ چاند مرحوم ایم اے ال ال بی

۱۔ ملک عنبر ۸/

۲۔ ایضاً ....

۳۔ سودا (مقالۂ تحقیقی) ۱۲/

۵۔ ابوالمکارم فیض محمد تقی بی اے پی ایچ ڈی

۱۔ ابتدائی الجبرا (عثمانیہ میٹرک کے لیے) ....

۲۔ حساب ....

۳۔ مطالعۂ قدرت حصہ اول ۱۲/

۴۔ جدید نصاب طبعیات .....

۵۔ مصلحان تعلیم ....

۶۔ ابن سعود ....

۷۔ مسز سمپسن ....

۶۔ محمد اشیری بی اے بی ٹی

۱۔ تسلیم (مولانا وحید الدین سلیم پر ... مضامین)

۲۔ من کی بانسری (مصنف کی ... کا مجموعہ) ...

۳۔ شیب و شباب (... نظموں کا مجموعہ) ۲/

۷۔ پروفیسر ڈاکٹر میر ولی الدین

۱۔ فلسفہ کی پہلی کتاب (فلسفہ کی ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ)

۲۔ مقدمہ مابعد الطبعیات ....

۳۔ برگساں (مشہور فرانسیسی فلسفی کی حیات اور نظریے) ...

۴۔ قنوطیت یعنی فلسفۂ یاس (خیر و شر، غایت حیات عالم)

۸۔ مخدوم علی

۱۔ جغرافیہ سلطنت آصفیہ (مدارس کے لیے) ۸/

۲۔ جغرافیۂ عالم ....

۳۔ جغرافیہ کی تعلیم (جغرافیہ پڑھانے کا عام طریقہ) ۱/

۴۔ ذہنی حساب (مدارس کے لیے) ۲/

۵۔ رفیق مدرسین ۸/

۶۔ دو صد ... [illegible] ....

۷۔ سائنس کہانیاں (بچوں کے لیے) ۲/

۹۔ [illegible] ایم اے

۱۔ غالب (ڈاکٹر سید عبد اللطیف کی انگریزی کتاب غالب کا ترجمہ)

۱۰۔ محمد ظہیر الدین [illegible]

۱۔ مکمل ہندسۂ عملی (طلبائے عثمانیہ میٹرک کے لیے) ...

۲۔ [illegible] (طلبائے عثمانیہ میٹرک) ...

۱۱۔ [illegible]

۱۔ [illegible]

۲۔ فلسفۂ عجم (ڈاکٹر اقبال کی مشہور ... کا ترجمہ) [illegible]

۳۔ برگساں [illegible]

۴۔ [illegible] ۱۲/

۱۲۔ [illegible] ایم اے ال ال بی

۱۔ [illegible] (... زندگی کی بعض نظموں کا نفیس ترجمہ اور ...) [illegible]

۲۔ ہنری چہارم (شیکسپیر کے مشہور ڈرامے کا ترجمہ) ....

۲۸۔ انوار حسین بی اے

۱۔ جبر و مقابلہ (مدارس وسطانیہ کے لیے) ۱۵/

۲۔ جغرافیۂ طبعی (" " ") ۱۰/

۲۹۔ محمد عبد الشکور بی اے

۱۔ التنذیر (ایک معاشرتی ناول)..... ۸/

۳۰۔ عبد القادر وفا (عثمانیہ)

۱۔ خوابِ راحت (فلمی ڈراما).......

۲ دیوانِ وفا..........

۳۱۔ احمد عبد اللہ المسدوسی بی اے ال ال بی

۱۔ اسوۂ حسنہ (آنحضرت صلعم کے اخلاق و عادات کا نقشہ) ۸/

۳۲۔ عبد اللطیف بی اے

۱۔ عملی ہندسہ (عثمانیہ میٹرک کے لیے)...... ۱۲/

۲۔ علم مساحت (" " ")..... ۱۲/

۳۳۔ محمد عبد الوہاب بی اے بی ای

۱۔ جداول ریاضیہ (طلبائے مدارس کے لیے)...

۳۴۔ عزیز احمد بی اے

۱۔ فرانسیسی افسانہ (فرانسیسی افسانوں کا ترجمہ)... ۱۲/

۲۔ گلدستۂ تاریخ (عثمانیہ میٹرک کے لیے) ۱۲/

۳۵۔ غلام طیب بی اے

۱۔ دیسی کہانیاں (بچوں کے لیے).......

۳۶۔ محسن بن شبیر بی اے

۱۔ یوسف ہندی قید فرنگ میں.... عہ

۳۷۔ محشر عابدی بی اے

۱۔ محشرستان (مصنف کے افسانوں کا مجموعہ).. عصہ ۸/

۳۸۔ محمد احمد عثمانی بی اے ام ایس سی

۱۔ طبعیات عملی (انٹرمیڈیٹ سائنس کیلئے) عاہ ۸/

۲۔ مبادی سائنس (طبعیات کا ابتدائی رسالہ)...

۳۹۔ نجم الغنی (عثمانیہ)

۱۔ خیالاتِ عالیہ (انگریزی اردو وغیرہ مصنفین کے مضامین کا ترجمہ) عا/

۴۰۔ ندیم الحسن ناشر بی اے

۱۔ اردو کی قومیت (اردو زبان کی سرگذشت)...

۴۱۔ نور اللہ محمد نوری

۱۔ شرح انتخاب دیوان غالب........ ۱۲/

۲۔ داغ (داغ دہلوی کے حالات اور کلام کی تنقید و تحسین).. عا/ ۸/

۴۲۔ میر محمود علی ام اے

۱۔ آصفجاہ ثانی (نواب میر نظام علیخاں کی سوانحعمری) عاں

ملنے کے پتے: ۱۔ مکتبۂ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدرآباد دکن ۲۔ غلام دستگیر تاجر کتب حیدرآباد دکن ۳۔ سید عبد الرزاق تاجر کتب چار مینار حیدرآباد
۴۔ مکتبۂ علمیہ حیدرآباد ۵۔ مکتبۂ جامعہ قرول باغ دہلی ۶۔ دفتر مجلس علمیہ بازار گھانسی حیدرآباد

سہ ماہی علمی و ادبی رسالہ

Graduates'

MAGAZINE

مجلہ طیلسانین

QUARTERLY

جلد دوم
۱۹۳۷ء

شمارۂ دوم
۱۳۴۷ف

مجلۂ طیلسانین

مجلس علمیہ طیلسانین عثمانیہ کا سہ ماہی رسالہ

زیرِ ادارت

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ام اے (عثمانیہ) پی ایچ ڈی (لندن) پروفیسر اردو جامعۂ عثمانیہ صدر
عبدالمجید صدیقی ام اے ال ال بی (عثمانیہ) پروفیسر تاریخ جامعہ عثمانیہ رکن
غلام دستگیر رشیدؔ ام اے (عثمانیہ) لکچرار فارسی نظام کالج 〃
مہندر راج سکسینہ ام ایس سی (عثمانیہ) شعبۂ حیاتیات جامعہ عثمانیہ 〃
سید محمد ام اے (عثمانیہ) لکچرار اُردو و فارسی گورنمنٹ سٹی کالج معتمد

ناشر

مجلسِ علمیہ طیلسانین عثمانیہ گھانسی بازار

حیدرآباد دکن

مجلّہ طیلسانئین

۱۔ یہ مجلسِ علمیہ طیلسانئین عثمانیہ کا سہ ماہی علمی و ادبی رسالہ ہے، جو جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر مطابق بہمن، اردی بہشت، امرداد، آبان میں شایع ہوگا۔

۲۔ اس رسالے میں طیلسانئین عثمانیہ کے علمی و ادبی مضامین، بلند پایہ نظمیں، اور وہ تحقیقی مقالات بھی بالاقساط شایع ہوں گے جو جامعۂ عثمانیہ کی ام اے اور ام ایس سی کی ڈگریوں کیلیے قبول کیے گئے ہیں نیز انجمنِ طیلسانئین عثمانیہ کی علمی سرگرمیوں کی روئداد بھی پیش کیجائیگی۔

۳۔ مضامین متعلقہ سیاسیاتِ حاضرہ اور دل آزار تنقیدیں کسی صورت سے قابلِ اشاعت متصور نہونگی۔

۴۔ رسالے کی ضخامت کم سے کم (۱۲۵) صفحے ہوگی۔

۵۔ سالانہ چندہ پیشگی خریدارانِ بلدہ سے ۱۲/ اور خریدارانِ اضلاع سے ۱۲/ بشمول محصولِ ٹپہ۔

۶۔ زرِ چندہ اور تمام مضامین نظم و نثر معتمد کے نام بھیجے جائیں اور دیگر امور کے لیے منتظمِ اعزازی سے مراسلت کی جائے۔

مجلۂ طیلسانئین

فہرست

اداریہ

"اُس کی آرام گاہ شاہی مسجد کا دامن ہے ..... جہاں ہزاروں مسلمان روزانہ آتے جاتے رہتے ہیں۔ شام کے وقت تو اتنا دردناک اور پُرسوز منظر رہتا ہے کہ سنگ دل سے سنگ دل انسان کی آنکھوں سے بھی بے ساختہ آنسو ٹپک پڑتے ہیں ـــــ" (عبدالرحمٰن چغتائی)

یہ اس شاعرِ اعظم کی آخری آرام گاہ کا حال ہے جس نے اپنے اعلیٰ تخیلات اور بلند تفکرات کے ذریعے سے اسلامی دنیا میں حرکت و حیات کی لہر دوڑادی تھی۔ اقبال کی شخصیت کے ساتھ ایک بڑا مفکر، فلسفی، مسلمانوں کا رہنما اور اردو کا محسن ہمیشہ کے لیے دفن ہوگیا اور اندازہ بھی نہیں لگایا جاسکتا کہ اس کا نعم البدل کب ملے گا۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید　　　نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے　　　دگر دانائے راز آید کہ ناید　　(اقبال)

کوئی دوسرا "دانائے راز" پیدا ہو کہ نہ ہو ـــ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اقبال ہمارے لیے ایک جاودانی پیام چھوڑ گیا ہے جس کے پردے میں وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس جاودانی پیام کو اگر ہم اپنا رہنما بنائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اقبال کے نعم البدل کی تلاش میں رہیں۔

اقبال کا تصورِ قومیت، رنگ و نسل اور جغرافیائی حدود سے بالاتر تھا۔ اس لیے اس نے جو کچھ کہا وہ ساری دنیا کے لیے کہا۔ اگرچہ اس نے پہلے پہلے ہندوستان کو اپنا مخاطب بنایا۔ لیکن اس کے بعد اپنی قوم کی طرف توجہ کی اور آخر میں اس کا پیام ساری دنیائے انسانیت کے لیے ہوگیا۔

"جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی اور ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو پاش پاش نہ کردیا جائے گا۔ جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیال اللہ کا

قائل نہ ہو جائے گا جب تک جغرافیائی وطن و نسل اور رنگ کا امتیاز مٹ نہ جائے گا، انسان اس دنیا میں فوز و کامرانی کی زندگی بسر نہ کرسکے گا اور اُخوت، حرّیت اور مساوات کے شان دار الفاظ کبھی شرمندۂ معنے نہ ہوں گے۔" (اقبال)

حیدر آباد نے اس شاعر اعظم کا شایانِ شان خراجِ تحسین ادا کیا۔ابھی وہ زندہ ہی تھا کہ "مسلم کلچر سوسائٹی" کی جانب سے ہز ہائنس والا شان شہزادۂ برار کی صدارت میں شان دار طریقے سے "یوم اقبال" منایا گیا۔ اس کے بعد ماہ نامۂ "تخلیق" نے "اقبال نمبر" شایع کیا۔اس کی وفات کے بعد حیدر آباد اور اس کے اضلاع میں تعزیتی جلسے ہوئے اور ماہ نامۂ "سب رس" نے "اقبال نمبر" شایع کیا۔ ہمیں توقع ہے کہ اقبال کے پیام و کلام کی عالمگیر اشاعت میں حیدر آباد ہمیشہ کی طرح امتیازی حصہ لے گا۔

دنیائے اُردو ادب کے لیے مشہور مورخ اکبر شاہ خاں کی وفات بھی ایک افسوسناک سانحہ ہے۔ان کی تصنیفات نے تاریخی ادب میں خاص اہمیت حاصل کرلی ہے۔انتقال کے وقت تک "تاریخ اسلام" زیر ترتیب تھی۔ممکن ہے کہ اس کی اشاعت سے ایک بڑی ضرورت کی تکمیل ہو جائے۔ وہ مورخ کے علاوہ شاعر بھی تھے اور اُردو اور فارسی میں بڑی اچھی غزلیں لکھتے تھے۔

گزشتہ مہینے عثمانیہ بلدی جماعت نے اپنی سالانہ کانفرنس منعقد کی۔اس جماعت کے کارنامے محتاج تعارف نہیں ہیں۔ بلدیہ کی انتخابی سرگرمیوں، شہر کی آرایش و صفائی میں اربابِ بلدیہ کی معاونت کے علاوہ اس نے حالیہ ہنگامے میں جس طرح اپنی رضا کارانہ خدمات پیش کی ہیں وہ قابلِ تحسین ہیں۔

اس کی دوسری سالانہ کانفرنس، پہلی کانفرنس سے زیادہ کامیاب رہی۔خطبۂ استقبالیہ، خطبۂ صدارت، مسز سروجنی نائیڈو، نواب مہدی نواز جنگ اور محترمہ صغرا ہمایوں مرزا کی تقاریر اور اکثر تحریکات نے یہ ثابت کر دیا کہ شہریت کے ارتقا میں اس جماعت کا خاص حصہ ہے۔

اراکین بلدی جماعت نے صفائی کا عملی مظاہرہ بھی کیا۔بادی النظر میں یہ ایک طفلانہ حرکت تھی لیکن اس کی تہ میں ایک احساسِ خدمت گزاری بھی پوشیدہ تھا اور ہمیں امید ہے کہ اس نمایش سے ہٹ کر ہماری بلدی جماعت عملاً اپنے جذبۂ خدمت گزاری کو کام میں لائے گی۔

مادرِ جامعہ کی پہلی میقات کا افتتاح کرتے ہوئے نواب معین امیر جامعہ نے ایک بلند پایہ تقریر فرمائی اور

ضبط" پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ آپ نے کہا کہ:۔

"ہر شخص کو ضبط کا پابند ہو جانا چاہیئے۔ کوئی سمجھدار شخص یہ نہیں چاہتا کہ وہ جس ادارے یا ریاست میں رہتا ہے اس کو نقصان پہنچائے۔ آزادی اشتراکِ عمل سے حاصل ہوتی ہے۔

ضبط کی مشق پہلے اپنے آپ سے شروع ہونی چاہیئے۔ نفس کی غلامی سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی غلامی نہیں۔ جو شخص جامعہ اور ریاست کی بہتری و بہبودی چاہتا ہے وہ ضبط پیدا کرے۔ ضبط ہی آزادی کا مفہوم ہے۔"

ہمیں توقع ہے کہ برادرانِ جامعہ نواب صاحب کے ان قیمتی خیالات کو ہر قدم پر اپنا رہنما بنائیں گے۔ اس سلسلے میں نواب صاحب نے طلباء کی ضبط شکنی کا بھی صحیح اندازہ لگایا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ:۔

"استاد کا فرض ہے کہ وہ طالب علموں کے مزاج و خیالات سے واقف ہو کر ان کے دلوں کو اپنے ہاتھ میں لے۔ ان کی نفسیات معلوم کرے۔ طالب علم کوئی لکڑی نہیں ہے جس کو جس طرح جی چاہتا ہے کاٹے اور چھیلے۔ استاد جس قدر طالب علموں کے مزاج اور طبیعت سے واقف ہوگا اسی قدر وہ طلبہ میں ضبط پائے گا۔ کوئی استاد جب طلباء کے احساسات کو نظر انداز کر دیتا ہے تو طلباء اس سے سرکش اور باغی ہو جاتے ہیں اور ان کی ہمت اور حوصلوں میں پستی آ جاتی ہے۔ طالب علم فی الحقیقت سرکش اور باغی نہیں ہوتا لیکن استاد کی غلط رہنمائی اس کو ایسا بنا دیتی ہے۔"

جب تک اساتذہ اور طلباء قریب تر نہیں ہوتے، وہ خلیج جو ان کے خوش گوار تعلقات میں حائل رہتی ہے کبھی پاٹی نہیں جا سکتی۔

مجلہ عثمانیہ کی تازہ اشاعت کو دیکھ کر تمام عثمانیین کی طرح ہمیں بھی افسوس ہوا۔ جہاں تک ہم نے غور کیا ہے ادارت کے لیے غلط طریقۂ انتخاب اس قسم کی لغزشوں کا ذمہ دار ہے۔ انجمن اتحاد جامعہ عثمانیہ کے انتخابات جماعتی احساس کے تحت عمل میں آتے ہیں، اور وعدہ پر انتخابی کام کا دار و مدار ہوتا ہے۔ انتخاب کے بعد ان تمام عہدوں پر جن کے انتخابات کابینۂ انجمن اتحاد کے اختیار میں ہیں، وہی اشخاص منتخب کیے جاتے ہیں جن سے وعدہ کر کے انتخابی مہم میں کام لیا گیا تھا۔ ہم جماعتی احساس کو اس حد تک برا نہیں سمجھتے کہ وہ جامعاتی کاروبار پر اثر انداز ہوئے بغیر کام آ سکے۔ لیکن جہاں محض جماعت بندی کے غلط تصور سے جامعہ کی روایات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو ہم کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتے۔

ہم "مجلہ عثمانیہ" کی اس معیاری بلندی کے پیشِ نظر جو اربابِ ذوق میں احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے، جامعہ کی انجمن اتحاد کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ مدیروں کے انتخاب میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کرے۔ یا یہ ہو سکتا ہے کہ مجلہ کی

مجلسِ نگرانی ہی جامعہ کے اچھے طالب علموں میں سے مجلہ کے لیے مدیر منتخب کرے۔ بہر حال جو طریقہ بھی ہو، یہ ضروری ہے کہ وہ مجلہ کی ترقی کے رستے میں حائل نہ ہو۔

جامعۂ عثمانیہ نے گذشتہ سال طالبات کے لیے ایم اے اور ایم ایس سی کی جماعتیں کھول دی تھیں اور ان جماعتوں کی تمام طالبات نے کامیابی حاصل کی۔ ہم نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ طالباتِ جامعہ، طلبائے جامعہ سے کسی طرح کم نہ نہیں ہیں۔ ان کی علمی و ادبی کاوشوں سے اردو دنیا ناواقف نہیں ہے۔ ان میں زورِ قلم بھی ہے، بلندیٔ فکر بھی ہے اور سنجیدگی بھی۔ ہم تمام طالبات کو ان کی نمایاں کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں خصوصاً محترمہ لطیف النسا بیگم صاحبہ کو جنھوں نے امتیازی کامیابی حاصل کی ہے۔

ڈاکٹر محمد رضی الدین صاحب صدیقی ہماری جامعہ کے فاضل طیلسانی ہیں۔ ان کو طالب علمی ہی کے زمانے سے علمی خدمت کا بے پایاں شوق رہا ہے چنانچہ وہ ہمیشہ مصروفِ عمل رہتے ہیں۔ ان کا نام ساری دنیا میں مشہور ہے۔ ان کی سائنسی تحقیق عام طور پر قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔ حال ہی میں بہترین سائنسی تحقیق پر ان کی خدمت میں الہ آباد سائنس اکاڈمی کی جانب سے ایک طلائی تمغہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ وہ امتیاز ہے جو بہت کم لوگوں کو ملتا ہے، اس لیے اس پر جامعہ جس قدر ناز کرے کم ہے۔

اس سال حیدرآباد سیول سروس کلاس کا انتخابی نتیجہ اگرچہ عثمانیین کے لیے ناسازگار رہا لیکن ایک ممتاز طیلسانی مرزا عبدالباسط بیگ صاحب اس سال کے لیے منتخب ہوئے ہیں۔ ہم ان کو عملی زندگی کے دائرے میں داخل ہونے پر مبارکباد دیتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ جامعہ میں سیول سروس کلاس کے لیے طلبا کو تیار کرنے کے لیے خاص انتظام ہونے کے باوجود اس سال ایسا نتیجہ کیوں نکلا؟ اس کو محض اتفاقی تصور کرلیں تو ہم آیندہ سال بہتر نتیجے کی توقع کرتے ہیں۔

ذہنی تصوّریت

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

جانؔ بارکلے (۱۶۸۵ء تا ۱۷۵۳ء) اٹھارہویں صدی کا ایک نہایت تیز فہم آئرش فلسفی گزرا ہے جس نے تصوّریت کی ایک موضوعی یا ذہنی صورت پیش کی ہے، اور جو ذہن کو فلاطون سے زیادہ اساسی شئے قرار دیتا ہے، کیوں کہ بارکلے مادّے کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا۔ فلاطون نے کہا تھا کہ مادّے کا وجود پایا جاتا ہے لیکن وہ مادّے کو کوئی اہم شئے قرار نہیں دیتا۔ بارکلے کہتا ہے کہ سرے سے مادّے کا وجود ہی نہیں پایا جاتا۔ کائنات بالکل غیر مادّی، روحانی شئے ہے اور محض نفوس یا ارواح کی جماعت پر مشتمل ہے۔ جو چیزیں مادّی اشیاء کہلاتی ہیں وہ ذہن کے محض تصوّرات ہیں۔ اشیاء کا وجود ذہن کا محتاج ہے۔ اس معنے کر کے وجودِ اشیاء محسوسیت اشیاء کے مرادف ہے

جو شئے قطعاً کسی نفسِ مدرکہ کے حس و ادراک میں نہیں آتی وہ

موجود ہی نہیں ہو سکتی۔ بارکلے کے اس نظریے کو منٹلزم یا ذہنی تصوریت یا روحانی کثرتیت کہا جاتا ہے۔ بارکلے نے اس کو ۱۷۱۰ء میں اپنی شہرۂ آفاق کتاب "مبادی علم انسانی"
Treatise Concerning the Principles Of Human Knowledge
میں پیش کیا اور ۱۷۱۳ء میں وہ اپنی دوسری کتاب، مکالمات مابین ہائیلس و فلونیس میں اس نظریے کے اساس پر خدا کے وجود کا ایک نیا ثبوت پیش کرتا ہے[1]۔ یہ دونوں کتابیں نسبتاً آسان اور دلچسپ زبان میں لکھی گئی ہیں، طلباء کے لیے ان کا مطالعہ ضروری ہے۔

بارکلے کا یہ دعویٰ کہ مادی اشیاء کا سرے سے وجود ہی نہیں پایا جاتا ہیں ایک آشفتہ دماغ فلسفی کی یاوہ گوئی نظر آتا ہے اور جب ڈاکٹر جانسن نے اپنے کسی ملاقاتی سے بارکلے کے اس دعوے کو سنا تو اس نے پتھر پر زور سے ایک ٹھوکر لگائی اور کہا کہ میں بارکلے کے ہذیان کی اس طرح تردید کرتا ہوں! بھلا جس چیز کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے، کانوں سے سنتے، ہاتھوں سے چھوتے اور زبان سے چکھتے ہیں، اس کا انکار کس طرح ممکن ہے؟ فلسفے کی بھول بھلیاں ہیں عام و معمولی زندگی کی ان ٹھوس چیزوں کی طرف سے کب اندھا کر سکتی ہیں؟ ہرگز نہیں۔ بارکلے بھی کبھی ایک لحظہ کے لیے ان براہ راست محسوس ہونے والی اشیاء کے وجود کا انکار نہیں کرتا۔ وہ آپ کی میری طرح مانتا ہے کہ یہ شجر و حجر، یہ میز کرسی جن کا ہم ادراک کر رہے ہیں حقیقی وجود رکھتی ہیں لیکن وہ اس امر سے ضرور انکار کرتا ہے کہ ان کا وجود ذہن سے باہر ہے! بالفاظ مختصر وہ اس امر سے انکار کرتا ہے کہ جو اشیاء براہ راست محسوس ہوتی ہیں ایسے حقایق ہیں جن کا وجود اس حالت میں بھی باقی رہتا ہے جب کہ کسی نفس کو ان کا شعور نہیں ہو رہا ہے۔ لہٰذا ایجابی طور پر برکلے کی تعلیم یہ ہے کہ "اشیاء تصورات ہیں"۔ بقول شوپنہور کے "دنیا میرا تصور ہے"۔

---

[1] یہ دونوں کتابیں اردو میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ اول الذکر کتاب کا مولوی عبدالباری صاحب ندوی اور ثانی الذکر کا مولوی عبدالماجد صاحب بی۔ اے نے نہایت خوبی کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔ مولوی عبدالباری صاحب نے برکلے کے نام سے ایک کتاب شایع کی ہے جو اس فلسفی کے سوانح و فلسفہ پر ایک مستقل تالیف ہے۔ کتاب مختصر ہے لیکن طلباء کے لیے نہایت مفید ہے۔

ع "عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے"! برکلے اس مفہوم کو ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے:-

"جس میز پر میں لکھ رہا ہوں وجود رکھتی ہے، یعنی اس کو میں دیکھتا ہوں اور چھوتا ہوں؛ اگر میں اپنے کمرے سے اٹھ کر چلا جاؤں تو بھی میں یہ کہوں گا کہ میز موجود ہے، جس سے میری مراد یہ ہوگی کہ اگر میں اپنے کمرے میں ہوتا تو اس کو دیکھ سکتا یا کوئی اور روح فی الحقیقت اس کو دیکھ رہی ہے۔ اسی طرح کہا جاسکتا ہے کہ بُو کا وجود تھا یعنے وہ سونگھی گئی تھی، آواز کا وجود تھا یعنے وہ سُنی گئی تھی، رنگ یا شکل کا وجود تھا یعنے بصر و لمس سے اس کا ادراک یا احساس ہوا تھا۔"[1]

یہ ہیں برکلے کے اس عجیب و غریب نظریئے کے صاف معنے اسی کے الفاظ میں حقیقی وجود نفس مدرکہ کا وجود ہے، خارجی اشیا محض ایک ظلی یا شبہی وجود رکھتے ہیں، اگر آفتاب کا وجود نہ ہو تو نہ نُور کا وجود ہوسکتا ہے اور نہ سایہ کا، اسی طرح جب نفسِ مدرکہ نہیں تو خارجی دُنیا کا بھی وجود نہیں۔ اشیا، اپنے وجود میں نفس کے محتاج ہیں۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ برکلے اس دعوے کو کہ براہ راست محسوس ہونے والی شئے تصوّر ہے کس طرح ثابت کرتا ہے۔ وہ کسی ایک شئے کو لیتا ہے اور اس کو اس کے اجزا میں تقسیم کرتا ہے۔ فرض کرو یہ سامنے رکھا ہوا پھُول جس کا ہمیں اس وقت خوشگوار احساس ہو رہا ہے اس کی ہم نے تحلیل کی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ رنگین ہے، خوش بُو رکھتا ہے، نرم ہے اور گول ہے، یعنے ہمیں اس کا علم اس کی صفات کے مجموعے کے طور پر ہو رہا ہے۔ اب برکلے کہتا ہے کہ اگر یہ بتلا دیا جائے کہ ان صفاتِ مدرکہ میں سے ہر صفت نفسِ مدرکہ سے مستقل و غیر محتاج ہو کر نہیں پائی جاسکتی تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ خود شئے مدرکہ بھی شعور کی ایک کیفیت ہے۔ برکلے اپنے پیش رو لاک کی طرح یہ ثابت کرتا ہے کہ رنگ، بُو، مزہ وغیرہ (ثانوی صفات) خارج میں نہیں پائے جاتے بلکہ ذہن میں پائے جاتے ہیں: اس لیے کہ نفسِ مدرکہ کے

---

[1] مبادی علم انسانی۔ بند ۳۔

تغیر کے ساتھ ان میں بھی تغیر رونما ہوتا ہے۔ اگر یہ صفات مادّی اشیار کی صفات ہوتیں جو اپنے وجود میں نفس سے غیر محتاج ہوتیں تو ظاہر ہے کہ نفس کے تغیر کے ساتھ ان میں تغیر پیدا نہ ہوتا۔ برکلے کا یہ استدلال، استدلالِ اضافیت کہلاتا ہے۔

اپنی کتاب "مکالمات مابین ہائلس و فلونیس" میں وہ اس استدلال کو تفصیل کے ساتھ پیش کرتا ہے:۔

فلونیس: "فرض کیجئے آپ کا ایک ہاتھ گرم ہے اور ایک سرد، اور آپ دونوں کو ایسے پانی میں ڈال رہے ہیں جو زیادہ گرم ہے اور نہ زیادہ سرد، تو کیا آپ کو ایک ہی وقت میں (دو مختلف ہاتھوں کی وساطت سے) پانی گرم و سرد دونوں نہ معلوم ہوگا؟

ہائلس: ہاں ہوگا تو،

ف: اور ایک شئے کا ایک ہی وقت میں گرم و سرد ہونا آپ ابھی محال تسلیم کر چکے ہیں،

ہائلس: جی،

ف: معلوم یہ ہوا کہ جس مسئلے کی بنا پر تناقض یا استحالہ لازم آتا ہے وہی سرے سے غلط ہے، آپ خود اقرار کر چکے ہیں جو مقدمات ایک نتیجۂ محال تک پہنچاتے ہیں وہ صحیح نہیں ہوسکتے"[1]

یعنے اگر روزمرہ کے نظریے کی بنا پر سردی اور گرمی کو ایسی صفات مانا جائے جن کا ایک ایسی شئے سے تعلق ہے جو شعور سے مستقل و غیر محتاج طور پر پائی جاتی ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ایک شئے وقتِ واحد میں دو متضاد صفات کی حامل ہے یعنے سرد بھی ہے اور گرم بھی۔ اور یہ قول برکلے کے بیہودگی کا قایل ہوتا ہے۔ گو ایک شئے ایک ہی وقت میں سرد و گرم نہیں ہوسکتی لیکن یہ مانا جاسکتا ہے کہ نفسِ مدرکہ ایک ہی وقت میں گرمی اور سردی کے

---

[1] ۔ مکالمات مترجمہ عبدالماجد صفحہ (۱۲)۔

تصورات رکھ سکتا ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ گرمی و سردی کا وجود خارجی نہیں بلکہ محض ذہنی ہے۔ نہ صرف سردی اور گرمی میں مدرک کے ساتھ تغیر پیدا ہوتا ہے بلکہ یہی حال ذایقہ کا بھی ہے۔ "کیا شیرینی بعض امراض کی حالت میں تلخ نہیں معلوم ہونے لگتی؟ کیا یہ آئے دن کا مشاہدہ نہیں کہ جو غذائیں ایک شخص کو لذیذ معلوم ہوتی ہیں، دوسرے کو ان سے نفرت ہوتی ہے؟ اب اگر ہر شے میں فی نفسہ ایک خاص قسم کا ذایقہ موجود رہتا ہے تو اختلاف و تنوعِ ذوق کی علت کیا ہوسکتی ہے؟" برکلے کے معنے صاف ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہم غذا کے ذایقہ کے وقت کسی ایسی شئے کی صفت کا احساس کر رہے ہیں جو ہم سے مستقل و غیر محتاج طور پر خارج میں پائی جاتی ہے تو مختلف لوگوں کے لیے اس غذا کا ذایقہ وہی ایک ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ایک ہی غذا مختلف لوگوں کو مختلف معلوم ہوتی ہے؛ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ مختلف ذایقے مختلف لوگوں کے مختلف تصورات ہیں۔ بالفاظ دیگر ذایقہ کا وجود خارجی نہیں بلکہ محض ذہنی ہے۔ یہی حال بُو کا ہے اور آواز کا، یہ بھی مدرک کے تغیر کے ساتھ متغیر ہوتے ہیں۔ مثلاً غلاظت و نجاست جسے جانور شوق سے کھاتے ہیں ان کے لیے وہی بُو نہیں رکھتی جو ہمارے لیے رکھتی ہے۔ لہٰذا مزہ کی طرح بُو بھی محض "ایک اضافی شئے ہے جو جسم حاس یا ذہن پر مشروط ہے۔" رنگ بھی محض ذہنی شئے ہے، خارج میں اس کا کوئی وجود نہیں پایا جاتا۔ کیوں کہ یہ بھی ذہن کے تغیر کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ "ابر کے جو ٹکڑے ہمیں سرخ و ارغوانی رنگ کے نظر آتے ہیں" یہ فی الواقع ایسے نہیں ہوتے "یہ تو صرف فاصلے کے سبب سے ہم پر ایسے ظاہر ہوتے ہیں" ورنہ یہ "صرف سیاہ رنگ کے بخارات ہوتے ہیں۔"[۲]

غرض سردی، گرمی، مزہ، بُو، آواز، رنگ سب کے سب ثانوی صفات ہیں جن کا وجود خارجی نہیں بلکہ ذہنی ہے۔ اسکی دلیل ان کی اضافیت ہے، یعنے یہ ذہن کے تغیر کے ساتھ

لہ۔ مکالمات مترجمۂ عبدالماجد صفحہ (۱۹)۔

لہ۲۔ " " " " " (۲۴۰)۔

خود بھی متغیر ہوتے ہیں۔ اگر ان کا تعلق کسی ایسی شئے سے ہوتا جو اپنے وجود میں شعور سے غیر محتاج اور مستقل ہوتی تو ذہن کے تغیر سے ان میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ہے وہ پہلا استدلال جس کی بنا پر صفات ثانویہ کو ذہنی ثابت کیا گیا ہے۔ لاک نے بھی ان صفات کو صفات ثانویہ کہہ کر ان کو ذہنی ثابت کیا تھا۔ برکلے نے ڈیکارٹ اور لاک کے براہین کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے اور بس۔

یہاں پر ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اس معاملے میں لاک اور برکلے کے انکشافات جدید سائنس کی تحقیقات کے بالکل موافق ہیں۔ علمائے طبیعیات کی بھی یہی تعلیم ہے کہ خارجی مادی دنیا میں رنگ و بو، آواز، سردی، گرمی کا وجود نہیں۔ یہ سب محض تصورات ہیں اور ان تصورات کی حقیقی علل ارتعاشات ہیں۔ مثلاً جب ارتعاشات شبکیہ چشم پر اثر انداز ہوتے ہیں تو ذہن رنگ کا تصور قایم کرتا ہے اور جب ان کا اثر کان کے پردے پر ہوتا ہے تو آواز کا۔ پروفیسر وائٹ ہڈ کی کتاب "سائنس اور دنیائے جدیدہ" میں ایک مشہور عبارت ہے جس میں وہ اس رائے کو بڑی خوبی کے ساتھ ادا کرتا ہے:۔ "اجسام کا ادراک اس طرح ہوتا ہے کہ گویا یہ درحقیقت صفات کے حامل ہیں حالانکہ ایسا نہیں، صفات فی الحقیقت محض ذہن کی پیداوار ہیں! اس طرح فطرت کو وہ عزت دی جاتی ہے جو صرف ہمارے لیے ہی مخصوص ہونی چاہیئے تھی پھول اپنی بو کے لیے، بلبل اپنے نغموں کے لیے اور آفتاب اپنے نور کے لیے عزت پاتا ہے۔ شعراء سرے سے مغالطے میں مبتلا ہیں۔ غزلوں میں ان کا روئے خطاب خود ان کی اپنی جانب ہونا چاہیئے، اور ان غزلوں کو ذہن انسانی کی فضیلت و برتری کی مبارک بادیوں میں بدل دیا جانا چاہیئے۔ فطرت ایک بے کیف سی چیز ہے جو رنگ و بو اور آواز سے معرّی ہے؛ یہ صرف ذرات کی حرکت ہے جو ایک لامتناہی و بے معنے چیز ہے۔"

نہ صرف صفاتِ ثانویہ بلکہ لاک جن چیزوں کو صفاتِ اولیہ کہتا ہے ان سے بھی برکلے دنیا کو محروم قرار دیتا ہے۔ اس معاملے میں وہ لاک سے ایک قدم آگے بڑھاتا ہے اور بالکل صحیح طور پر۔ کیونکہ جس استدلال (اضافیت) کی بنا پر لاک رنگ و بو وغیرہ صفاتِ ثانوی کو ذہنی قرار دیا تھا بالکل اسی استدلال سے برکلے امتداد صلابت و حرکت کو بھی

ذہنی قرار دیتا ہے۔ برکلے کی بے پناہ منطق کا اندازہ مکالمات کی مندرجۂ ذیل عبارت سے قایم ہوگا جس میں وہ امتداد کو ذہنی ثابت کر رہا ہے۔ فلونیس، برکلے کے خیالات کا نمایندہ ہے اور ہائلس مادّے کا قایل۔ عبارت کچھ طویل ہے لیکن اس سے طالب علم کو مکالمات کی کچھ چاشنی حاصل ہو جائے گی جس کا پڑھنا اس کے لیے ضروری ہے:-

فلونیس: آپ کے خیال میں شکل و امتداد جن کا ہم حواس کے ذریعے سے ادراک کرتے ہیں خارج یا جوہر مادّی میں وجود رکھتے ہیں؟

ہائلس: رکھتے ہیں،

ف: اسی طرح حیوانات بھی اس محسوس کردہ شکل و امتداد کو موجود فی الخارج سمجھتے ہوں گے؟

ہائلس: ہاں اگر ان کے سمجھ ہو تو ضرور ایسا سمجھتے ہوں گے۔

ف: اب یہ فرمائیے کہ حیوانات میں وجودِ حواس کا مقصد کیا ہے؟ صیانت حیات ہی جیسا کہ انسان میں ہے یا کچھ اور؟

ہائلس: ہونا تو یہی چاہیے،

ف: اچھا جب یہ ہے تو کیا اس غرض کے لیے یہ لازمی نہیں کہ وہ اپنے اعضا کا نیز ان اجسام کا جو انھیں نقصان پہنچا سکتے ہیں، ادراک کرتے ہیں

ہائلس: ضرور ہے،

ف: اس بنا پر ایک بھنگے کو اپنی ٹانگ بلکہ اس سے بھی چھوٹے اجسام پوری وضاحت کے ساتھ نظر آتے ہوں گے، حالانکہ وہ ہمارے لیے بالکل یا تقریباً بالکل غیر مرئی رہتے ہیں۔

ہائلس: ہاں یہ تو ہے،

ف: اور بھنگے سے حقیر تر حیوانات کو یہ اجسام اور بھی بڑے معلوم ہوں گے۔

ہائلس: بلا شک،

ف: گویا جو اجسام ہمارے آپ کے لیے غیر مرئی ہیں وہ بعض حیوانات کو

پہاڑ کے اتنے عظیم الشان معلوم ہوتے ہوں گے؟

ہائلس: ظاہر ہے،

ف: لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ ایک شئے ایک ہی وقت میں بڑی بھی ہو اور چھوٹی بھی؟

ہائلس: قطعاً محال ہے،

ف: لیکن آپ تو خود اپنے ہی اصول کے لحاظ سے اس استحالہ کے مرتکب ہو رہے ہیں، خود آپ ہی کے مسلّمات سے لازم آتا ہے کہ بھنگے کی ایک ٹانگ ایک ہی وقت میں اتنی چھوٹی بھی ہوتی ہے کہ نظر تک نہیں آتی اور اتنی بڑی بھی ہوتی ہے کہ پہاڑ کی اتنی جسامت رکھتی ہے (اور اگر فی الواقع ایسا نہیں ہے، بلکہ جسامت کی کلانی وخردی صرف دیکھنے والے نقطۂ خیال کے تابع ہے تو صاف امتداد یا جسامت کا اضافی ہونا لازم آئے گا)۔

ہائلس: ہاں، یہ دشواری تو ضرور پڑتی ہے،

ف: اس کے علاوہ آپ کو اپنا یہ اصول یاد ہے کہ جوہر کے کسی عرضِ حقیقی میں تغیر نہیں ہو سکتا، تا وقتیکہ خود اس جوہر میں کوئی تغیر نہ ہو؟

ہائلس: یاد ہے، اور اس پر قایم ہوں،

ف: لیکن یہ عام مشاہدہ ہے کہ ہر شئے کی جسامت مری کا دارومدار دیکھنے والے کے فاصلے پر ہے، قریب سے دیکھیئے تو یہ چیز بڑی معلوم ہوتی ہے اور دور سے دیکھیئے تو چھوٹی، یہاں تک کہ جسامت کا یہ فرق بعض دفعہ دہ چند بلکہ صد چند ہو جاتا ہے، کیا اس کے بعد بھی آپ یہی کہے جائیں گے کہ جسامت، عرضِ اضافی نہیں بلکہ حقیقی ہے؟

ہائلس: ہاں، اس کا جواب تو سمجھ میں نہیں آتا،

ف: سمجھ میں جب ہی آئے گا جب آپ دیگر اعراض کی طرح اس عرض سے متعلق بھی پوری آزادی اور بے خوفی کے ساتھ غور کو کام میں لائیے گا،

یاد کیجیے کہ حرارت پر بحث کرتے ہوئے یہ اصول طے ہو چکا تھا کہ چونکہ پانی بھی ایک وقت میں ایک ہاتھ کو گرم اور دوسرے کو سرد معلوم ہوتا ہے، اس لیے ثابت یہ ہوا کہ حرارت و برودت فی نفسہ پانی میں داخل نہیں،

ہائلس : ہاں، یہ تو یاد ہے،

ف : بس تو ٹھیک اسی اصول پر فیصلہ ہوا جاتا ہے کہ کسی شئے کی کوئی حقیقت جسامت و شکل نہیں ہوتی، اس لیے کہ جو شئے ایک آنکھ کو چھوٹی ہموار اور گول معلوم ہوتی ہے، وہی دوسری آنکھ کو بڑی ناہموار اور زاویہ دار معلوم ہوتی ہے،

ہائلس : ایسا بھی ہوتا ہے؟

ف : جب چاہے تجربہ کر لیجیے، ایک آنکھ خالی رکھیے اور دوسری سے بذریعہ خوردبین دیکھیے یہی معلوم ہوگا،

ہائلس : خیر میں لاجواب تو ہو گیا لیکن طبیعت نہیں مانتی کہ جسامت کے وجودِ حقیقی سے انکار کروں، اس سے تو عجیب و غریب نتایج پیدا ہوں گے،

ف : آپ اس انکار کے نتایج کو عجیب کہتے ہیں، مجھے اس پر حیرت ہوتی ہے (کیونکہ دراصل جسامت سے انکار حیرت انگیز نہیں بلکہ تمام دیگر اعراض کے وجودِ حقیقی کے ابطال کے بعد صرف ایک جسامت کے وجودِ حقیقی کو تسلیم کرتے رہنا بے شبہ حیرت انگیز ہے، اگر یہ سچ ہے کہ کوئی تصور، یا مثل تصور کسی جوہر غیر حاس میں موجود نہیں ہو سکتا تو یہ بھی یقینی ہے کہ کوئی شکل یا جسامت جسے ہم تصور کر سکتے ہیں مادے میں وجودِ حقیقی نہیں رکھ سکتی اور خود ایسے جوہر مادی کے وجود کے تسلیم کرنے میں جو جسامت کا حامل ہو جو دشواریاں ہیں ان کا ذکر ہی نہیں، غرض یہ کہ ہر قسم کے عرض کا، خواہ شکل ہو یا آواز، یا رنگ ہو کسی غیر حاس مادے میں موجود ہونا یکساں ناممکن ہے،[1]

---

[1] مکالمات مترجمہ عبد الماجد صفحہ (۳۰ تا ۳۳)۔

برکلے ان ہی دلایل کی بنا پر صلابت و حرکت کو بھی امتداد کی طرح ذہنی قرار دیتا ہے[1]

اس طرح مادّی دُنیا کے متعلق ڈیکارٹ اور لاک کا جو نظریہ تھا (اور جو جدید سائنس کے بالکل مطابق تھا) برکلے کے دلایل کے سامنے وہ بالکل غیر متوافق و متناقض قرار پاتا ہے۔ اس مانوس و مشہور نظریے کی رو سے صفاتِ ثانویہ یعنے رنگ، آواز، مزہ اور بُو ذہنی کیفیات ہیں جو شکل و حرکت کی موجود فی الخارج حقیقی مادّی صفات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر خارجی دُنیا شکلِ امداد اور حرکت کی دُنیا ہے، رنگ و بُو کی دُنیا ذہن کی آفریدہ ہے لیکن برکلے نے دلایلِ قاطعہ کی رُو سے جو چیز ثابت کر دکھائی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ جو دلیل لاک کو اس امر کا یقین دلاتی ہے کہ رنگ و بُو وغیرہ حقیقی صفات نہیں جو مادّی اشیا میں پائی جائیں وہ صرف یہ ہے کہ نفسِ مدرک کے تغیر کے ساتھ یہ بھی بدلتی جاتی ہیں (دلیلِ اضافیت)؛ لیکن امتداد صلابت حرکت وغیرہ بھی اسی طرح قابلِ تغیر ہیں، لہٰذا یہ بھی رنگ و بُو کی طرح ذہن کے تصورات ہیں۔ ایک لفظ میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ صفات اشیاء کے ایک مجموعے اور دوسرے مجموعے میں امتیاز کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ برکلے کی منطق ناقابلِ تردید ہے۔

لیکن خود برکلے اس استدلالِ اضافیت پر زیادہ زور نہیں دیتا اور نہ ہی اس کی اتنی اہمیت مانتا ہے[2]۔ وہ ایک دوسری دلیل زیادہ اہم اور زیادہ بنیادی اس یقین کے ثبوت میں پیش کرتا ہے کہ اشیاء و صفات جن کو ہم براہِ راست دیکھتے، چھوتے، اور محسوس کرتے ہیں ذہن سے غیر محتاج اور مستقل طور پر نہیں پائی جاتیں۔ اس دلیل کی ساری بنیاد تامّل یا مطالعۂ باطن پر مبنی ہے۔ مختصراً وہ اس طرح ادا کی جا سکتی ہے: جب میں اپنے آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ ادراک کرتے وقت مجھے کس چیز کا براہِ راست اور بدیہی طور پر یقین ہوتا ہے تو ظاہر ہوتا ہے کہ مجھے بدیہی طور پر یہ یقین حاصل ہے کہ مجھے ایک نہ ایک طرح پر شعور ہو رہا ہے۔ مثلاً جب میں یہ کہتا ہوں کہ مجھے ایک گلِ سُرخ کے وجود کا براہِ راست یقین حاصل ہے تو ٹھیک وہ کیا شئے ہے

---

[1] دیکھو مکالمات مترجمہ عبدالماجد صفحہ (۴۳) سطر (۲۴)۔

[2] دیکھو مبادیٔ علم انسانی بند (۱۵)۔

جس کا بداہتہً مجھے یقین ہے؟ مجھے یقین ہے کہ مجھے سُرخی، سبزی، خوش بُو، سردی، حاریّت کے حسی تجربات ہو رہے ہیں۔ میرے حسی تجربات کے اس مرکب واقعہ کے علاوہ شئے میں کوئی اور چیز مطلق نہیں جس کا مجھے یقین ہو۔ شاید مجھے اس سے زیادہ کا بھی یقین ہوتا ہے لیکن میرے یہ دوسرے تیقنات، اگر وہ وجود رکھتے ہوں تو اس بدیہی یقین کے محض استنتاجات ہیں اس طرح ہر شخص اپنے شعور کی طرف رجوع کر کے یہ ثابت کر سکتا ہے کہ خارجی شئے جہاں تک کہ اس کا براہِ راست علم ہوتا ہے شعور کی ایک کیفیت ہے اور اس سے مستقل و غیر محتاج طور پر نہیں پائی جاتی۔ لہٰذا شئے ایک تصور ہے۔ خود برکلے کے الفاظ یہ ہیں: "یہ ایک عجیب رائے عوام الناس میں پائی جاتی ہے کہ مکان، پہاڑ، دریا، بہ الفاظِ مختصر تمام اشیائے محسوسہ اپنے وجود میں، خواہ یہ فطری ہو یا حقیقی، ادراک یا فہم کے محتاج نہیں لیکن کتنے ہی یقین کے ساتھ یہ اصول کیوں نہ مانا جائے اور اس کی اتباع کیوں نہ کی جائے۔ . . . جو شخص بھی اس پر اعتراض کرنے کی جرات رکھتا ہو . . . . وہ اس میں ایک بدیہی تناقض ضرور پائے گا کیوں کہ مذکورۂ بالا اشیاء وہی چیزیں تو ہیں جن کا ہمیں حواس کے ذریعے ادراک ہوتا ہے، اور ہمیں سوائے اپنے تصورات و حسیات کے ادراک کس چیز کا ہوتا ہے؟ اور کیا یہ ایک متضاد سی بات نہیں کہ ان میں سے کوئی ایک یا ان کا کوئی ایک مجموعہ بغیر محسوس ہونے کے پایا بھی جائے۔"

Esse est percipi

غرض برکلے نے دو دلایل (اضافیت، ومطالعۂ باطن) کی رو سے یہ ثابت کر دکھلایا کہ ہر شئے کی ماہیت وہی ہے جو تصور کی ماہیت ہے، وجودِ اشیاء مدرکیت اشیاء کے برابر ہے حقیقت مشتمل ہے نفوسِ مُدرِکہ اور ادراکات پر، فکر و مفکر پر۔

یہاں پر معترض کے ذہن میں برکلے کے اس نظریے پر چند سنگین اعتراضات پیدا ہوتے ہیں۔ برکلے ان میں سے بعض کا خود اپنی کتابوں میں ذکر کرتا ہے، ان میں سے ایک یہاں قابلِ ذکر ہے۔ وہ اعتراض یہ ہے کہ برکلے کی تصوریت حقیقت و التباس کے فرق کو

لے۔ دیکھو میری کالکنس کی کتاب "دی پرسسٹنٹ پرابلمز آف فلاسفی" صفحہ (۱۲۳)۔

لے۔ مبادیٔ علمِ انسانی، بند (۴)۔

مٹا دیتی ہے۔ پہاڑوں، چٹانوں اور سمندروں کی حقیقی اور ٹھوس دُنیا برکلے کے اصول کی رو سے محض ایک التباس یا گریزپا، غیر حقیقی مظاہر کا ایک سلسلہ قرار پاتا ہے۔ کیا ایک حقیقی اشرفی اور محض خیالی اشرفی میں کوئی فرق نہیں؟ چُونے اور گچ کے قلعے اور ہوائی قلعے میں کوئی امتیاز نہیں؟ برکلے کے قول کی رو سے تو حقیقی اشرفی اور چُونے اور گچ کا قلعہ محض تصورات ہیں جن کا خارج میں ذہن سے مستقل کوئی وجود نہیں! پھر ہمارے تجربے کے اس فرق و امتیاز کی توجیہ؟

اسی اعتراض کو برکلے اپنی زبان میں اس طرح ادا کرتا ہے: "اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ مذکورہ بالا اصول کی رو سے فطرت میں جو بھی حقیقی و صحیح شئے ہے وہ دُنیا سے غائب ہو جاتی ہے اور اس کی بجائے تصورات کا ایک وہمی نظام پیدا ہو جاتا ہے۔ جو چیزیں وجود رکھتی ہیں صرف ذہن میں ہیں ..... تو پھر چاند، سورج اور ستاروں کا کیا حال ہوا؟ تو پھر مکانوں، پہاڑوں، دریاؤں اور پتھروں اور خود ہمارے جسموں کے متعلق ہم کیا خیال کریں؟ کیا یہ سب محض اضغاث احلام یا واہمہ کے التباسات ہیں؟ ان کا اور ان کے مماثل تمام اعتراضات کا میں یہ جواب دیتا ہوں، ..... کہ جن چیزوں کو ہم دیکھتے، سُنتے، چھُوتے یا کسی اور طریقے سے ان کا تعقل کرتے ہیں وہ ویسی ہی محفوظ رہتی ہیں جیسی وہ پہلے تھیں اور اتنی ہی حقیقی ....

جن چیزوں کو میں اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں اور اپنے ہاتھوں سے چھُوتا ہوں ان کا وجود حقیقی طور پر پایا جاتا ہے اور ان کے متعلق مجھے کوئی شبہ نہیں"۔[۱]

برکلے بتلاتا ہے کہ وہ 'حقیقت' اور 'التباس' میں آخر کیا فرق سمجھتا ہے۔ اس کو اس امر پر اصرار ہے کہ جن اشیاء کو ہم بدیہی طور پر دیکھتے ہیں اور چھُوتے ہیں حقیقی ہونے کے باوجود 'تصورات' ضرور ہیں۔ "حقیقی اشیاء" (یعنے وہ تصورات جو ہمارے حواس پر مرتسم ہوتے ہیں) اور محض تخیل کے "تصورات" (التباسات) میں دوگونہ فرق ہے۔

(۱) حقیقت یا حقیقی اشیاء (یعنے وہ تصورات جو ہمارے حواس پر مرتسم ہوتے ہیں) میرے

---

[۱] ۔ مبادیٔ علمِ انسانی، بند (۳۴ و ۳۵)۔

"ارادے کے تابع اور محتاج نہیں ہوتے"، یہ ذہن یا تخیل کے پیدا کردہ تصورات سے زیادہ واضح، قوی، و ممیز ہوتے ہیں، اور ان میں زیادہ ترتیب و نظم ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اشیائے محسوسہ کی حقیقت اس امر پر مشتمل نہیں کہ وہ ذہن سے غیر محتاج اور مستقل طور پر پائے جاتے ہیں، بلکہ اس امر پر کہ یہ ایسے "تصورات" ہیں جن میں زیادہ وضاحت اور ترتیب و نظم پائے جاتے ہیں اور وہ میرے ارادے کے تابع نہیں۔

(ii) دوسرا فرق یہ ہے کہ حقیقی اشیاء (تصورات حواس) کسی منفرد، محدود ذات کے تصورات نہیں بلکہ ایک روح لامتناہی، خدا کے تصورات ہیں۔ چونکہ یہ میرے ارادے کے تابع نہیں اور خارج سے مجھ پر وارد و عاید ہوتے ہیں لہٰذا وہ میرے تخیل کے پیدا کردہ نہیں ہو سکتے اور نہ ہی کسی جوہر مادی کے پیدا کردہ (کیوں کہ اس کا سرے سے وجود ہی نہیں پایا جاتا) لہٰذا یہ ایک روحِ فعال کے پیدا کردہ ہیں جو ہم سے خارج میں موجود ہیں۔ بقول برکلے:

> "وجود صرف اشیائے محسوسہ و اشیائے حاسہ کا ہے .... ہر غیر ذی فکر وجود ضروری طور پر اور اپنی ماہیت ہی کے لحاظ سے کسی ذہن سے محسوس ہوتا ہے؛ اگر کسی متناہی و مخلوق ذہن سے نہیں تو یقیناً خدا کے لامتناہی ذہن سے جس میں ہم جیتے بستے ہیں۔"[1]

برکلے اگر خدا کے وجود کو ثابت کر دکھائے تو کہا جا سکتا ہے کہ حقیقی اشیاء کا تمثالاتِ ذہنی سے اسی وجہ سے امتیاز کیا جا سکتا ہے کہ اوّل الذکر اولاً خدا کے ذہن میں پائی جاتی ہیں۔ بہر حال ان کا غیر ارادی ہونا، ان کی ترتیب و نظم، ان کو بہ مقابلہ تصوراتِ تخیل ایک قسم کی مخصوص حقیقت ضرور بخشتی ہے اور ان کی یہ خصوصیت انھیں التباس سے ممیز کرنے کافی ہے۔

معترض ایک دوسرا اہم اعتراض پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ جو اشیاء ہمیں براہِ راست محسوس ہوتی ہیں "تصورات" ہیں تو کیا یہ فرض نہیں کیا جا سکتا کہ عالم اشیاء کا وجود ہو، یہ وجود ذہن سے مستقل و غیر محتاج ہو لیکن یہ ہمارے ادراکات یا تصورات کے

---

[1] مکالمات (انگریزی صفحہ ۹۰)۔

بالکلیہ مشابہ ہو اور اس کے وجود تک ہم بدیہی ادراک کے ذریعے نہیں بلکہ انتاج کے ذریعے پہنچتے ہوں؟ اگر یہ امکان صحیح ہو تو پھر صورتِ حال یہ ہو گی: ایک حقیقی عالم پایا جاتا ہے جو باوجود غیر مدرَک و غیر محسوس ہونے کے رنگ و بُو وامتداد رکھتا ہے، اور ہمارے ادراکات و تصوّرات اس حقیقی عالم کی حقیقی اشیاء کی محض نقلیں ہیں۔ یعنے جو اشیاء ہمیں براہِ راست بدیہی طور پر محسوس ہوتی ہیں وہ بے شک تصورات ہیں، اپنے وجود میں ذہن سے مستقل و غیر محتاج نہیں، لیکن یہ محض نقول ہیں ان اشیاء کی جو موجود بالذات ہیں یعنے اپنے وجود میں ذہن کے محتاج نہیں اور جو رنگ و بُو وامتداد وغیرہ رکھتی ہیں اور جن کا وجود بذریعۂ انتاج اخذ کیا جا سکتا ہے۔

اس نظریے کے خلاف برکلے کے دو سخت اعتراضات ہیں:-

(ا) اگر ہم یہ مان لیں کہ تصوّرات کے مثل و مشابہ موجوداتِ خارجی پائے جاتے ہیں تو ہمیں ایک نئی مشکل کا سامنا ہوتا ہے۔ ہمارے تصورات کے متعلق تو سبھوں کو اتفاق ہے کہ یہ تغیر و تبدل پذیر ہیں۔ اب اگر ہمارے تصوّرات موجوداتِ خارجی کے بالکل مشابہ ہیں تو یہ لازم آتا ہے کہ موجوداتِ خارجی ہمارے کئی ایک مختلف و متضاد تصوّرات کے بالکل مشابہ ہوں گے۔ ان کا ماننا تو بیہودگی ہو گی۔ مثال پر غور کرو۔ حقیقی ٹمپریچر تو وقتِ واحد میں سرد اور گرم نہیں ہو سکتا، وہ یا تو سرد ہو گا یا گرم، لیکن ایک شخص کے لیے یہ کمرہ سرد ہو سکتا ہے اور دوسرے کے لیے گرم۔ فلونیس اسی خیال کو اس طرح ادا کرتا ہے:-

"کیا یہ ممکن ہے کہ تصورات جیسی متلون و تغیر پذیر چیزیں نقل یا عکس ہوں مستقل و قایم بالذات چیزوں کی؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اعراضِ محسوسہ قد و قامت، شکل و رنگ وغیرہ جو تمامتر اضافی و اعتباری ہوتے ہیں اور جن میں اختلافِ حالات کے ساتھ ہر لحظہ و ہر آن تغیر ہوتا رہتا ہے، وہ صحیح تصویر ہو سکیں ان موجوداتِ خارجی کی جن کا وجود بالکل مستقل و قایم بالذات ہوتا ہے[1]"

---

[1] مکالمات، مترجمہ عبدالماجد صفحہ (۵۶)۔

(ii) دوسرا اعتراض اور زیادہ اہم ہے۔ ذہن سے مستقل و غیر محتاج حقیقت کسی معنے میں اسی شئے کے مشابہ نہیں ہوسکتی جو اپنی باطنی ماہیت کے لحاظ سے ذہنی ہو یا جو شعور کی ماہیت رکھتی ہو۔ "مادّی شئے" سے مُراد وہ ہے جو ضد ہو ذہنی شئے کی۔ لہذا کوئی مادّی شئے کسی تصوّر کے مشابہ نہیں ہوسکتی۔ معترض کو اس سوال کا جواب دینا پڑتا ہے کہ:۔

"کیا یہ ممکن ہے کہ کسی غیر مُدرَک اصل کی نقل مُدرَک ہو؟ کیا یہ ممکن ہے کہ رنگ نقل ہو کسی غیر مرئی اصل کی؟ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی حس یا تصوّر بجز حس یا تصوّر کے کسی اور شئے کی نقل ہوسکے؟"[1]

ان اعتراضات کی بنا پر برکلے کہتا ہے کہ ایسی مادّی دُنیا کا ماننا جو ہمارے تصوّرات کے مشابہ ہو صحیح نہیں ہوسکتا۔ مادّہ یعنے وہ جو ہر جو ذہن سے غیر محتاج و مستقل طور پر پایا جاتا ہے اور جو اپنی ماہیت میں ذہن سے بالکلیہ مختلف ہے وجود نہیں رکھتا، یہ ایک تجرید محض ہے۔

برکلے کے نظریۂ تصوّریت کے خلاف معترض ایک اور اعتراض پیش کرتا ہے۔ مانا کہ ایسی مادّی حقیقت جو ہمارے تصوّرات کے بالکل مشابہ و مماثل ہو نہیں پائی جاسکتی لیکن بہر صورت یہ ممکن ہے کہ ایسی مادّی حقیقت کا تو وجود ہو گو یہ ہمارے تصوّرات کے مماثل نہ سہی۔ یعنے جب تصوّرات کے مماثل مادّی حقیقت کے ماننے میں مشکلات کا سامنا ہوتا ہے تو پھر ایسی حقیقت کو تو مانا جاسکتا ہے جو ہمارے تصوّرات کے مماثل و مشابہ نہیں لیکن ان کی علت ہے یا ان کے ہم میں پیدا کرنے کا باعث ہے۔ کیونکہ یہ تو ہم اوپر مان آئے ہیں کہ تصوّرات کی دو قسمیں ہوتی ہیں، تصوّرات حواس اور تصوّرات تخیل۔ تصوّرات حواس ہمارے ذہن کے پیدا کردہ نہیں بلکہ خارج سے ہم پر وارد ہوتے ہیں۔ اب خارج میں کوئی ایسی حقیقت ہونی چاہیئے جو ان تصوّرات کا مبدء ہو اور یہ حقیقت ہمارے ذہن سے مستقل اور غیر محتاج ہوگی۔ کیا اسی حقیقت کو مادّہ نہیں کہا جاسکتا؟[2]

---

[1] مکالمات، مترجمہ عبدالماجد، صفحہ (۵۶ و ۵۷)۔

[2] " " دوم " " ۔

بارکلے اس کے جواب میں کہتا ہے کہ بے شک ہمارے تصوّرات حواس کی ایک خارجی علت ضرور ہونی چاہیئے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ یہ علت صرف مادّہ ہی ہو۔ انسان کے محدود ذہن پر ان تصوّراتِ حواس کے ارتسام کی علت ایک نامتناہی روح بھی ہوسکتی ہے۔ علاوہ ازیں مادّہ اپنی ماہیت ہی کے لحاظ سے کسی شئے کی علت ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ مادّہ ایک منفعل غیر شاغل، جامد، عدیم الحرکت جوہر مانا جاتا ہے۔ "جو شئے عدیم الحرکت ہو وہ علت کیسی ہوسکتی ہے؟ اور اور جو غیر ذی فکر ہو فکر کی کیسی علت بن سکتی ہے؟" گویا مادّے کے علت ہونے کے خلاف برکلے دو دلایل پیش کرتا ہے: (۱) منفعل و عدیم الحرکت ہونے کی وجہ سے مادّہ علت نہیں ہوسکتا؛ اور (۲) اگر فاعل بھی ہو اور اس وجہ سے علت ہو تو غیر ذی فکر ہونے کی وجہ سے وہ فکر کی علت نہیں ہوسکتا۔

جیسا کہ پروفیسر کالکنس[1] نے بتلایا ہے کہ بارکلے کے یہ دونوں دلایل کمزور ہیں، لیکن بارکلے اپنے دعوے کے ثبوت میں ان ہی دلایل کا محتاج نہ تھا۔ دوسری دلیل پر پہلے غور کرو۔ یہ مان لیا جاسکتا ہے کہ مادّہ غیر ذی فکر یا غیر شعوری ہے۔ تعریف ہی کی رو سے مادّہ وہ ہے جو شعور نہیں لیکن یہ امر بدیہی نہیں کہ غیر ذی شعور ہستی شعور کے مظاہر کی علت نہیں ہوسکتی۔ علت و معلول کے باہمی ربط کے متعلق ہمارا علم اس قدر کم ہے کہ ہم ادعائیت کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ دونوں ایک ہی نوعیت کے ہونے چاہئیں علیت کے جو واقعات زیرِ مشاہدہ آتے ہیں ان میں تو علت و معلول کا فرق نہایت نمایاں ہوتا ہے، جیسے برقی عمل عضویاتی معلولات پیدا کرتے ہیں۔ برکلے اپنے اس دعوے کی کوئی دلیل پیش نہیں کرتا کہ غیر شعوری شئے شعور کی علت نہیں ہوسکتی۔ یہ محض ایک ادعا ہے جس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا، لہذا پاک باز بارکلے سے مادّیت کا حامی کہہ سکتا ہے کہ:۔ ع

اے شیخ پاک دامن معذور دار مارا

اب ہمیں مجبوراً دوسری عام دلیل کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے کہ مادّہ منفعل و جامد

---

[1] دیکھو کالکنس کی محولۂ بالا کتاب صفحہ (۱۲۹ وغیرہ)۔

ہونے کی وجہ سے کسی چیز کی علت نہیں ہو سکتا۔ یہ تو صحیح ہے کہ علت کا فاعل ہونا، یا اس میں فعلیت کا پایا جانا عام طور پر مانا جاتا ہے اور اگر مادہ غیر فاعل ہو تو وہ علت بھی نہیں ہو سکتا لیکن اعتراض یہ ہوتا ہے کہ برکلے کو بغیر حجت و دلیل کے یہ فرض کر لینے کا کوئی حق نہیں کہ مادہ عدیم الحرکت، جامد، اور منفعل ہے۔ سائنس کی جدید تحقیقات تو یہ بتلا رہی ہیں کہ خارجی حقیقت کوئی جامد مادہ نہیں بلکہ توانائی ہے اور یہ کوئی عدیم الحرکت و منفعل شئے نہیں۔

اس اعتراض کی صداقت ماننی پڑتی ہے لیکن دیکھو برکلے کے اصول پر، بغیر مادے کے جمود کی دلیل استعمال کیے برکلے کی ایک شاگرد، مریم کالکنس[1]، تصوریت کی کس طرح حمایت کرتی ہے۔ جدید سائنس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ "توانائی" (انرجی) کا مفہوم یا تو حرکت (توانائی بالفعل) لیا جاتا ہے، یا "حرکت کی کوئی ناقابل تحویل علت" یا محض "وہ شئے جس کی صورتیں تو متغیر ہوتی ہیں لیکن جس کی کمیت میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔"

توانائی کے ان تینوں مفاہیم کے خلاف برکلے کی اصولی دلیل پیش کی جا سکتی ہے۔ اگر توانائی کا مفہوم حرکت ہے تو آپ نے اوپر دیکھ ہی لیا ہے کہ حرکت حسی عارضہ ہونے کی وجہ سے اپنے وجود میں ذہن کی محتاج ہے؛ اور اگر اس کا مفہوم حرکت کی علت ہے یا ایک "مستقل کمیت" ہے تو یہ ایک منتجہ حقیقت ہو گی جس کی ماہیت کا کوئی تعین نہیں ہو سکتا۔ برکلے اوپر بتا چکا ہے کہ ہم کسی محسوس شئے کا شعور سے خارج میں ادراک نہیں کر سکتے؛ ہر محسوس شئے ذہن کا ایک تصور ہے؛ توانائی بحیثیت علت حرکت وغیرہ ایک محسوس شئے نہیں بلکہ ایک منتج شئے ہے (جس کا انتاج حرکت کی علت کی حیثیت سے کیا جا رہا ہے)۔ اب ہمارے انتاج کا معروض خود ایک تصور یا معروضِ شعور یا واقعۂ ذہنی ہو گا۔ اس طرح توانائی کے یہ دونوں مفہوم بھی مفہوم اوّل کی طرح ذہنی ہوں گے یعنے تصور جس کا شعور سے مستقل کوئی وجود نہیں۔ لہٰذا مادہ تصورات کی علت کی حیثیت سے خواہ وہ فعّال سمجھا جائے یا غیر فعّال محض ایک منتجہ شئے یا انتاج کا معروض ہے اس لیے برکلے کے الفاظ میں وہ تصور ہے۔

---

[1] دیکھو کالکنس کی محولہ بالا کتاب صفحہ (۱۲۹، پانچواں یڈیشن)۔

بارکلے پر اعتراض کرنے والوں کے ہاں ایک اور آخری اعتراض رہ جاتا ہے یہیں اس کی بھی تفصیل بیان کرنی ضروری ہے۔ بارکلے نے اس اعتراض کا جو جواب دیا ہے اگر کانٹ اس پر سنجیدگی سے غور کرتا تو کہا جاتا ہے کہ وہ "شئے کماہی" کا نظریہ پیش نہ کرتا۔

معترض کہتا ہے کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ہمارے ادراکات کی علت مادی نہیں ہوسکتی، بہ الفاظِ دیگر، شعور سے غیر محتاج نہیں ہوسکتی، تب بھی یہ ایک آخری امکان رہ جاتا ہے کہ مادے کا بالکل سلبی طریقے پر تصور کیا جا کر اس کو موجود فی الخارج مانا جائے۔ مادے کے سلبی تصور سے کیا مراد ہے؟ ہم نے اوپر دیکھا کہ رنگ و بو وغیرہ حتےٰ کہ صورت و حرکت بھی شعوری دُنیا میں پائی جاتی ہے، اس سے مستقل و غیر محتاج طور پر نہیں پائی جاتی، علیت بھی ذہنی ہے، مادی نہیں۔ اب اگر مادے کا وجود فرض کیا جائے تو یہ مادہ تمام ایجابی صفات سے محروم ہوگا، یعنے نہ اس میں رنگ و بُو ہوگی، نہ اس کی شکل و صورت ہوگی، نہ حرکت اور نہ یہ کسی شئے کی علت ہوگا۔ تاہم تصوریت کے مخالفین کا دعوےٰ ہے کہ کسی ایسی غیر معلوم حقیقت کے وجود کا انکار نہیں کیا جا سکتا جو شعور سے غیر محتاج طور پر پائی جاتی ہو۔

اوپر توانائی کے ضمن میں جو حُجت مُنتجہ حقیقت کے خلاف پیش کی گئی وہ اس غیر معلوم حقیقت کے خلاف بھی پیش کی جا سکتی ہے "جو نہ جوہر ہے نہ عارضہ، نہ ذی فکر شئے ہے نہ ممتد شئے، نہ علت ہے نہ آلہ نہ موقع بلکہ ایک بالکل نامعلوم شئے"۔ بہ حیثیت ایک مُنتجہ حقیقت ہونے کے اس کو ذہنی ہونا چاہیئے۔ لیکن برکلے اس کی تردید میں یہ دلیل پیش نہیں کرتا، وہ دو اور اعتراضات اٹھاتا ہے۔

(۱) وہ کہتا ہے کہ جن فلاسفہ نے مادے کا یہ تصور پیش کیا ہے خود انھوں نے کبھی توافق کے ساتھ اس کو مانا نہیں۔ یعنے اس دعوے کے باوجود کہ ایک مطلقاً غیر معلوم حقیقت کا وجود پایا جاتا ہے، ان فلاسفہ نے اس حقیقت کے متعلق کچھ نہ کچھ علم ضرور فرض کیا ہے۔ ان کے نزدیک مادہ بالآخر معروضِ علم قرار پاتا ہے اور معروضِ علم بارکلے ثابت کرچکا ہے ذہنی شئے ہے۔

بارکلے کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ کسی فلسفی نے مادے کو توافق کے ساتھ بالکل غیر معلوم

حقیقت قرار نہیں دیا بلکہ ہر ایک نے اس کے متعلق کسی نہ کسی قدر علم کا دعوےٰ ضرور کیا ہے۔ ایک تازہ مثال کے طور پر ہربرٹ اسپنسر کو لو۔ وہ انتہائی حقیقت کے ناقابل علم ہونے کی تعلیم دیتا ہے، تاہم وہ اسی ناقابل علم حقیقت کو "علتِ آخری" اور "ساری اشیاء کا مبدء" قرار دیتا ہے۔ اس کے معنے تو یہی ہوئے کہ اسپنسر کو اس کے متعلق اتنا تو علم ہے کہ یہ اشیاء کی علت ہے۔

(۲) اب اگر سنجیدگی کے ساتھ یہ مان لیا جائے کہ مادے کا ہمیں مطلقاً کوئی علم نہیں اور یہ تمام ایجابی صفات سے محروم ہے تو پھر بارکلے بتلاتا ہے کہ یہ مفروضہ محض الفاظ کا مجموعہ بن جاتا ہے جو شرمندۂ معنے نہیں ہوتا۔ ایسی شئے، جو نہ مدرک ہے نہ مدرِک، جو نہ امتداد رکھتی ہے اور نہ رنگ و بو، نہ ہی کوئی صفاتِ حسیہ، جو نہ فعال ہے نہ غیر فعال، علت ہے نہ معلول، "جس کے صاف و واضح کیا معنے بلکہ جس کا کوئی دھندلا سا تصور بھی ذہن میں نہیں پیدا ہوتا، تو کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ شئے موجود نہیں بلکہ یہ کہ آپ ایسا اسم بول رہے ہیں جس کا کوئی مسمّیٰ نہیں، ایک ایسا لفظ استعمال کر رہے ہیں جس کا نہ کوئی معنے ہے اور نہ مفہوم" بلکہ محض لفظی گورکھ دھندا ہے[۱]۔ بہ الفاظِ دیگر مادے کو غیر معلوم کہنا تضادِ لفظی کا مرتکب ہونا ہے، کیونکہ اگر درحقیقت وہ غیر معلوم ہے تو ہم یہ کہہ سکتے کہ یہ مادی یا غیر شعوری شئے ہے۔ ایسے فلسفے کی کھیتی تو پکتی نظر نہیں آتی۔ برکلے اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ "مادہ لاشئے ہے[۲]"۔

غرض یہ ہے کہ بارکلے کا سارا استدلال جس کی تفصیل میں ہم نے کسی قدر طوالت سے کام لیا۔ لیکن اس اہم استدلال کو پوری طرح ذہن نشین کرنے کے لئے یہ طوالت بھی دراصل اختصار ہی ہے طوالت نہیں۔ اب ہم اوپر کے بیان کی تلخیص ان چند لفظوں میں اس طرح پیش کر سکتے ہیں

(۱) دلیل اضافیت و دلیل مطالعۂ باطن کی رو سے بارکلے نے یہ ثابت کیا کہ جن اشیاء کا ہمیں براہ راست و بدیہی طور پر ادراک ہو رہا ہے وہ تصورات ہیں جو ذہن سے مستقل و غیر محتاج طور پر اپنا وجود نہیں رکھتے اس کے بعد اعتراضات کے جواب کی شکل میں اس نے مادے کے تین تعقلات کا امتحان کیا جن کی رو سے مادہ ایسی حقیقت ہے جس کا براہ راست ادراک تو نہیں ہو سکتا

---

[۱] مکالمات، مترجمۂ عبدالماجد صفحہ (۷۹ و ۸۰) [۲] مکالمات مترجمۂ عبدالماجد صفحہ (۷۹ و ۸۰)

لیکن بہ حیثیت حقیقت نتیجہ اس کا وجود مانا جاسکتا ہے۔ اس نے ثابت کیا کہ
(۲) مادی اشیاء کو تصورات کے مشابہ و مماثل موجودات نہیں مانا جاسکتا
(۳) دعوے کیا کہ مادہ بہ حیثیتِ علتِ تصورات حواس موجود نہیں مانا جاسکتا۔ برکلے کے اس دعوے کو اس کے اصولی استدلال کی بنا پر ثابت کیا جاسکتا ہے
(۴) ثابت کیا کہ کسی مطلقاً غیر معلوم مادی حقیقت کا وجود محض اختراعِ ذہنی ہے، محض لفظی گورکھ دھندا ہے۔

اس طرح برطانیہ عظمے کے اس لبیبِ اعظم نے، اپنے خیال میں، مادیت کے پرستاروں کو ہمیشہ کے لیے شکست دی۔ زمانۂ حال کے حقیقت پسند مفکرین نے ان بے بنیاد براہین کو کس طرح توڑا اس کا قصہ ہم تمہیں بعد میں چل کر سنائیں گے جو شاید تمہاری دلچسپی کا باعث ہوگا۔

بارکلے کے اس عظیم الشان استدلال کی تکمیل کے لیے ہمیں ایک بات کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ ہم نے اوپر دیکھا کہ حقیقت والتباس کا فرق بتلاتے ہوئے بارکلے نے تصوراتِ حواس (جن کو عام طور پر اشیائے خارجی کہا جاتا ہے) کی علت خدا یا روح نامتناہی کو قرار دیا تھا اور تصوراتِ تخیل کی علت محدود و متناہی ذات کو۔ اس طرح بارکلے کی تصوریت کی رو سے کائنات ارواح متناہیہ و روح نامتناہی پر مشتمل قرار پاتی ہے جس میں مادے کا سرے سے وجود نہیں۔ خدا کے وجود کو ماننے کی وجہ سے برکلے کی ذہنی تصوریت محض ایجابیت و اسمیت ہونے سے بچ جاتی ہے۔ اور ارواح متناہیہ کو تسلیم کرکے وہ ہمہ منم کا نظریہ نہیں بن جاتی۔ اب ہم نہایت اختصار کے ساتھ یہ بتلائیں گے کہ بارکلے وجود باری کا کیا ثبوت دیتا ہے۔

مبادی علم انسانی کے بند ۲۸-۲۹ میں بارکلے اس ثبوت کو پیش کرتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:-

مجھے اپنے تصوراتِ حواس کا براہِ راست و بدیہی طور پر ادراک و یقین ہوتا ہے۔ (یہ میری مرضی کے تابع نہیں، بلکہ میرے ارادے کے خلاف مجھ پر عاید ہوتے ہیں مثلاً جب میں دن میں آنکھیں کھولتا ہوں تو خواہی نخواہی مجھے چیزیں نظر آتی ہیں۔ لہذا تصورات کی ایک علت ہونی چاہیئے۔

تصوّراتِ حواس کی صرف تین علل ہو سکتی ہیں (۱) روح یا ارواح (۲) تصوّر (۳) مادّہ، لیکن بارکلے نے یہ ثابت کیا ہے کہ مادّے کا تو وجود ہی نہیں لہذا وہ تصوراتِ حواس کی علت نہیں ہو سکتا اور تصوّرات ایک دوسرے کی علت نہیں ہو سکتے کیونکہ بارکلے کی رائے میں یہ منفعل نہیں یعنے اپنے وجود میں کسی ذات کے علم کے محتاج ہیں، لہذا روح یا ارواح ہی تصوراتِ حواس کی علت ہو سکتی ہیں۔

اس نتیجے کی تائید مجھے اپنے اس بدیہی تجربے سے ہوتی ہے کہ میں روح ہونے کی حیثیت سے تصوّرات پیدا کر سکتا ہوں اور ان کی علت بن سکتا ہوں

لیکن مجھے اس کا پورا یقین ہے کہ میں بحیثیت روح ہونے کے تصوّراتِ حواس کی علت نہیں ہوں کیونکہ یہ میری مرضی کے خلاف مجھ پر عاید ہوتے ہیں

لہذا دوسری روح جو مجھ سے علیحدہ ہے ان کی علت ہونے کی حیثیت سے موجود ہونی چاہیئے اور اسی روح کو خدا کہتے ہیں۔ یہ روح خلاقِ ازلی و ابدی ہے کیونکہ اس کے سرمدی ہونے کی وجہ سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ کس طرح ارتسامات حواس کا وجود باقی رہ سکتا ہے اور کس طرح وہ تمام نفوس مدرکہ سے غیر محتاج ہے۔

بہرحال وجود باری کی دلیل بارکلے کے نزدیک یہی ہے کہ تصوّراتِ حواس جو میرے ذہن پر منقش ہوتے ہیں اور جو میرے ارادے کے محتاج نہیں ایک روح ازلی کے پیدا کردہ ہیں جو خدا ہے۔ تصوّراتِ حواس کی ماہیت پر غور کرنے سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ان میں ایک مقصد و غایت بھی پائی جاتی ہے لہذا ان کی پیدا کرنے والی روح بھی عقل و حکمت سے متصف ہو گی۔ اس طرح بارکلے ایک ہمہ داں ہمہ تواں یا قادرِ مطلق خدا کے وجود کو ثابت کرتا ہے اور اپنی تصوّریت کو اس نظریے سے دور رکھتا ہے جس کو اصطلاح میں "نظریۂ ہمہ منم"

کہا جاتا ہے (اور جس کی رو سے میں اور میرے تصورات کے سوا کسی کا سرے سے وجود ہی نہیں) بارکلے کی تصوریت ایک روحانی کثرتیت ہے جس کی رو سے کائنات خدا اور ارواحِ متناہیہ پر مشتمل ہے۔

میر ولی الدین

ام اے، پی ایچ، ڈی (لندن) بیرسٹرایٹ لا

چکبست کی قومی شاعری

کچھ اور ہے وہ شاعرِ معجز بیاں نہیں　　جس کے سخن سے رنگِ طبیعت عیاں نہیں

قومی شاعری کے معماروں میں چکبست کو خاص اہمیت حاصل ہے اگرچہ اُن کی ایک ایسے ماحول میں پرورش ہوئی جہاں گُل و بلبل کے لاطائل افسانے، حُسن و عشق کی ہرزہ سرائیاں، شاعرانہ تخیل کی فلک پیمائیاں، مئے دو آتشہ کی کیف سامانیاں، اور "جب جھم سے چلیں گودیں چپکے سے اُٹھا لو" کے بے کیف نغمے لحن داؤدی کی طرح وجد آفریں سمجھے جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی ابتدائی شاعری میں نرم و گرم غزلیں ملیں گی، جس میں آپ وہ خصوصیات پائیں گے جو میرؔ، مومنؔ اور غالبؔ کو متقدمین اور متاخرین سے ممتاز کرتی ہیں۔ تاہم جو سرمایہ بھی اُن کی یادگار ہے ناقابلِ اعتناء نہیں کہا جاسکتا، کیوں کہ وہ بالکلیہ قدیم اساتذۂ سخن کے تابع مہمل یا ضمیمہ ہو کر نہیں رہ گئے ہیں۔ اُن کی فطری جولانیاں اور رائج قدیم اسلوب میں بھی قابلِ لحاظ جدّت طرازی کی ضامن ہیں۔ خود کہتے ہیں :-

نیا مسلک نیا رنگِ سخن ایجاد کرتے ہیں　　عروسِ شعر کو ہم قید سے آزاد کرتے ہیں

اقبالؔ کے قومی ترانوں سے متاثر ہو کر ۱۹۰۵ء میں چکبست نے قومی شاعری کو اپنے

توسنِ طبع کی جولاں گاہ قرار دیا، لیکن اس کی نشو و نما اُس پُر آشوب زمانے میں ہوئی جب کہ جنگِ عظیم کی تباہ کاریوں کے باعث ربع مسکوں میں ہیجان اور انتشار پھیلا ہوا تھا اور دُنیا کے سیاسی نقشے سے اکثر ریاستیں غائب ہو رہی تھیں۔ ہندوستان بھی ان انقلابات سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اہلِ ہند میں ذہنی بیداری کی برقی لہریں دوڑ گئیں۔ اُن کے بے حس دلوں میں سیاسی آزادی کی ترنگ پیدا ہوئی اور وہ غلامی کی جکڑ بندیوں سے مخلصی پانے کے لیے اُس نو گرفتار پرندے کی طرح جدوجہد کرنے لگے جو غفلت سے اسیرِ دام ہو گیا ہو، چنانچہ تحریکِ ترکِ موالات، ہمہ اسلامیت، کانگرس، مُسلم لیگ، ہندو سبھا اور خلافت وغیرہ اسی انقلاب آفریں دور کی پیداوار ہیں۔ ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت کو پہلی مرتبہ اسی زمانے میں محسوس کیا گیا جس کو قومیت کا نقطۂ آغاز کہنا چاہیئے۔

چکبست کا کلام ان تمام تحریکوں اور قوتوں کا آئینہ دار ہے۔ کیوں کہ سچّا شاعر قوم کی آنکھ اور ترجمانِ حقیقت ہوتا ہے۔ وہ ماحول سے اکتسابِ الہام کرتا ہے۔ اُس کے جوش انگیز ترانے، نوجوان مُحبّانِ وطن میں سرفروشی، اور جاں بازی کے ولولے پیدا کرتے ہیں، اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ قومی شاعری ایک برقی رو ہے جو مُردہ جذبات کو گرماتی ہے۔ سوئے احساس کو جگاتی ہے۔ احساسِ پستی کو مٹاتی ہے، رگِ حمیت کو جوش میں لاتی ہے اور مُلک کے ہونہاروں کے قلوب میں عزتِ نفس، خود اعتمادی اور حبُ الوطنی کے بیج بوتی ہے۔

چکبست نے محسوس کیا کہ قوم میں احساسِ آزادی پیدا کرنے اور اُس کو غلامی کی ذلت سے باہر نکالنے کا شاعری سے بہتر کوئی اور آلہ نہیں ہے' اور اُن کا یہ خیال گندم نما جو فروش رہنمایانِ مِلت کے عزایم کی طرح خیال ہی تک محدود نہیں رہا۔ اس لیے کہ بے لوث جذبات دل کی چار دیواری میں محبوس نہیں رہتے۔ اگرچہ زمانہ استبدادیت پسند تھا۔ ساری آزادیاں مقراضِ احتساب میں تھیں۔ بڑے بڑے وطن پرست، سوسن کی طرح لبِ گفتار سے محروم تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کسی باکمال بُت تراش نے اپنی تمام صنعت کارانہ قابلیتوں کو ہزار گونہ سخن در دہان و

لب خاموش" کی تصویری تعبیر میں بہ احسن الوجوہ صرف کیا ہے۔ ایسی صورت میں بے چارہ شاعر کس شمار و قطار میں آسکتا ہے۔ مگر خاکسارانِ جہاں کو حقارت سے نہیں دیکھنا چاہیئے۔ آگ کی ذرا سی چنگاری، گو بہ ظاہر معمولی و حقیر سہی، لیکن اُس میں وہ ساری غضب ناک قوتیں مستور ہوتی ہیں جو چشم زدن میں خس و خاشاک کے بلند و بالا ڈھیر کو جلا کر خاکستر کر سکتی ہیں۔ شاعر کے کلام کو بھی قدرت نے وہ سوز و گداز اور سحر آفرینی بخشی ہے جس سے قوم کے اُجڑے ہوئے چمن میں بہار آتی ہے اور اپنی ساری رعنائیوں اور کیف سامانیوں سے اُس کو جنت نظر بناتی ہے۔ البتہ وقت کی نزاکت مقتضی تھی کہ بے پناہ جذبات کو تلمیح اور استعارے کے پردے میں ہمدردانِ قوم تک پہنچایا جائے۔ مولانا حالی کا یہی اصول تھا۔ چکبست نے بھی اسی طریقے کو پیشِ نظر رکھا۔ ذیل کے اشعار کو اسی اصول کی صدائے بازگشت کہنا چاہیئے جس میں شاعر نے زبان بندی کے حکم کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس لطیف پیرائے میں کہ اس سے بہتر حُسنِ بیان کا طریقہ شاید ہی ہو ؎

حکم مالی کا یہ ہے پھول نہ ہنسنے پائیں ~~~ چُپ رہے باغ میں کوئل اگر آزاد رہے
ہوائے شوق میں غنچے بکس نہیں سکتے ~~~ ہمارے پھول بھی چاہیں تو ہنس نہیں سکتے

اس کی وجہ بھی سُن لیجیے ؎

جو آج کل ہے محبت وطن کی عالمگیر ~~~ یہی گنہ ہے، یہی جرم ہے، یہی تقصیر
زباں ہے بند قلم کو پہنائی ہے زنجیر ~~~ بیانِ درد کی باقی نہیں کوئی تدبیر

ہے دل میں درد مگر طاقت کلام نہیں
لگے ہیں زخم تڑپنے کا انتظام نہیں

چکبست اپنے ہموطنوں کی بے بسی اور بے چارگی سے ناواقف نہ تھے، لیکن اُن کو حیرت تھی کہ وہ باعظمت اور الوالعزم قوم جو چار دانگِ عالم میں کوس لمن الملکی بجا رہی تھی جس کی طاقت و قوت کی قہرمانی سے ایک دُنیا لرزہ بر اندام تھی، فلک سفلہ پرور کی ایک ہی گردش میں اپنے تمام صفاتِ عالیہ سے کچھ اس طرح محروم ہو گئی کہ گویا اُس کا اپنا تابناک ماضی ہی نہ تھا۔ یہ انقلاب حیرت افروز بھی تھا اور اندوہ فزا بھی۔ دیکھیے کس مایوسانہ انداز میں بے بسی کا اظہار کیا ہے ؎

یہ کیسی بزم ہے اور کیسے اس کے ساقی ہیں — شراب ہاتھ میں ہے اور پلا نہیں سکتے
یہ بے کسی بھی عجب بے کسی ہے دُنیا میں — کوئی ستائے ہمیں، ہم ستا نہیں سکتے

مگر "آزادی" ایسا لفظ نہیں جو شرمندۂ معنے نہ ہوا ہو۔ یہ وہ نقشِ سلیمانی ہے جو نفاق و افتراق کو مٹا کر اتحاد و یکجہتی کی طرح ڈالتا ہے۔ ڈھئی ہوئی ہمتوں کو اُکساتا ہے اور خوابیدہ آرزوؤں کو جگاتا ہے۔ یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے۔ قفس کی تیلیاں مقید پرندوں کو نہیں بھاتیں محکوم قوم کے پہلو میں بھی دل ہوتا ہے، اور دل پیالہ و ساغر نہیں، بلکہ بے شمار اُمنگوں کا گنجینہ ہے۔ کیا وہ اغیار کی دراز دستیوں اور روح فرسا ستم آرائوں کے آگے سرِ اطاعت خم کر دے گی؟ مثل مشہور ہے "تنگ آمد بہ جنگ آمد" پیہم مصیبتیں انسان کو دلیر اور جانباز بنا دیتی ہیں۔ زبان بندی قوم کے سچے پرستاروں کے لیے حوصلہ شکن نہیں ہوتی اور نہ اُن کے پائے استقلال کی لغزش کا باعث ہوتی ہے۔ اس لیے کہ زندان کی بلند و بالا دیواریں، حلقۂ زنجیر کی جکڑ بندیاں اور دار و رسن کی مضبوط بندشیں پیکرِ آب و گِل کو مقید کر سکتی ہیں، لیکن دُنیا کی کوئی طاقت خیال کی پہنائی کو محیط نہیں کر سکتی۔ روح کے ولولے ہمیشہ آزاد ہی رہتے ہیں، مگر یاد رہے کہ انفرادی اور اجتماعی ہر دو صورتوں میں کامیابی سے ہمکنار ہونے کے لیے استقلال ضروری ہے کیوں کہ لاجنب ارادے اور اٹل منصوبے ہی پایان کار صورت پذیر ہوتے ہیں، بہ قول اقبالؔ ؎

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم — جہادِ زندگانی میں ہیں مردوں کی شمشیریں

شاعر، قوم کا سچا بہی خواہ اور بے لوث نمایندہ ہے۔ اُس کی آواز قوم کی آواز ہے۔ انقلاب آفرینی اُس کا ادنیٰ کرشمہ ہے جس کے ثبوت میں مغربی قوموں کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ جذباتِ حریت کے تلاطم نے چکبستؔ کے دل کو سیمابی کیفیات سے معمور کر دیا تھا جس کو وہ سینہ چیر کر وقفِ تماشا کرنا چاہتے تھے۔ اس پر سیاسی ہنگامہ آرائیوں نے جلتی ہوئی آگ پر تیل کا کام کیا اور ابھی سرمدی نیند کے متوالے حالیؔ کی پیہم تلخ نوائیوں سے خواب و بیداری کے سے عالم میں تھے کہ چکبستؔ کی یہ جرأت آفریں صدا سامعہ نواز ہوئی ؎

زباں کو بند کریں، یا مجھے اسیر کریں — مرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے

اب ذرا اُس وارفتۂ آزادی چکبستؔ کی تصویر دیکھیے جو ہر قسم کے مصائب اور تکالیف کو

خندہ پیشانی سے برداشت کرنے پر آمادہ ہوگیا تھا، اور جوش میں یہ پکار پکار کر کہہ رہا تھا

ہو چکی قوم کے ماتم میں بہت سینہ زنی　　اب ہو اس رنگ کا سنیاس یہ ہے دل میں ٹھنی
مادرِ ہند کی تصویر ہو سینے پہ بنی　　بیڑیاں پیر میں ہوں اور گلے میں کفنی
ہو یہ صورت سے عیاں عاشقِ آزادی ہیں
قفل ہے جس کی زباں پر یہ وہ فریادی ہیں

اور اپنے مستقل ارادے کو اس طرح سناتے ہیں ؎

آج سے شوقِ وفا کا یہی جوہر ہوگا　　فرش کانٹوں کا ہمیں پھولوں کا بستر ہوگا
پھول ہو جائے گا چھاتی پہ جو پتھر ہوگا　　قید خانہ جسے کہتے ہیں وہی گھر ہوگا
سنتری دیکھ کر اس جوش کو شرمائیں گے
گیت زنجیر کی جھنکار پہ ہم گائیں گے

الحاصل قوم میں بیداری کے آثار پیدا ہوے تو آزادیاں کہاں تھیں؟ ملک وسلطنت اغیار کے پنجۂ آہنی میں تھے، مگر پرستارانِ حریت نے ہمت نہ ہاری۔ خوف وہراس کو پاس تک پھٹکنے نہ دیا اور ناکامی کے خیال کو تارِ عنکبوت سے زیادہ اہمیت نہ دی اور کیا ہندو کیا مسلمان دونوں نے رستخیزِ بے جا کے خلاف علمِ احتجاج بلند کیا اور آزادی کی قربان گاہ پر جان ومال کی بھینٹ چڑھا دی۔ قوم کا یہ عزم امیدا فزا اور ایک رفیع الشان مستقبل کا پیش خیمہ تھا۔ چکبست کی بھی یہی آرزو تھی کہ ان کے ہموطن نشۂ حریت سے سرشار ہوں اور دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو کر صرف حصولِ آزادی کو مقصدِ حیات قرار دیں۔ شاعر کی پرخلوص امیدوں اور اس کے ہموطنوں کے جوش وخروش کی جھلکیاں ذیل کے بند میں دیکھیے ؎

نگاہِ شوق ہے اس رنگ کی تماشائی　　ہے جس سے شیخ وبرہمن پہ بیخودی چھائی
ہر ایک گام پہ کرتے ہوے جبیں سائی　　چلے ہیں بہرِ زیارت وفا کے سودائی
وطن کے عشق کا بت بے نقاب نکلا ہے
نئے افق سے نیا آفتاب نکلا ہے

اپنی قوم میں وطن پرستی کی یہ شدت اور ہنگامہ آفرینیاں دیکھ کر چکبست کے تنِ مردہ میں

جان آگئی، جذبۂ عمل کی شعلہ سامانیوں نے اکسایا اور وہ وفورِ جوش میں پکار اٹھے کہ بانیانِ استبداد ہوشیار ہو جائیں، اس لیے کہ قوم کے سُورماؤں نے انتقام لینے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ زبان بندی کچھ ہنسی کھیل نہیں ہے۔ آزادی بنی نوعِ انسان کا فطری حق ہے اور جذبۂ حریت کی مثال اُس طوفان خیز دریا کی سی ہے جس کے بہاؤ کو روکنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ شاعر، قوم کے پُرجوش ارادے کو اس طرح الفاظ کا جامہ پہناتا ہے ؎

حکمِ حاکم کا ہے فریادِ زبانی رُک جائے		دل کی بہتی ہوئی گنگا کی روانی رُک جائے
قوم کہتی ہے ہوا بند ہو پانی رُک جائے		پر یہ ممکن نہیں اب جوشِ جوانی رُک جائے

ہوں خبردار جنھوں نے یہ اذیت دی ہے
کچھ تماشا یہ نہیں قوم نے کروٹ لی ہے

لیکن انھوں نے جلد ہی محسوس کیا کہ ہندوستانیوں کے عزائم اور بھاری بھرکم دعوے سوڈا واٹر کا اُبال ہیں، اُن کے احساسات میں گہرائی اور ارادوں میں صفائی نہیں ہے کیوں کہ تھوڑے ہی عرصے میں ساری سیاسی تحریکیں نقش برآب اور باد رہوا ثابت ہوئیں۔ مگر مولانا حالی کی طرح وہ قنوطی جذبات سے مغلوب ہونے والے نہ تھے۔ بیم و رجا کی کشاکش سے زندگی مستقل آزار بن جاتی ہے، لیکن اُن کے نزدیک اُمید ہی زندگی کا سہارا تھی، یہی وجہ ہے کہ اہلِ وطن کے اختلافات اُن کو ایک درخشندہ مستقبل کے تصور سے مایوس نہیں کرتے تھے۔ کہتے ہیں ؎

نہ بدلی ہے، نہ بدلے گی ترنگ اپنی طبیعت کی		دکھائے گا کہاں تک آسماں نیرنگیاں اپنی

علاوہ ازیں وہ جانتے تھے کہ انقلاب آفرینی فطرت کا اٹل قانون ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اقوامِ عالم کی زندگی میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ دورِ حاضر کی آزاد اور متمدن قوموں کو بھی محکومیت کے نشیب و فراز سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ لہٰذا انھوں نے قوم پرستوں کی ناکامی کے اسباب و علل پر غور کرنا شروع کیا۔ وطن کے مہتم بالشان ماضی پر طائرانہ نظر ڈالی اور حال سے اُس کا موازنہ کیا تو بہ ظاہر "خاکِ ہند" کی عظمت میں کوئی نمایاں فرق نہ پایا۔ اس لیے کہ صناعِ اعظم کی صنعت کاریوں نے اُس کے چپے چپے کو رشکِ فردوس بنایا ہے وہی

سر بہ فلک پہاڑ ہیں۔ وہی دل فریب آبشار ہیں۔ وہی جھیلیں ہیں اور وہی دریا۔ وہی سرسبز و شاداب جنگل ہیں اور ہرے بھرے مرغزار جن میں طاؤس رقص کرتے ہیں پپیہے "پی کہاں" کا دل دوز نغمہ الاپتے ہیں۔ کوئل اپنی رس بھری آواز سے سرمدی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ چمن زاروں کی وہی بوقلموں جلوہ سامانیاں ہیں جو گلاب، نرگس، نسترن، کیوڑا، سیوتی، چنبیلی، موتیا، سورج مکھی اور لالہ کی بہاریں یاد دلاتی ہیں۔ نیز رنگ برنگی پرندے بھانت بھانت کی بولیوں اور پُر کیف زمزمہ پردازیوں سے فرحت آفریں مناظر کو سرچشمۂ موسیقی بناتے ہیں، غرض کہ کائناتِ حُسن کی وہی سحر کاریاں اور دلاویزیاں تھیں جو آغازِ گیتی سے اس وقت تک "خاکِ ہند" کے لیے طغرائے امتیاز رہی ہیں اور کیوں نہ باقی رہیں ؎

گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو　　سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جامِ اُلفت بخشا اس انجمن کو　　سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو

سب سورمے بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا ان کی ہڈیاں ہیں

اس ضمن میں انھوں نے سرسری طور پر قوم کا جائزہ بھی لیا۔ "جویندہ یابندہ" کوئی نئی مثل نہیں پھر "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے"۔ واقعات و حالات کی روشنی میں وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ بہ حیثیت مجموعی اُس میں اسلاف کی ساری خصوصیتیں تو ہیں، لیکن فقدان ہے اُس ہنگامہ آفریں جوش کا جو بقائے حریتِ قوم کے لیے لابدی ہے، یعنے ؎

گل شمع انجمن ہے، گو انجمن وہی ہے　　حُبِ وطن نہیں ہے، خاکِ وطن وہی ہے

ذیل کا قطعہ شاعر کے مافی الضمیر کا آئینہ ہے جس میں اُس نے قومی ادبار کے راز کو کسی قدر وضاحت کے ساتھ بے نقاب کیا ہے ؎

کبھی تھا ناز زمانے کو اپنے ہند پہ بھی　　پر اب عروج وہ علم و کمال فن میں نہیں
رگوں میں خون ہے وہی، دل وہی، جگر ہے وہی　　وہی زباں ہے مگر وہ اثر سخن میں نہیں
وہی ہے بزم، وہی شمع ہے، وہی فانوس　　فدائے بزم، وہ پروانے انجمن میں نہیں

وہی ہوا، وہی کوئل، وہی پپیہا ہے — وہی چمن ہے، پہ وہ باغبانِ چمن میں نہیں
غرور وجہل نے ہندوستاں کو لوٹ لیا
بجز نفاق کے اب خاک بھی وطن میں نہیں

مشرقی قوموں میں نفاق و شقاق ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ حبشیوں کی حالیہ شکست کا ایک بڑا سبب یہی اختلافات ہیں۔ انفرادیت، قومیت کے تخیل کو بار آور نہیں ہونے دیتی مگر اس بدقسمتی کو کیا کیا جائے کہ یہاں افراد کا مقصدِ حیات انبساطِ نفس ہے اور یہی وجہ ہے کہ حسد و تکبر اُن کے خمیر کا جزو اعظم ہیں اور وہ اپنے اقران و امثال کی معمولی سی کامیابی کو بھی بہ نظرِ استحسان نہیں دیکھ سکتے۔ انانیت و رعونت کا بھوت اُن کے سروں پر سوار رہتا ہے۔ طبیعت کی جنوں جولانیاں اور وحشت سامانیاں ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنانے پر اکساتی ہیں اور یہی نفاق انگیزیاں بالآخر قومی اتحاد و یکجہتی اور محبت و موانست میں رخنہ انداز ہوتی ہیں۔ حالانکہ افراد کی سرفروشی، وطن دوستی اور ایثار سے قومی وقار و عظمت کے قصر کی تعمیر ہوتی ہے۔ شاعر کی پیش قیاسی ملاحظہ ہو ؎

اپنے اپنے راگ سے کان آشنا ہونے کو ہیں — پردہ ہائے سازِ قومی بے صدا ہونے کو ہیں
رہنمائی کس کی ہوگی مجھ کو حیرت ہے یہی — قافلے میں قوم کے سب پیشوا ہونے کو ہیں
جذبۂ خدمت، صفائے قلب، آئینِ ادب — خود نمائی پر یہ سب جوہر فدا ہونے کو ہیں
جن کو منزل سے زیادہ ہو ہوا کا رُخ عزیز — قوم کے بیڑے کے ایسے ناخدا ہونے کو ہیں

پھر پیغمبرانہ تیقن سے کہتے ہیں ؎

گر یہی ہے گردشِ دوراں کا رنگِ انقلاب — ہوش اُڑ جائیں گے وہ فتنے بپا ہونے کو ہیں

اور اسی نفسی نفسی کی بدولت غدر کے بعد سے آج تک خاکِ ہند کو مشترکہ محاذ پیش کرنے میں کامیابی نہ ہو سکی۔ جس قوم کے رہنماؤں اور مصلحوں میں مل جُل کر کام کرنے کی صلاحیت نہ ہو اور قوم کی خدمت گذاری کے پردے میں جلبِ منفعت کے خواستگار ہوں اُس کے نخلِ تمنا کا ثمر آور ہونا معلوم۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ؎

دکھلاتی ہے بس سیفِ زباں جوہرِ عالی — لاریب صدا دیتا ہے جو ظرف ہے خالی

اصلاح کی تقلید ہے یہ امرِ خیالی   جب بانیٔ اصلاح ہوں خود ضیغم قالی

گر حُسن نہیں عشق بھی پیدا نہیں ہوتا
بلبلِ گُلِ تصویر پہ شیدا نہیں ہوتا

کہنے دیجیے کہ سرزمینِ شرق، وطن پرستی اور ملّت نوازی کے لیے سازگار نہیں ہے، مگر دوسری قوموں سے قطع نظر یہاں مجملاً اُن واقعات اور حالات کی طرف اشارہ کیا جاسے گا جو ہندوستانیوں میں اختلافات کا باعث ہوئے۔

ہے یہ کہ ہندوستان ان گنت قوموں کا جنم بھوم ہے جن کی زبانیں، معاشرت اور تمدن ایک دوسرے سے جُدا ہیں۔ اُس پر طرفہ تماشا یہ کہ تعصب و تنگ نظری کی وبا ہمالیہ سے راس کماری تک پھیلی ہوئی ہے اور یہ ایک غیر مشتبہ حقیقت ہے کہ تعصب تمام بُرائیوں اور خرابیوں کی جڑ ہے۔ بالخصوص جب کسی قوم کے افراد شومیٔ قسمت سے اس منحوس اور نامسعود جذبے کا شکار ہو جاتے ہیں تو پھر ارضِ وطن محشر بن جاتی ہے! ور بہ ایں ہمہ وسعت اُن کے لیے عرصۂ حیات تنگ ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اہلِ مغرب، اختلافِ عقاید کے باوجود فرقہ پرستی کے الجھیڑوں اور عافیت سوز جھمیلوں میں پھنس کر شیرازۂ قومیت کو پراگندہ نہیں کرتے۔ اسی بنا پر شاعر مُدبّرینِ یورپ کے ایثار اور وطن پرستی کا ثنا خواں تھا، اور رہتا کیوں نہیں کہ ؎

تھے خطۂ یورپ میں جو اصلاح کے بانی   آزادیٔ قومی پہ لہو کر گئے پانی
مُرجھا گئے کتنے ہی گُلِ باغ جوانی   اس نخل سے پر دور رہا رنگِ خزانی

سرگرمِ شہادت تھے وہ ایثار کی خُو سے
سینچا چمنِ قوم رگِ جاں کے لہُو سے

پھر اُن کے عزم بالجزم کی اس طرح مدح سرائی کرتے ہیں ؎

تھے یکہ و تنہا پہ ہزاروں کو نہ سمجھا   عشقِ گُلِ مقصود میں کانٹوں کو نہ سمجھا
سر کٹ گئے تلواروں کی دھاروں کو نہ سمجھا   جل جل گئے شعلوں کو شراروں کو نہ سمجھا

بدکیش نمود اُن کی مٹا اب نہیں سکتے
وہ آگ لگی ہے کہ بجھا اب نہیں سکتے

اگرچہ اُس وقت اہلِ ہند میں ذہنی بیداری کے آثار شباب پر تھے۔ سیاسی آزادی اُن کا منتہائے نصب العین تھا۔ اُن میں ہنگامہ آفریں جُوش وخروش کی کمی تھی اور نہ بے لوث خدمت گذاروں کی، جو بہ ظاہر رواداری، باہمی استعانت، اخوت ویگانگت کے زبردست حامی تھے، اور بجائے فرقہ پرستی، قومیت کے پرچار کو کلیدِ آزادی سمجھتے تھے، لیکن اس کے باوجود اُن کی کوششیں مشکور نہیں ہوتی تھیں، جیساکہ غالب نے کہا ہے ؎

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

علم بردارانِ حرّیت کی بلند آہنگ زمزمہ پردازیوں کا راز شاعر کی زبانی سُنیئے جس کی قوتِ متخیلہ آئینہ امروز" میں "احوالِ فردا" منعکس پاتی ہے اور وہ علےٰ الاعلان پکار اُٹھتا ہے ؎

زباں سے جُوشِ قومی دل میں پیدا ہو نہیں سکتا　　اُبلنے سے کنواں وسعت میں دریا ہو نہیں سکتا
بہت پنہاں رہی دل میں خلش خارِ تعصب کی　　مگر اب امتحاں کے وقت پردا ہو نہیں سکتا
جُدا سینے سے دل ہو دست وبازو قوم کے شل ہوں　　مگر دل سے جُدا دم بھر یہ کانٹا ہو نہیں سکتا
گراں ہے جنس اور نیت خریداروں کی ابتر ہے　　اب اس بازار میں اُلفت کا سودا ہو نہیں سکتا

جنسِ اُلفت کی گراں مایگی اور نیت کی ابتری تعصب ہی کی گلکاریاں ہیں اور یہی کوتاہ اندیشیاں بے رت کی ہولی دھلنڈی کی طرح سارے آلام اور قومی ادبار وذلت ونکبت کا باعث ہیں۔ اگرچہ ماحول سے متاثر ہو کر چکبست نے بھی اپنے فرقے کی ہمنوائی کی تھی اور ہندو مسلم کشیدگی اور نفاق وانشقاق کا الزام مسلمانوں پر لگایا تھا جیساکہ ذیل کے شعر سے ظاہر ہے ؎

اذاں سے نعرۂ ناقوس پیدا ہو نہیں سکتا　　ابھی کچھ روز تک کعبہ کلیسا ہو نہیں سکتا

ایسا کہنے پر وہ مجبور بھی تھے، کیوں کہ اپنے فرقے اور جماعت کے معاملے میں قومیت کے قوی آہنگ نقیب بھی ذاتی احساسات کی پردہ پوشی نہیں کرسکتے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو ملکی حالات اور باہمی دراندازیوں کے عبرت انگیز واقعات سے اُن کے خیالات میں انقلابِ عظیم ہوا، اور انھوں نے متحدہ قومیت کو آزادیٔ وطن کا پیش خیمہ قرار دیا۔ یہ ایک خوش آیند خواب تھا جس کی تعبیر میں اُلجھنیں پڑ رہی تھیں، اس لیے کہ

ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی حُسنِ سُلوک، رواداری اور جوشِ الفت کی اگلی سی گرم بازاری نہ تھی۔ انفرادیت اور فرقہ پرستی کا جنون عام تھا۔ زمانہ دیدہ بزرگوں میں بھی چشمِ بصیرت مفقود تھی۔ نوجوان جو قوم کے دست و بازو ہیں، قومی کشتی کے ملاح ہیں اور ایوانِ قومیت کے ستون ہیں، لہو و لعب میں مبتلا ہو گئے تھے۔ زمانے کی نیرنگیاں اُن کے لیے سبق آموز اور عبرت فزا نہ تھیں، اور اُن کا خیال تھا کہ ؎

جذبۂ قوم سے خالی نہ ہو سودائے شباب ــــــ وہ جوانی ہے جو اس شوق میں برباد رہے
جنونِ حبِّ وطن کا مزا شباب میں ہے ــــــ لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے

مگر جب صورتِ حال اس کے برعکس نہایت خراب اور افسوسناک ہو تو بہی خواہانِ قوم کی تشویش کا اندازہ کرنا چنداں مشکل نہیں۔ چکبست بہ صد حسرت و یاس کہتے ہیں ؎

گلشنِ قوم میں ہے پیشِ نظر رنگ عجیب ــــــ فتنے جاگے ہوئے ہیں خوابِ گراں میں ہیں نصیب
دل محبت سے خفا ہیں تو مروت کے رقیب ــــــ دُور ہیں دل سے جو آنکھوں سے ہیں ہر وقت قریب

اب وہ پہلے کی محبت وہ بھلائی ہے کہاں!؟
دل کے آئینوں میں اگلی سی صفائی ہے کہاں!!

ان باہمی تنازعات کے پردے میں دراندازا اور غرض آشنا مذہبی رہنماؤں کی خبیث طینت کارفرما تھی جو اختلافاتِ عقاید کو وجہ مخاصمت و جدال و قتال بنا رہے تھے۔ حساس دلوں کو اس کا سخت صدمہ تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ سرزمینِ وطن کو خانہ جنگیوں کا مرکز بنائیں۔ اس افسوسناک ذہنیت پر چکبست خاموش نہ رہ سکے اور سوزِ الفت سے تڑپ کر پکار اُٹھے ؎

نئے جھگڑے نرالی کاوشیں ایجاد کرتے ہیں ــــــ وطن کی آبرو اہلِ وطن برباد کرتے ہیں
بلائے جاں ہیں یہ تسبیح اور زنار کے پھندے ــــــ دلِ حق بیں کو ہم اس قید سے آزاد کرتے ہیں
اذاں دیتے ہیں بتخانے میں جا کر شانِ مومن سے ــــــ حرم میں نعرۂ ناقوس ہم ایجاد کرتے ہیں

اس سے صاف ظاہر ہے کہ شاعر ہندوؤں اور مسلمانوں کے قدیم آئینِ وفا شعاری، یکجہتی اور ہم آہنگی کے احیاء کا متمنی تھا اور یہ خیال مذکورہ معاندانہ ذہنیت کے استیصال کے بغیر

صورت پذیر نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کے لیے ایک صورت تو یہ ہوسکتی تھی کہ مختلف مذاہب کی صحیح تعلیمات سے عامۃ الناس کو روشناس کرایا جائے اور بلا امتیاز مذہب وملت ایک دوسرے کے پیغمبروں اور رشیوں کے آداب واحترام کی تلقین کی جائے۔ لیکن اس بارے میں چکبست کا یہ نظریہ تھا کہ ؎

واجب نہیں مذہب کے مسائل میں بھی حجت　　بازیچۂ اطفال ہیں ہفتاد و دو ملت
بس قابلِ تسلیم اُسی کی ہے شریعت　　جس دل میں ہو انساں کے لیے دردِ محبت
تہذیب پسند دیدۂ آفاق یہی ہے
مذہب یہی ملت یہی اخلاق یہی ہے

اور دوسری صورت یہ تھی کہ فرقہ پرستوں کو بادۂ حُب الوطنی سے لذت اندوز کیا جائے تاکہ وطنیت کے فیوض و برکات اُن کو ملت کی عافیت سوزیوں سے متنفر کر دیں۔ اور یہ ممکن بھی تھا، کیوں کہ اپنے مرز بوم سے عشق و اُلفت اقتضائے فطرت ہے۔ چکبست بھی وطن کی محبت کو جزوِ ایمان سمجھتے تھے۔ خارِ وطن کو سنبل و ریحاں سے "خوش تر" مانتے تھے۔ اُن کے کاشانۂ دل پر قومی اُلفت کا چراغ روشن تھا، اس لیے اُن کو کامل یقین تھا کہ صرف آخر الذکر صورت سے باہمی مناقشات کی جڑ کٹ سکتی ہے۔ اور سارے اختلافات دُور ہوسکتے ہیں۔ پس وہ سرخوشی اور وجدانی عالم میں التجا کرتے ہیں ؎

اے صُورِ حُبِ قومی اس خواب سے جگا دے　　بھُولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سُنا دے
مُردہ طبیعتوں کی افسردگی مِٹا دے　　اُٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے
حُبِ وطن سمائے آنکھوں میں نُور ہوکر
سر میں خمار ہوکر دل میں سرور ہوکر

لیکن وطن پرستی کا یہ جُوش وخروش بناوٹی اور رسمی نہ تھا۔ وہ قوم کے رنج و غم اور خوشی و مسرت میں برابر کے شریک تھے۔ چنانچہ جنوبی آفریقہ میں غریب الوطن ہندوستانیوں پر جب ناروا ظُلم وستم ہونے لگے تو ان کو بھی سخت قلق ہوا، کیوں کہ کیا ہندو، کیا مسلمان دونوں استبدادیت کے شکار تھے۔ شاعر نے پردیس میں ابنائے وطن کی زبوں حالی

اور تیرہ بختی کو اس طرح بیان کیا ہے ؎

وطن سے دُور بھی ہیں اور خانہ ویراں بھی
اسیرِ یاس بھی ہیں اور اسیرِ زنداں بھی
تباہ حال ہیں ہندو بھی اور مسلماں بھی
ہوئے ہیں نذرِ مصیبت کے دین و ایماں بھی
پڑھی نماز تو اُجڑے گھروں کے صحرا میں
اگر نہائے تو اپنے لہو کی گنگا میں

اس بے بسی اور بے چارگی کے اظہار سے اُن کا مقصد یہ تھا کہ دردمندانِ قوم کسی صورت سے اُن کی اعانت و امداد کریں تاکہ اُن کی زندگی سپھل ہو اور وہ آرام و آسادگی سے گذر بسر کریں اور قومی وقار و عظمت کی پیشانی پر کلنگ کا ٹیکہ نہ لگے۔ وہ پہلے ہندوؤں سے مخاطب ہوتے ہیں اور دُور اُفتادگانِ قوم کی حالتِ کس مپرسی پر آنسو بہاتے ہیں، اور یہ اندیشہ ظاہر کرتے ہیں کہ اگر اب بھی اعانت نہ کی گئی تو اُن کی کشتیٔ حیات بحرِ عدم کے بے ہنگام تھپیڑوں سے برباد ہو جائے گی۔ شاعر کے اسلوب بیان کی دل نشینی اور اثر آفرینی ملاحظہ ہو ؎

بھنور میں قوم کا بیڑا ہے ہندوؤ ہشیار
اندھیری رات ہے کالی گھٹا ہے اور منجدھار
اگر پڑے رہے غفلت کی نیند میں سرشار
تو زیرِ موجِ فنا ہوگا آبرو کا مزار
مٹے گی قوم، یہ بیڑا تمام ڈوبے گا
جہاں میں بھیشم و ارجن کا نام ڈوبے گا

بعد کو وہ مسلمانوں سے التجا کرتے ہیں اور اس موثر انداز میں کہ سنگ دل ترین انسان بھی پسیج جائے اور جرأت و پامردی کا وہ درس دیتے ہیں کہ بُزدل بھی میدانِ جنگ میں کود پڑے ؎

دکھا دو جوہرِ اسلام اے مسلمانو
وقارِ قوم گیا قوم کے نگہبانو
ستونِ ملک کے ہو قدرِ قومیت جانو
جفا وطن پہ ہے فرضِ وفا کو پہچانو
نبیؐ کے خلق و مروت کے ورثہ دار ہو تم
عرب کی شانِ حمیت کی یادگار ہو تم

پھر بامروت اسلاف کی حمیت کا واسطہ دے کر اُن کو اعانت پر آمادہ کرتے ہیں ؎

کرو خیال کچھ اسلاف کی محبت کا | دیا تھا دشمنِ قاتل کو جام شربت کا
معاملہ ہے یہاں بھائیوں کی عزت کا | یہ فرض عین ہے' تو دا نہیں مروت کا

اگر نہ اب بھی ہوا اسلام کا جگر پانی
"ہزار خندہ کفر است بر مسلمانی"

اسی پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ جرات آفریں باتوں سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو جوش دلاتے ہیں کہ اگر آج حکومت کی دارو گیر سے مرعوب ہو کر تم نے چوڑیاں پہن لیں، لبوں پر مُہر سکوت ثبت کر لی اور غلامی کا جوا اتار پھینکنے کی کوشش نہ کی تو یاد رکھو، تاریخ تم کو ہمیشہ نفرت و حقارت سے یاد کرے گی اور آیندہ نسلیں لعنت و ملامت کریں گی۔ کہتے ہیں ؎

جو دب کے بیٹھ رہے سر اٹھاؤ گے پھر کیا | عدو قوم کو نیچا دکھاؤ گے پھر کیا
جفا و جور کی ذلت اٹھاؤ گے پھر کیا | تم اپنے بچوں کو قصے سناؤ گے پھر کیا

رہے گا قول یہی اُن سے اُن کی ماؤں کا
لہو رگوں میں تمہاری ہے بے حیاؤں کا

پھر کہتے ہیں کہ قوم کے دامنِ عزت پر بزدلی کا دھبہ لگا کر عیش و سرور کی محفلیں گرمانا انتہائی بے حِسی اور پست ہمتی ہے' اور اس سے کہیں زیادہ مذموم جذبہ ذاتی نمود اور حصولِ جاہ و ثروت کی خواہش ہے جب کہ قوم کی گردن طوقِ غلامی سے گراں بار ہو ؎

مٹا جو نام تو دولت کی جستجو کیا ہے | نثار ہو نہ وطن پر تو آبرو کیا ہے
لگا دے آگ نہ دل میں تو آرزو کیا ہے | نہ جوش کھائے جو عزت تو وہ لہو کیا ہے

فدا وطن پہ جو ہو آدمی دلیر ہے وہ
جو یہ نہیں تو فقط ہڈیوں کا ڈھیر ہے وہ

اپنی التجاؤں کو بے اثر پا کر بالآخر وہ نہایت ہی مایوسانہ انداز میں کہتے ہیں ؎

اگر دلوں میں نہیں اب بھی جوش غیرت کا | تو پڑھ دو فاتحہ قومی وقار و عزت کا

وفا کو پھونک دو ماتم کرو محبت کا   جنازہ لے کے چلو قوم و دین و ملت کا
نشاں مٹا دو امنگوں کا اور ارادوں کا
لہو میں غرق سفینہ کرو مرادوں کا

پیہم ناکامیاں، رجائیت پسندوں کو بھی قنوطیت کی طرف مائل کر دیتی ہیں اور ان ہمت شکن حالات کے مدِ نظر چکبست کا اپنی قوم کے مستقبل سے مایوس ہو جانا اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی قوم کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کرنے کے لیے ممکنہ طریقے اختیار کیے۔ لیکن تعصب و تنگ نظری کا طلسم کچھ اس طرح چھایا ہوا تھا کہ کوئی افسوں کارگر نہ ہوا جس سے اُن کے قلب پر نہایت مایوسانہ اثرات مرتسم ہوئے اور انھوں نے حسرت بھرے انداز میں افرادِ قوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ؎

چمن کو دیدۂ عبرت سے دیکھ اے بلبل   گلوں سے پھوٹ کے رنگِ خزاں نکل آیا
ازل کے دن جو تباہی کی فال دیکھی تھی   تو نام کشورِ ہندوستاں نکل آیا

یہ خیال ابھی دل میں گذرا ہی تھا کہ سروشِ غیب نے اُن کے کان میں چپکے سے کہہ دیا ؎

کمالِ بزدلی ہے پست ہونا اپنی نظروں میں   اگر تھوڑی سی ہمت ہو تو پھر کیا ہو نہیں سکتا
ابھرنے ہی نہیں دیتی یہاں بے مائگی دل کی   نہیں تو کون قطرہ ہے جو دریا ہو نہیں سکتا

اس بصیرت افروز پیغام نے بارانِ رحمت کا کام کیا۔ اُن کے احساسِ خدمت گذاری میں ایک لہر دوڑ گئی، گویا سمندِ عمل پر تازیانہ لگا۔ مگر ساتھ ہی اُن کے مطمحِ نظر میں بنیادی تغیر بھی پیدا ہوا یعنے اس احساسِ پستی کے آغاز سے پہلے وہ آزادیِ کامل کے علم بردار تھے تاکہ سیاسی غلامی کے ساتھ ساتھ ذہنی پستی کے مضر اثرات قوم میں سرایت نہ کرنے پائیں۔ اُن کا ایک مشہور شعر ہے ؎

دل میں اس طرح سے ارمان ہیں آزادی کے   جیسے گنگا میں جھلکتی ہے چمک تاروں کی

مگر زمانے کے حالات سے مجبور ہو کر انھوں نے حکومت کی پاس داری کو قرینِ مصلحت سمجھا۔ کہتے ہیں ؎

آب و دانے سے قفس کے کچھ ہمیں اُلفت نہیں   بے پروبالی سے اپنی عاشقِ صیاد ہیں

یہی وجہ ہے کہ یا تو وہ قوم کے جذبات کو حکومت کے خلاف ابھار رہے تھے اور پکار پکار کر کہہ رہے تھے ؎

ہیں باغباں کے بھیس میں گلچیں فرنگ کے
نکلے ہیں لوٹنے چمنِ روزگار کو

یا جب ہندوستانی افواج جنگِ عظیم میں شریک ہو کر حکومتِ برطانیہ کا حق نمک ادا کرتی ہیں تو وہ کبیدہ خاطر نہیں ہوئے بلکہ اُن کے دل میں جوش اور جرأت کا بے تھاہ سمندر موجزن ہوتا ہے کہ اُن کے ہم وطنوں کو شجاعت و شہامت کے جوہر دکھانے کا موقع مل گیا اور انھوں نے ایک عالمِ سرخوشی میں یہ نعرۂ مستانہ بلند کیا ؎

ساحلِ ہند سے جرّارِ وطن جاتے ہیں
کچھ نئی شان سے جانبازِ کہن جاتے ہیں
رَن میں باندھے ہوئے شمشیر و کفن جاتے ہیں
تیغ زن برق فگن قلعہ شکن جاتے ہیں

سامنے ان کے ظفر برہنہ پا چلتی ہے
ان کی تلوار کے سایہ میں قضا چلتی ہے

اپنے سپاہیوں کی بسالت و جاں بازی پر اس طرح فخر و مباہات کرتے ہیں ؎

ان کی رگ رگ میں ہے پیوست شجاعت کے چلن
رن کا میدان ہے اُن کے لیے ماں کا دامن
عرصۂ جنگ کی موت اُن کو ہے اک شب کی دلہن
مر کے تلوار سے حاصل ہو تو خلعت ہے کفن

جوش ان میں جو ہے اس جوش کا اب دور نہیں
ساٹھ پشتوں کے سپاہی ہیں کوئی اور نہیں

اب وہ سپاہیوں کے جذبۂ حمیت کو اکساتے ہیں کہ اپنی شجاعت اور تیغ زنی کا اس طرح مظاہرہ کرو کہ مغرب کے سورماؤں کے دانت کھٹے ہو جائیں اور بتا دو کہ عرصۂ جنگ تمہارے لیے ہولی کی رُت ہے۔ کس تبختر سے فرماتے ہیں ؎

ہاں دلیرانِ وطن دھاک بٹھا کر آنا
طنطنۂ جرمنِ خود بیں کا مٹا کر آنا
قیصری تخت کی بنیاد ہلا کر آنا
ندیاں خون کی برلن میں بہا کر آنا

یہی گنگا ہے سپاہی کے نہانے کے لیے
ناؤ تلوار کی ہے پار لگانے کے لیے

پھر کہتے ہیں ؎

تم کو اعزاز ملا ہے یہ وطن کا اعزاز　　دیکھنا اب ہے شجاعت کا تمہاری انداز
خاکِ یورپ، یہ دلیری سے ہوا تھی ممتاز　　تیغِ ہندی کی اصالت پہ زمانے کو ہو ناز
قوم کا اوج بڑھے نامِ وطن زندہ ہو
روحِ پرتاب کی جنت میں نہ شرمندہ ہو

برطانوی حکومت کی تائید و حمایت محض خوش گوار اُمید کی بنا پر کی جا رہی تھی کہ شاید بیتے ہوئے عیش و نشاط کی گھڑیاں پھر میسر آجائیں، اور اس کا اُن کو کامل یقین بھی تھا ؎

اس خاکِ دلنشیں پر بادل سا چھا رہا ہے　　طوفان بےکسی کا ہم کو ستا رہا ہے
لیکن یہ دورِ حسرت دُنیا سے جا رہا ہے　　مایوس ہو نہ جانا وہ دن بھی آ رہا ہے
برطانیہ کا سایہ سر پر قبول ہوگا
ہم ہوں گے عیش ہوگا اور "ہوم رول" ہوگا

"ہوم رول" کیا ہے؟ یہ چکبست کی زبانی سُنیئے ؎

یہ آرزو ہے کہ مہر و وفا سے کام رہے　　وطن کے باغ میں اپنا بھی انتظام رہے
گلوں کی فکر میں گُل چیں نہ صبح و شام رہے　　نہ کوئی مُرغِ خوش الحاں اسیرِ دام رہے
سر پر شاہ کا اقبال ہو بہارِ چمن
رہے چمن کا محافظ یہ تاجدارِ چمن

اسی مقصد کو ایک شعر میں انھوں نے یوں ظاہر کیا تھا ؎

مجھ کو مل جائے چہکنے کے لیے شاخ مری　　کون کہتا ہے کہ گلشن میں نہ صیاد رہے

یہ نظریہ دراصل مبدل تخیل کی پیداوار ہے۔ مسز اینی بسنٹ، مشہور کانگرسی خاتون اس کی زبردست حامی تھیں، اور چکبست اُن کے وفاشعار پیرووں میں سے تھے، اس لیے بھی "ہوم رول" کا راگ الاپتے ہیں جس کا اُن کو اعتراف بھی ہے ؎

زمین ہند کی رُتبے میں عرشِ اعلیٰ ہے　　یہ "ہوم رول" کی اُمید کا اُجالا ہے
مسز بسنٹ نے اس آرزو کو پالا ہے　　فقیر قوم کے ہیں اور یہ راگ مالا ہے

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم "ہوم رول" کے بدلے

قومی تعصبات کی بنا پر اکثر مفکرین "ہوم رول" کی کامیابی کے متعلق اندیشہ ظاہر کر رہے تھے، کیوں کہ کشاکشِ باہمی کی بدولت خاکِ ہند کا دامن قوسِ قزح بنا ہوا تھا، مگر چکبست کا خیال تھا ؎

جو "ہوم رول" پہ بہ چشمِ شوق شیدا ہو
تمام رنگ میں ایک نور پیدا ہو

اس زمانے میں "ہوم رول" ہی اہلِ ہند کا کعبۂ آرزو تھا جس کے لیے چکبست تو اپنی بساط سے زیادہ سعی و کاوش پر آمادہ نظر آتے ہیں، حتیٰ ایں کہ اُن کو مقید ہو جانا بھی گوارا ہے۔ کہتے ہیں ؎

پنھانے والے اگر بیڑیاں پنھائیں گے
خوشی سے قید کے گوشے کو ہم بسائیں گے
جو سنتری درِ زنداں کے سو بھی جائیں گے
یہ راگ گا کے انھیں نیند سے جگائیں گے
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم "ہوم رول" کے بدلے

اس سلسلے میں انھوں نے محسوس کیا کہ ملک کے نوجوانوں کی حالت نہایت ناگفتہ بہ ہے، وہ عیش و نشاط کے دل دادہ ہیں ملکی مسائل سے اُن کو دلچسپی ہے اور نہ ہمدردی۔ اور یہ لاپروائی دراصل جہالت اور صحیح تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے تھی۔ ملک میں کوئی ایسا علمی ادارہ نہ تھا جو تشنگانِ علم کی پیاس بجھا سکتا۔ یہ بڑی بدبختی تھی۔ بعض ہمدردانِ قوم نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور بالآخر ایک قومی جامعہ کی تشکیل کا لائحہ عمل پیش کیا گیا۔ یہ عظیم الشان کام کسی محبِ وطن کی تنہا اعانت سے سر انجام نہیں پا سکتا تھا، اس لیے چندہ کی اپیل کی گئی۔ چکبست جہالت کی تاریکیوں کو شمع علم کی ضیا پاشیوں سے دُور کرنے کے آرزو مند تھے ہی۔ انھوں نے فی الفور بانیانِ ادارہ کی ہمت افزائی کی اُن کے مستحسن اقدام کو سراہا، اور اربابِ سطوت و ثروت کو اس کارِ خیر میں حصّہ لینے کی ترغیب دی۔ کیوں کہ قومی ترقی اور افلاس کا واحد علاج ان کے نزدیک تعلیم کی فراوانی ہی سے ممکن تھا، اس لیے وہ پہلے تو

قوم کی جہالت اور اس کے مضر اثرات کا ذکر کرتے ہیں ؎

گھٹائیں جہل کی چھائی ہوئی ہیں تیرہ و تار
یہ آرزو ہے کہ تعلیم سے ہو بیڑا پار
مگر جو خواب سے اب بھی نہ تم ہوئے بیدار
تو جان لو کہ ہے اس قوم کی چتا تیار
مٹے گا دین بھی اور آبرو بھی جائے گی
تمہارے نام سے دُنیا کو شرم آئے گی

پھر نہایت حُسن و خوبی سے حرفِ مدعا زبان پر لاتے ہیں ؎

یہ کارِ خیر وہ ہو نام چار سُو رہ جائے
تمہاری بات زمانے کے روبرو رہ جائے
جو غیر ہیں انھیں ہنسنے کی آرزو رہ جائے
غریب قوم کی دُنیا میں آبرو رہ جائے
ذرا حمیت و غیرت کا حق ادا کر دو
فقیر قوم کے آتے ہیں جھولیاں بھر دو

من بعد وہ نوجوانوں سے مخاطب ہوتے ہیں اور اُن کو نصیحت کرتے ہیں کہ خوابِ غفلت سے چونک اُٹھو، بساطِ عیش اُلٹ دو، اور حصولِ علم میں ہمہ تن مصروف ہو جاؤ کہ جوانی اُس شگفتہ پھول کی مانند ہے جو زوالِ آفتاب کے ساتھ پژمردہ ہونے لگتا ہے۔ کہتے ہیں ؎

چمنِ عمر ہمیشہ نہ رہے گا شاداب
خُم میں باقی نہ رہے گی یہ جوانی کی شراب
نشۂ علم میں ہر وقت رہو تم غرقاب
شانِ تعلیم یہی ہے یہی تہذیبِ شباب
لے اُڑے دل کو طبیعت کی روانی وہ ہے
بے پیے نشہ رہے جس میں جوانی وہ ہے

بالعموم نوجوان چند متداول کتابوں پر عبور حاصل کر کے اپنے آپ کو "پانچویں سواروں" میں شمار کرنے لگتے ہیں۔ اُن کے متعلق چکبست نے نہایت جچی تلی رائے دی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

نشۂ علم میں تم میں سے نہیں کوئی بھی چُور
دخل رہتا ہے طبیعت میں تعلّی کو ضرور
ہو گیا ہے جو ذرا چار کتابوں پہ عبور
تو غضب کی ہمہ دانی ہے قیامت کا غرور
شان ارسطو کی بھی فرعون کا سامان بھی ہے
وہی گھر مصر بھی ہے اور وہی یونان بھی ہے

اب ذرا اُن عالی قدر حضرات کی حالت ملاحظہ کر لیجیے جو کعبۂ یورپ کے طواف سے مشرف ہو کر زینت دہِ وطن ہوتے ہیں ؎

جو اکبر سے جو یورپ کے ہوئے ہیں ممتاز
ہے وطن میں بھی غریب الوطنی پر انھیں ناز
بیر یارانِ طریقت سے تو غیروں سے ہے ساز
وہ بنائی ہوئی چیتون وہ انیلے انداز
لب و لہجے میں لگاوٹ ہے طرحداری ہے
اک فقط رنگ پہ قابو نہیں لاچاری ہے

یورپ سے آخر یہ لوگ کیا سیکھتے ہیں؟

اُن کو تہذیب سے یورپ کی نہیں کچھ سروکار
ظاہری شان و نمائش پہ دل و جاں سے نثار
ہیں وہ سینے میں کہاں غیرتِ قومی کے شرار
جن سے مغرب میں ہوئے خاک کے پتلے بیدار
سیرِ یورپ سے یہ اخلاق و ادب سیکھا ہے
ناچنا سیکھا ہے اور لہو لعب سیکھا ہے

شاعر ایسا کہنے میں کہاں تک حق بجانب ہے، یہ اربابِ نظر فیصلہ کریں البتہ مغربی تعلیم کے فیض یافتہ ہونے کے باوجود چکبست قدیم آئینِ وضع داری کی پابندی کو ناگزیر سمجھتے تھے، اس لیے اہلِ مغرب کی کورانہ تقلید اُن کے نزدیک مستحسن نہ تھی کہتے ہیں ؎

اپنے ہی دل کا پیالہ پیے مدہوش ہوں میں
جھوٹی پیتا نہیں مغرب کی وہ مے نوش ہوں میں

چنانچہ تہذیبِ جدید کے پرستاروں پر جب اُن کی سخت نکتہ چینیوں کا کوئی اثر مترتب نہ ہوا تو دبی آواز میں وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ؎

نئی تہذیب کے صدقے نہ شرمانے دیا دل کو
ہے منطق کے پردے میں کرشمے بے حیائی کے

ذیل کی نظم اُن کے بلند آہنگ عزائم اور اصلاحی خیالات کی تفسیر ہے جو قوم لڑکیوں کو مغرب زدہ مردوں کی بے جا تقلید سے باز رکھنے کے لیے لکھی گئی تھی ؎

روشِ خام پہ مردوں کی نہ جانا ہرگز
داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز
نام رکھا ہے نمائش کا ترقی و رفارم
تم اس انداز کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز
رنگ ہے جس میں مگر بوئے وفا کچھ بھی نہیں
ایسے پھولوں سے نہ گھر اپنا سجانا ہرگز

خود جو کرتے ہیں زمانے کی روش کو بدنام
ساتھ دیتا نہیں ایسوں کا زمانا ہرگز
پوجنے کے لیے مندر جو ہے آزادی کا
اُس کو تفریح کا مرکز نہ بنانا ہرگز
اپنے بچوں کی خبر قوم کے مَردوں کو نہیں
یہ ہیں معصوم انھیں بھول نہ جانا ہرگز
ان کی تعلیم کا مرکز ہے تُمہارا زانو
پاس مَردوں کے نہیں ان کا ٹھکانا ہرگز
کاغذی پھُول ولایت کے دکھا کر ان کو
دیس کے باغ سے نفرت نہ دلانا ہرگز
نغمۂ قوم کی لے جس میں سما ہی نہ سکے
راگ ایسا کوئی اُن کو نہ سکھانا ہرگز
گو بزرگوں میں تمہارے نہ ہو اس وقت کا رنگ
ان ضعیفوں کو نہ ہنس ہنس کے رُلانا ہرگز

ہم تمہیں بھُول گئے اس کی سزا پاتے ہیں
تم ذرا اپنے تئیں بھُول نہ جانا ہرگز

یہ حکیمانہ مقولے ہیں، اور معنویّت کے اعتبار سے اس قابل ہیں کہ آج بھی قوم کے مَرد و زن ان کو حرزِ جان بنائیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے قوم کے اولوا العزم رہنماؤں کی وفات پر مرثیے بھی لکھے ہیں جو ہر آئینہ اُن کے قلبی تاثرات کے مظہر ہیں۔

چکبست نے ایک سچّے اور بے لوث خادمِ وطن کی طرح ملک و قوم کی مقدور بھر خدمت کی۔ قوم کی کمزوریوں کو اجاگر کیا اور اُن کے متعلق بے باکانہ ذاتی رائے کا اظہار کر کے ناقابلِ فراموش اخلاقی جُراٴت کا سبق دیا۔ اُن کی قدر و منزلت فزوں تر ہو جاتی ہے، جب وہ قومی اور مُلکی مفاد کے لیے فرقہ وارانہ تعصبات کو نظر انداز کر کے قوم کے بکھرے ہوئے شیرازۂ کہن کو رشتۂ اُخوت والفت سے مضبوط اور مربوط کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ وہ آزادیِ کامل کے لیے بیتاب پاتھے، مگر حقوق نظریئے کے حامی ہونے کی وجہ سے غیر آئینی جدوجہد کو مُہلک اور مصلحت و دور اندیشی سے بعید سمجھتے تھے۔ تاہم اگر یہ سچ ہے کہ شاعر کا کلام اس کے جذبات کی کمیّت اور کیفیت کا آئینہ دار ہے تو، بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اُن کی شاعری تعصبات سے یکسر پاک ہے اور اُس میں قومیت و وطنیت کا وہ بصیرت افروز اور تابناک درس موجود ہے جس سے بے حس دلوں میں

۵۲

حبُ الوطنی کا بے تھاہ سمندر جو جوش زن ہو سکتا ہے۔



سید مہدی حسین (عثمانیہ)

معاشی تقسیمِ عمل

جب تمدنِ انسانی ابتدائی منازل میں تھا، انسانی احتیاجات قلیل اور محدود تھیں، اُن کی تکمیل کے ذرایع بھی محدود تھے۔ ذرایع پیدائش قلیل اور زندگی کا معیار پست تھا۔ انسان کو وسایل قدرت پر بہت کم تصرف حاصل تھا، اسی لیے مختلف شعبہ ہائے پیدائش کا کوئی وجود نہ تھا، صنعت وحرفت کا شعبہ وجود میں نہ آیا تھا۔ ذرایع آمد و رفت نہایت ہی خستہ حالت میں تھے۔ تجارت کا رواج نہ تھا۔ خود زراعت بھی نہایت ہی ادنی حالت میں تھی۔ شہر یا شہری آبادی ابھی وجود میں نہ آئی تھی، محض دیہات بستے تھے۔ ہر گاؤں چند خاندانوں پر مشتمل ہوتا تھا، اور ہر خاندان اپنی جملہ ضروریات کا خود ذمہ دار ہوتا تھا۔

انسانی تمدن آگے قدم بڑھاتا گیا۔ وسایلِ قدرت پر انسان کو تصرف حاصل ہوتا گیا۔ احتیاجات میں اضافہ اور معیارِ زندگی بلند ہوتا گیا، ساتھ ہی دیہی آبادی مختلف پیشوں میں تقسیم ہوتی گئی۔ ہر فردِ اہلِ قریہ کی جملہ ضروریات میں سے کسی ایک ضرورت کی فراہمی کا ذمہ دار ہوتا گیا، اور مختلف افراد ایک دوسرے کی فراہم کردہ اور تیار کردہ اشیاء سے تبادلہ کرنے لگے، اور اس طرح اُن کی ضروریات رفع ہونے لگیں۔ ایک فرد دوسرے فرد کی محنت کے نتائج سے مستفید ہونے لگا اور یہیں سے مبادلہ یا لین دین کے طریق کا رواج شروع ہوا۔ تقسیم عمل کی اس منزل میں ہر فرد کسی ایک شئے کی تیاری میں مصروف رہتا تھا، لہذا گاؤں کی آبادی میں مختلف پیشہ ور مثلاً کمہار، لوہار، نجار، موچی، معمار، خیاط، خاکروب، دھوبی، حجام، سُنار وغیرہ پیدا ہو گئے۔

تقسیمِ عمل کا دوسرا دور اُس وقت شروع ہوتا ہے جب کہ گاؤں کی آبادی میں اضافہ ہوتا ہے وسایلِ آمد و رفت میں آسانیاں پیدا ہوتی ہیں اور بجائے اس کے کہ ایک فرد کسی شئے کی مکمل تیاری کا ذمہ دار ہو کئی کئی افراد کسی ایک چیز کی تیاری میں مصروف رہتے ہیں۔ ایک ہی کام کے مختلف حصے قرار دیے جاتے ہیں اور مختلف حصوں کی تیاری مختلف افراد کے ذمے قرار پاتی ہے، مثلاً ایک ٹرنک کی تیاری میں ایک شخص ٹرنک کا خاکہ کھینچتا ہے، دوسرا کاٹتا ہے، تیسرا کیلیں جڑتا ہے، چوتھا رنگ سازی کرتا ہے۔ اس طرح تقسیم در تقسیم ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے کارخانوں میں جہاں مشین کا استعمال ہوتا ہو کوئی شئے اُس وقت تک تکمیل نہیں پاتی جب تک کہ وہ بیسیوں افراد کے ہاتھوں سے نہ گذرے۔ پارچہ بافی، مشین سازی اور مختلف صنعتی کاروبار میں ہم یہی حال دیکھتے ہیں۔ گویا تقسیمِ عمل پیدائشِ دولت کا وہ طریقہ ہے جس کے تحت ایک شئے کی تیاری متعدد اور مختلف حصوں میں تقسیم کی جاتی ہے اور ہر حصہ ایک جداگانہ مزدور کے تفویض کیا جاتا ہے اور ہر شخص کی موزونیتِ کار کا خاص لحاظ کیا جاتا ہے۔ ہر مزدور اپنی موزونیتِ طبع اور مشق کے مطابق ایک ایک چیز کی تیاری کا ذمہ دار ہوتا ہے اور اس طرح مختلف مزدوروں کے اتحادِ عمل سے کوئی شئے تکمیل پاتی ہے۔

تقسیمِ عمل کی وسعت کے ساتھ اصولِ تخصیص بھی نمودار ہوا، کیوں کہ کسی ایک چیز یا کسی ایک جزُ پر تمام تر تجربہ اور محنت صرف کرنے سے کمال حاصل ہوتا ہے اور ایسے افراد جو اس اصول پر عمل پیرا ہوتے ہیں ماہرین کہلاتے ہیں۔ اصولِ تخصیص کا علم اور قوموں کو بھی صدیوں قبل تھا اور اسی پر عمل بھی ہوتا تھا، مگر زمانۂ موجودہ میں یورپ اور امریکہ میں اس اصول پر نہایت ہی اہتمام سے عمل ہوتا نظر آتا ہے۔

تقسیمِ عمل کی ایک اور صورت ہے جس کو ارضی تقسیمِ عمل کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ملک یا ایک ہی ملک کے مختلف حصص صرف انھیں اشیا کی تیاری کے لیے مخصوص ہو جائیں جنھیں وہ کم سے کم مصارف سے حاصل کر سکتے ہوں اور دوسرے ممالک مبادلے کے ذریعے ایک دوسرے کی پیداوار سے مستفید ہوں۔

بین الاقوامی تجارت اور تجارتِ خارجہ کا دار و مدار اسی اصول پر مبنی ہے۔ ہر ملک آسانی کے ساتھ ایسی اشیاء حاصل کر سکتا ہے جن کو وہ پیدا نہیں کر سکتا یا اگر پیدا کر سکتا ہو تو مقابلۃً گراں مصارف سے۔

تقسیمِ عمل کے فواید

ہم جانتے ہیں کہ تقسیمِ عمل کی سب سے اعلیٰ خصوصیت یہ ہے کہ اس کی بدولت ہر فرد سے صرف وہی کام یا ایک کام کا صرف وہی حصہ متعلق رہے جس کے لیے وہ زیادہ سے زیادہ موزوں ہو۔ کسی کام کے کُل حصے یا اجزا برابر نہیں ہوتے۔ اگر ہم کسی شئے کی تیاری میں اُس کے مختلف حصوں کا تجزیہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اُس میں دشوار اور آسان حصے موجود ہیں۔ تقسیمِ عمل کی بدولت جب دشوار اور آسان حصے الگ الگ ہو جاتے ہیں تو ہر مزدور کی صلاحیت اور طاقت کے مطابق کام کا ایک حصہ تفویض کیا جا سکتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ عورتیں اور بچے بھی اپنی صلاحیت کے مطابق کسی کام میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اس طرح محنت بھی ضایع نہیں جاتی اور کام بھی عمدہ ہوتا ہے۔ اس تقسیم سے ایک تو آجر کے مصارف میں کفایت ہوتی ہے۔ دوسری طرف مزدور کی مجموعی خاندانی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے۔

۲۔ تقسیمِ عمل کے طریق پر کاربند ہونے سے دوسرا بڑا فایدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ اس کی بدولت مزدوروں کو مشق بہم پہنچتی ہے اور مہارت تامہ حاصل ہو جاتی ہے، کیوں کہ جس قدر کسی کام میں زیادہ مشق ہوتی ہے اُسی قدر اُس میں مہارت حاصل ہوتی ہے۔ تقسیمِ عمل کے تحت چونکہ مزدور ایک ہی کام کو بار بار دُہراتا رہتا ہے لہٰذا اُس کے کام میں خاص مہارت اور صفائی پیدا ہو جاتی ہے۔

وقت کی بچت اور راس المال کی کفایت تقسیمِ عمل کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ جب کوئی مزدور کسی کام کو از ابتدا تا انتہا انجام دیتا ہے تو اُس کو متعدد کام انجام دینے پڑتے ہیں۔ ایک کام کو چھوڑ کر دوسرا کام شروع کرنے میں وقت ضایع ہوتا ہے اور اس دورِ مسابقت میں تھوڑے سے وقت کی بھی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے۔ اسی طرح کسی کام کو انجام دینے میں مختلف آلات و اوزار استعمال کیے جاتے ہیں۔

جب تک مزدور کسی کام کے ایک حصے میں منہمک رہتا ہے اُس وقت تک دوسرے کاموں کے آلات و اوزار بے کار پڑے رہتے ہیں۔ پیدائشِ دولت میں یہ صورت مضرت رساں ہے۔ تقسیمِ عمل کی بدولت وہ تمام وقت جو ایک کام چھوڑ کر دوسرا کام شروع کرنے میں صرف ہوتا ہے بچ جاتا ہے۔ دوسری طرف کسی کارخانے کا جملہ اصل بر سرِ کار رہتا ہے۔

تقسیمِ عمل کے فوائد کا کچھ اندازہ ذیل کی مثال سے ہوسکے گا:۔

آدم اسمتھ اپنے زمانے کے الپن سازی کے کارخانے کا چشم دید حال لکھتا ہے جو الپن بلا مشق دن بھر میں ایک بھی بہ مشکل تیار ہوسکتی ہے تقسیمِ عمل کی بدولت حیرت انگیز سرعت سے بنائی جاتی ہیں۔ ان کے بنانے کا طریق یہ ہے کہ ایک شخص تار کھینچتا ہے، دوسرا اُس کو سیدھا کرتا ہے، تیسرا چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹتا ہے، چوتھا نوک نکالتا ہے، پانچواں گھنڈی بٹھانے کے لیے دوسرے سرے کو درست کرتا ہے۔ تین چار مسلسل ترکیبوں سے گھنڈی تیار ہوتی ہے۔ گھنڈی جمانا، الپن نکھارنا اور اُن کو کاغذ میں ترتیب سے لگانا سب جدا جدا کام ہیں۔ گویا الپن سازی کا طریقہ تقریباً اٹھارہ کاموں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

آدم اسمتھ نے معمولی کارخانے کا حال لکھا ہے لیکن تقسیمِ عمل کے زور سے دس آدمی دن بھر میں تقریباً اڑتالیس ہزار الپن بنا لیتے ہیں تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ تخمیناً چالیس پیشے گھڑی سازی سے اور ستو سے زیادہ کپڑے کی تیاری سے متعلق ہیں[1]۔

تقسیمِ عمل کا ایک نمایاں فایدہ یہ بھی ہے کہ اس کی بدولت مشینوں کی ایجاد اور اُن کی اصلاح کے بیشتر موا قع نکل آئے ہیں جب کوئی مزدور اپنا پورا وقت کسی ایک مشین پر صرف کرتا ہے تو اُسے اس بات کا موقع ملنا یقینی ہے کہ اُس مشین میں کوئی زیادہ مفیدِ مطلب نئی بات کیوں کر پیدا کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ مشینوں کی اصلاحات خود مزدور طبقے کے افراد نے اکثر و بیشتر کی ہے۔

---

[1]۔ اصولِ معاشیات (برنی)۔

تقسیمِ عمل کے نقائص

۱۔ تقسیمِ عمل کے خلاف ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے مزدور کی واقفیت کا دایرہ نہایت ہی محدود ہو جاتا ہے۔ بجز اُس قابلیت کے جو اُسے اپنے اس مفوضہ کام کو انجام دینے کے لیے حاصل رہتی ہے وہ دیگر صلاحیتوں اور قابلیتوں سے محروم رہتا ہے لیکن یہ اعتراض غلط فہمی پر مبنی ہے کیوں کہ کسی ایک کام میں مہارت اور خصوصیت حاصل کرنے کے یہ ہرگز معنے نہیں کہ وہ دنیا میں کسی کام ہی کا نہ رہے۔ ہم کسی ایسے طبیب پر جو اپنے فن میں کسی ایک شعبے کا ماہر ہو ہرگز یہ اعتراض نہیں کر سکتے کہ اُس کی عام قابلیت اور عام معلومات کا دایرہ بالکل محدود ہے کیوں کہ تخصیصِ کار سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ دنیا سے بے خبر ہے۔ بلکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایسے ماہرین کا معیار بہ لحاظ عام قابلیت بلند ہی رہتا ہے۔

۲۔ دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ کسی کام کے ایک چھوٹے سے جُز کو بار بار دُہرانے سے مزدور کو اپنے کام میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی بلکہ ایک طرح کی بیزاری پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً کہا جاتا ہے کہ وہ شخص دنیا میں کیا حظ و لطف حاصل کر سکتا ہے جس کی عمر الپن کی نوک بنانے میں صرف ہو جائے یہ اعتراض بھی عملی میدان میں کوئی وزن نہیں رکھتا کیوں کہ یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ تقسیمِ عمل، مشین کے استعمال اور پیدایش بر پیمانۂ کبیر کے ذریعے دولت بہ افراط پیدا کی جاتی ہے۔ پیدایشِ دولت میں جوں جوں آسانیاں پیدا ہوتی جاتی ہیں مزدور اوقاتِ کار میں تخفیف کا مطالبہ کرتے ہیں۔ تخفیفِ اوقاتِ کار کے ساتھ مزدوروں کو دیگر تفریحی مشاغل میں حصہ لینے کے لیے کافی وقت مل جاتا ہے اور بہ حیثیتِ مجموعی قوم میں اضافۂ دولت سے مزدوروں کی اُجرت میں بھی اضافے کی گنجایش ہے جس کے باعث معیارِ زندگی بلند ہوتا اور مالی اعتبار سے بھی زندگی کے کچھ نہ کچھ دلچسپیوں میں حصہ لینے کا موقع نکل آتا ہے، اور بجائے کوفت کے اُن کی زندگی پُر لطف گذرنے لگتی ہے۔

۳۔ تقسیمِ عمل پر تیسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ چونکہ مزدور صرف ایک کام سے یا ایک کام کے کسی ایک جُز سے واقف رہتا ہے اس لیے اگر اُس کو اُس کام میں

ناکامی ہو تو وہ کوئی دوسرا پیشہ اختیار نہیں کرسکتا۔لیکن یہ اعتراض بھی غلط فہمی پر مبنی ہے کیوں کہ تقسیمِ عمل کی بدولت پیشہ کا کام چھوٹے چھوٹے حصوں میں منقسم ہو کر بہت ہی آسان ہو جاتے ہیں اور اُن کا سیکھنا بجائے مشکل ہونے کے آسان ہو جاتا ہے۔

۴۔تقسیمِ عمل کی بدولت عورتوں اور بچوں سے بھی کارخانوں میں کام لینے کا امکان پیدا ہو گیا ہے اسی وجہ سے معاشرتی بُرائیوں کے پیدا ہونے کا بڑی حد تک اندیشہ ہے حقیقتاً یہ اندیشہ ایسا ہے جس کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔مگر قوانینِ کارخانہ جات حکومت کی مداخلت و نگرانی اور خود مزدور طبقات میں تعلیم اور بیداری پیدا کرکے ان خرابیوں کا سدِباب کیا جا سکتا ہے۔

آدم اسمتھ کے اس بیان میں بڑی حد تک صداقت موجود ہے کہ تقسیمِ عمل کا انحصار بازاروں کی وسعت پر موقوف ہے۔ہم جانتے ہیں کہ انسانی تمدن جب اپنے ابتدائی منازل طے کر رہا تھا انسانی احتیاجات محدود تھیں، ساتھ ہی اُن کی تکمیل کے ذرایع بھی محدود تھے۔ذرایع معاش قلیل اور معیارِ زندگی ادنیٰ تھا مختلف شعبہ جاتِ پیدائش اپنے ابتدائی منازل طے کر رہے تھے، یعنے زراعت،صنعت وحرفت، تجارت ابھی ادنیٰ حالت میں تھے۔انسانی آبادیاں چھوٹے چھوٹے دیہات پر مشتمل تھیں، ذرایع آمد و رفت دشوار تھے، ہر گاؤں میں کچھ خاندان بستے تھے۔ہر گاؤں کیا بلکہ ہر خاندان اپنی جملہ ضروریات کی فراہمی کا خود ذمہ دار ہوتا تھا۔مبادلہ اشیاء بہ الفاظ دیگر ایک دوسرے کی بنائی ہوئی اشیاء سے مستفید ہونے کا کوئی طریق رائج نہ تھا۔نتیجہ یہ کہ نہ تو تقسیم عمل کی ضرورت تھی اور نہ تقسیم عمل کا رواج تھا۔بہ الفاظ دیگر بازاروں کی عدم وسعت تقسیمِ عمل میں مانع تھی۔ہم دیکھتے ہیں کہ تمدنِ انسانی جوں ہی آگے قدم بڑھاتا ہے، زراعت،صنعت وحرفت اور تجارت میں جیسے جیسے ترقی ہوتی جاتی ہے مبادلے کا رواج جوں جوں پھیلتا جاتا ہے، گویا بازاروں میں جیسے جیسے وسعت پیدا ہوتی ہے تقسیمِ عمل میں بھی ترقی ہوتی ہے۔

آدم اسمتھ کے قول کی تائید حقیقی واقعات کے مشاہدے سے بھی ہوتی ہے۔ایک صناع اُسی قدر اور اتنی ہی تعداد میں مصنوعات تیار کرے گا جتنی کہ اُن کے فروخت میں

گنجائش موجود ہے جیسے جیسے اُن کی مانگ میں اضافہ ہوتا جائے اُسی طرح پیدائش مصنوعات میں بھی وہ اضافہ کرتا ہے، پیمانۂ کاروبار وسیع ہوتا ہے۔ پیمانۂ کاروبار جس قدر وسیع ہوتا جاتا ہے تقسیم عمل کا رواج بھی پھیلتا جاتا ہے گویا تقسیم عمل کا انحصار اور اُس کی ترقی کسی شئے کے لیے وسیع بازار کے مہیا ہوئے پر ہے۔

وسایل حمل و نقل کی سہولتوں اور ترقی کے ساتھ صنعت و حرفت اور تجارت کی ترقی بہت کچھ وابستہ ہے۔ انیسویں صدی میں ذرایع حمل و نقل کی ترقی کے ساتھ صنعت و حرفت اور تجارت میں نمایاں ترقی ہوئی اور صنعتی اور تجارتی ترقی نے تقسیم عمل کے لیے ایک وسیع میدان پیدا کر دیا۔ قرون وسطیٰ اور دورِ جدید کے ابتدائی زمانے میں وہی مصنوعات اور اشیاء دور دراز ممالک کو بھجوائے جاتے تھے جو بہ لحاظ اپنی جسامت کے زیادہ قیمت و قدر کے حامل ہوتے تھے مثلاً قیمتی ادویات، عمدہ کپڑے، قیمتی ہتھیار اور جواہر وغیرہ صرف محدود طبقات میں استعمال ہوتی تھیں، کیوں کہ مصارفِ نقل و حمل کی دقتوں اور گراں مصارف کی وجہ متوسط اور کم قیمت والی اشیاء دور دراز فاصلوں پر روانہ نہیں کی جاسکتی تھیں، لہذا تجارتِ خارجہ کا دایرہ محدود تھا اسی لیے اکثر ممالک بیشتر اشیاء کی حد تک خود مکتفی تھے، لہذا اسی قسم کے اشیاء کا پیمانۂ کاروبار بھی محدود ہوتا تھا۔ جہاں پیمانۂ کاروبار محدود اور چھوٹا ہو وہاں تقسیم عمل کی روز افزوں وسعت اور ترقی کی کوئی گنجایش نہیں۔ جیسے جیسے دخانی جہازوں کی ایجاد و ترقی ہوئی ریلوں کا جال پھیلتا گیا۔ نہریں نکالی گئیں، تجارتِ خارجہ میں ترقی ہوتی گئی، پیمانۂ کاروبار بڑھتا گیا، اور تقسیم عمل میں ترقی ہوتی گئی۔

ہم جانتے ہیں کہ تقسیم عمل کی ایک قسم ارضی تقسیم عمل یا جغرافیائی تقسیم عمل ہے۔ جغرافی تقسیم عمل اُس وقت تک بر سرِ عمل نہیں آسکتی جب تک کہ بازار میں وسعت نہ ہو۔ کیونکہ جغرافی تقسیم عمل سے مراد ہی یہ ہے کہ ہر ملک یا ایک ہی ملک کے مختلف حصے صرف انھیں اشیاء کی تیاری اور پیداواروں کے لیے مخصوص ہو جائیں جنھیں وہ زیادہ آسان اور مقابلتہً کم مصارف سے تیار کر سکیں، اور بعد ازاں ایک دوسرے کے

جغرافی خصوصیات اور محنت کے نتائج سے مستفید ہوں۔ غرض ایک خطۂ ملک یا ایک ملک کا دوسرے ملک کے محنت کے نتائج سے مبادلہ ضروری ہے، گویا بازار کی وسعت اس تقسیمِ عمل کے لیے شرطِ لازم ہے۔

حالیہ کساد بازاری میں جب کہ تجارتِ خارجہ بہت کچھ گھٹ گئی تھی اور بین الاقوامی بازار محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ تقسیمِ عمل خصوصاً جغرافی تقسیمِ عمل پر بہت ہی مضرت رساں اثرات مترتب ہوئے ہیں۔



محمد عنایت حسین بی، اے (عثمانیہ)

حیدرآباد دکن کی صبح[1]

(دیکاجی ہوٹل سے)

شہر اب تک سو رہا ہے نیند کی آغوش میں / وید محوِ فکر ہے اس منظرِ خاموش میں
ہلکی ہلکی چاندنی، جھونکے ہوا کے کیف بار / ہو رہی ہے جذب گویا ذرّے ذرّے میں بہار
ہے فلک پر ملگجے بادل کا اک ٹکڑا رواں / یا جھکولے کھا رہی ہے کشتیِ بے بادباں
ناؤ دن کی گھومتی ہے رات کے گرداب پر / صبح لیکن سو رہی ہے بسترِ کمخواب پر
بخششِ فطرت سے قسمت جاگ اٹھی دید کی / سمتِ مشرق دفعتاً پھوٹی کرن خورشید کی
روشنی میں لٹ رہی ہے دولتِ نورِ سحر / آبِ زر سے ڈھل رہے ہیں کہنہ سقف و بام و در
ذرہ ذرہ فیضِ خاور سے بہشت آثار ہے / دامنِ کہسار میں اک حسن کا بازار ہے
قصرِ عالی کر رہے ہیں کوہ سے سرگوشیاں / شوق میں جن کے دروں پر جھک رہا ہے آسماں
سبز پوش اشجار زریں چادریں اوڑھے ہوئے / صبح کی دیوی کے آگے دست بستہ ہیں کھڑے
اک طرف ہیں طائروں کے نرم و نازک چہچہے / دوسری جانب حسینوں کے رسیلے قہقہے
اوس نے موتی لٹائے ہیں زمیں پر اس قدر / جھک رہا ہے بار سے احسان کے سبزے کا سر

. . . .

سمتِ مغرب غم کناں ہیں قطب شاہی مقبرے / جن کے نظارے سے دل کے زخم ہوتے ہیں ہرے
سامنے بالا حصارِ قلعہ کی بارہ دری / کر رہی ہے سب پہ ثابت آج اپنی برتری
کیا متانت آفریں ہے شہرِ ویراں[2] کی فصیل / جھک چکے ہیں جس کے آگے فرقِ شاہانِ جلیل
اس زمینِ مہر و مہ پر بے کسی ہے حکمراں / دہر میں مشہور ہیں جس کی زمرد خیزیاں
جس کی مٹی سے اٹھے وہ صاحبِ سیف و قلم / دیدۂ مشرق ہے جن کے واسطے صدیوں سے نم

. . . .

[1] اس نظم کا ایک حصہ رسالہ "شہاب" میں شائع ہو چکا ہے۔ بعض اہم تبدیلیوں کے بعد اب مکمل نظم ہدیۂ ناظرین ہے۔

[2] گولکنڈہ۔

دلنشیں و دل کشا ہے منظرِ سمتِ جنوب
ہر محل کے پاس ہی کچھ جھونپڑے آباد ہیں
اب تو ہمسایوں سے پڑتا ہے تعیش میں خلل

رودِ موسیٰ کے کنارے مل رہے ہیں زشت و خوب
مہر و الفت کے انھیں سارے فسانے یاد ہیں
مقبروں سے کم نہیں کچھ عہدِ حاضر کے محل

. . . .

ایک ساگر موجزن ہے جوش میں سمتِ شمال
گر فضا پُر کیف ہو اور کھل رہی ہو چاندنی
زور جن موجوں پہ تیراکوں کے چل سکتے نہیں

حسن کا اپنے شبِ مہ پھینکتی ہے جس پہ جال
اس کے ساحل پہ نظر آتی ہیں موجیں حسن کی
ڈوبنے والے کبھی جن کے اچھل سکتے نہیں

. . . .

سمتِ مشرق ضوفشاں ہے حکمتِ عثمانیہ
روشنی میں چل رہا ہے جس کی سارا کارواں

آفتابِ علم، یعنے جامعہ عثمانیہ
ڈھل رہی ہیں آج مستقبل کی امیدیں جہاں

. . . .

کیا فضا ہے، کیا سماں ہے، کیا ہوا ہے فرحناک!
مست ہیں جوشِ جوانی میں نہالانِ چمن

ہر قدم پر دامنِ دل ہو رہا ہے چاک چاک
کیا شباب آور ہے صبحِ حیدرآبادِ دکن!

. . . .

چہرۂ گیتی ابھی بے انتہا معصوم تھا
سامنے "بس" آ کے ٹھیرے گی کسے معلوم تھا!
اس قیامت نے متاعِ فکر کر دی پائمال
پرزے پرزے ہو گئی کھنچتے ہی تصویرِ خیال

سید سکندر علی وجد

بی، اے (عثمانیہ) ایچ، سی، ایس

مسعود مرحوم علامہ اقبال ور مجلۂ عثمانیہ

رسالۂ اردو کے مسعود نمبر میں "مسعود مرحوم" کے عنوان سے علامہ اقبال مرحوم کی یہ نظم چھپی ہے:—

یہ مہر و مہ، یہ ستارے، یہ آسمانِ کبود — کسے خبر کہ یہ عالم عدم ہے یا کہ وجود
خیالِ جادہ و منزل فسانہ و افسوں — کہ زندگی ہے سراپا رحیلِ بے مقصود
رہی نہ آہ! زمانے کے ہاتھ سے باقی — وہ یادگارِ کمالاتِ "احمد و محمود"
زوالِ علم و ہنر مرگِ ناگہاں اس کی — وہ قافلے کا متاعِ گراں بہا "مسعود"
مجھے رُلاتی ہے اہلِ جہاں کی بے دردی — فغانِ مرغِ سحر خواں کو جانتے ہیں سرود
نہ کہہ کہ صبر میں پنہاں ہے چارۂ غمِ دوست — نہ کہہ کہ صبر معمائے موت کی ہے کشود

"دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
زِ عشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است" (سعدیؒ)

نہ مجھ سے پوچھ کہ عمرِ گریز پا کیا ہے؟ — کسے خبر کہ یہ نیرنگ و سیمیا کیا ہے؟
ہوا جو خاک سے پیدا وہ خاک میں مستور — مگر یہ غیبتِ صغریٰ ہے یا فنا؟ کیا ہے؟
غبارِ راہ کو بخشا گیا ہے ذوقِ جمال — خرد بتا نہیں سکتی کہ مدعا کیا ہے؟
دل و نظر بھی اسی آب و گِل کے ہیں اعجاز — نہیں تو حضرتِ انساں کی انتہا کیا ہے؟
جہاں کی روح رواں لَا اِلٰہَ اِلَّا هُوْ — مسیح و میخ و چلیپا یہ ماجرا کیا ہے؟
قصاصِ خونِ تمنا کا مانگیے کس سے — گناہ گار ہے کون؟ اور خوں بہا کیا ہے؟

غمیں مشو کہ بہ بندِ جہاں گرفتاریم
طلسم ہا شکند آں دلے کہ ما داریم

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقامِ حیات | کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات
خودی ہے زندہ تو دریا ہے بیکراں تیرا | ترے فراق میں مضطر ہے موجِ نیل و فرات
خودی ہے مُردہ تو مانندِ کاہ پیشِ نسیم | خودی ہے زندہ تو سلطانِ جملہ موجودات
نگاہ ایک تجلّی سے ہے اگر محروم | دو صد ہزار تجلّی تلافیٔ مافات
مقامِ بندۂ مومن کا ہے ورائے سپہر | زمیں سے تا بہ ثریا تمام لات و منات
حریمِ ذات ہے اس کا نشیمنِ ابدی | نہ تیرہ خاکِ لحد ہے نہ جلوہ گاہِ صفات

خود آگہاں کہ ازیں خاکداں بروں جستند
طلسمِ مہر و سپہر و ستارہ بشکستند

مجلۂ عثمانیہ کے فانی کی غزل سے شروع ہونے والے شمارہ اوّل جلد گیارہ میں ادارہ نے علامّہ مرحوم کے خلوص اور اُن کی سخن گوئی پر یہ تین اعتراضات عاید کیے ہیں:۔(۱) یہ نظم فروتر ہے (۲) فرمایش پر لکھی گئی ہے (۳) سوائے پہلے بند کے نظم کے بقیہ حصے کا مسعود مرحوم سے کوئی تعلق نہیں۔

اب ہم مندرجۂ بالا نظم پر ایک سرسری نظر ڈالیں گے اور دیکھیں گے کہ یہ اعتراضات کس حد تک درست ہیں۔

یہ نظم تین بند پر مشتمل ہے۔ پہلے بند میں مظاہرِ کائنات کی کنہ کے بارے میں حیرانی ظاہر کی گئی ہے "یہ عالم عدم ہے یا کہ وجود" کون جانتا ہے! پھر "یادگارِ احمد و محمود" یعنے سرسید احمد خاں کے پوتے اور جسٹس محمود کے دل بند نواب مسعود جنگ کی وفات پر تاسف کا اظہار کیا گیا ہے۔ آخری دو شعر میں سعدیؔ کے ہمنوا ہو کر فرماتے ہیں کہ جس ہستی سے عشق ہو اُس کی جدائی پر آنسو ڈھلک ہی جاتے ہیں۔

اقبال اس زبردست حادثے اور ناقابلِ تلافی قومی نقصان سے اس درجہ متاثر ہوتے ہیں کہ عامیوں کی طرح اپنے موضوع کا ایک ایک کارنامہ بیان کر کے رونے کی بجائے خود موت و حیات کے فلسفے پر غور کرنے لگتے ہیں۔ سوچتے ہیں کہ انسان مرتا کیوں ہے!۔ اس سے زندگی چھین لینے کا الزام کس پر عاید کیا جا سکتا ہے؟ یہاں

باب پنجم

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

آپ تو امور لشکرکشی اور آئینِ فرماں روائی خوب جانتے تھے۔ بھائی کے ساتھ متعدد معرکوں میں شریک رہے تھے اور خود دست بہ شمشیر ہو کر دشمن سے میدانِ جنگ میں مقابلے کیے تھے۔ تمام پائین گھاٹ اور بالا گھاٹ۔ کرناٹک۔ تلنگانہ اور برار آپ ہی کی قوت بازو سے فتح ہوئے تھے۔ غرض آپ نہ صرف ایک دوراندیش مدبر اور بادشاہ ہی تھے بلکہ تجربہ کار اور ہوشیار سپہ سالار کے لحاظ بھی آپ کا درجہ بڑا تھا۔ بادشاہ ہونے کے بعد سب سے پہلے آپ نے سلطنت کے اندرونی اور بیرونی انتظام اور استحکام کی طرف توجہ کی اور سلطنت کے ہر شعبے میں اصلاحات کرکے اس کی طرف سے اطمینان حاصل کیا اور اپنے پاکیزہ اخلاق اور رفق و ملاطفت سے خاص و عام کو مطیع و منقاد بنا کر ملک کو وسعت دینے کے لیے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ سلطنتِ بہمنیہ کو ہمیشہ سے سرحدِ گجرات کی طرف سے حملے کا خوف لگا رہتا تھا، اس لیے سلسلۂ فتوحات کو شروع کرنے سے قبل آپ نے سرحدِ گجرات کے اہم قلعوں پر اپنے معتبر امیروں کو قلعہ دار مقرر کیا۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد آپ ملک کے مختلف حصّوں سے کثیر لشکر اور جنگی ساز و سامان جمع کرکے فتوحات حاصل کرنے کے لیے ۸۲۶ھ م ۱۴۱۳ء کے آخر میں دارالسلطنت سے باہر نکلے۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

سلسلۂ فتوحات میں سب سے پہلے آپ[1] نے وجیا نگر کی فتح کا ارادہ کیا کیونکہ دیورائے[2]

---

[1] - بہ موجب بیان فرشتہ، ہفت اقلیم اور کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم لیکن برہان مآثر کے مولف کا بیان ہے کہ آپ نے اپنی فتوحات کی ابتدا فتح بیجانگر سے نہیں کی بلکہ فتح مہور سے کی۔ یہ علاقہ پہاڑی تھا۔ وہاں کے لوگوں نے جب آپ کے لشکر کشی کی خبر سنی تو وہ مقابلے کے ڈر سے پہاڑیوں اور جنگلوں میں بھاگ کر چھپ گئے۔ شاہی لشکریوں نے ملک کو لوٹا۔ اس کے بعد آپ بہادر لشکریوں کے ساتھ مرہٹ تشریف لے گئے۔ اس علاقے کو فتح کرنے کے بعد آپ دارالسلطنت کو واپس تشریف لے گئے۔

ان دونوں جنگلوں کا ذکر کسی مورخ نے بیان نہیں کیا ہے۔ شاید یہ معمولی ہونے کی وجہ سے مورخوں نے ان کو نظر انداز کر دیا ہوگا۔ اس کا بھی پتہ نہیں چلتا کہ مہور کہاں واقع ہے۔ مرہٹ سے مراد علاقۂ مرہٹواڑی ہے۔

برہان مآثر کی رو سے آپ نے ۸۱۹ھ م ۱۴۲۵ء میں فتح قلعۂ کلم کے بعد بیجانگر کی فتح کے لیے ایک کثیر لشکر جمع کیا، اور شہر پر حملہ کر کے فتح حاصل کی۔ آپ کے بہادر سپاہیوں نے ملک میں قتل و غارت اور لوٹ مچائی۔ اس کے علاوہ اس علاقے کے کئی شہر اور قلعے بھی فتح کیے گئے۔ ان فتوحات سے کثیر مال غنیمت، قیدی، گھوڑے اور ہاتھی آپ کے ہاتھ آئے۔ اس علاقے کی مکمل فتح کے بعد آپ دارالسلطنت بیدر کو واپس تشریف لائے۔

فیروز شاہ کے آخری عہد حکومت میں والیٔ بیجانگر نے مسلمانوں اور سلطنت بہمنیہ کے ساتھ اس کے پریشانی کے زمانے میں جو کچھ کیا تھا وہ ایک ایک کر کے آپ کو یاد تھا اور اس داغ کو مٹا کر لوگوں کے دلوں میں سلطنت بہمنیہ کی رفعت و عظمت قائم کرنا بھی ضرور تھا اس لیے بادشاہ ہونے کے بعد والیٔ بیجانگر کی بداعمالیوں کی سزا دینے کی غرض سے آپ نے اپنی فتوحات کی ابتدا فتح بیجانگر ہی سے شروع کی ہوگی۔ اور واقعات کے لحاظ سے بھی آپ کی پہلی جنگ یہی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا فرشتے کا قول صحیح اور برہان مآثر کا غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کی تائید کسی تاریخ سے نہیں ہوتی ہے۔ فرشتے کی تائید کئی معتبر تواریخ سے ہوئی ہے۔ ممکن ہے کہ فرشتے نے مہور اور مرہٹ کی فتوحات کو اہمیت نہ ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا ہو۔

[2] - فرشتے نے والیٔ بیجانگر کا نام دیورائے لکھا ہے لیکن کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم کے مورخ نے اپنی تحقیق میں اس کا نام ویرا وجیا لکھا ہے لیکن عبدالرزاق سمرقندی کے سفرنامے سے فرشتے کی تائید ہوتی ہے۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

راجہ وجیانگر نے آپ سے سرکشی شروع کی اور خراج دینے سے انکار کیا۔ اس کے علاوہ فیروز شاہ کے زمانے کی گذشتہ جنگ میں اس کے ہاتھوں جس قدر زبردست نقصان بہمنیوں کو پہنچا تھا، اس کا بدلہ لینا ضرور تھا۔ تاکہ لوگوں کے دلوں میں سلطنتِ بہمنیہ کی وقعت وعظمت قایم رہے۔ پس چالیس ہزار سوار ہمراہ لے کر وجیانگر کی طرف روانہ ہوئے۔ دیو رائے راجۂ وجیانگر کو پہلا واقعہ یاد تھا، اس نے بھی اپنا خوب بندوبست کیا اور رائے ورنگل (تلنگانہ) کی مدد سے مقابلے میں آیا۔ اس کے ساتھ دس لاکھ فوج تھی جو پیادہ، توپچی اور رکابدار پر مشتمل تھی۔ دونوں فوجیں دریائے تنگ بھدرا کے کنارے ایک دوسرے کے سامنے اُتریں اور دیو رائے کی فوج نے بہمنی لشکر کو چوری اور قتل سے تنگ کرنا شروع کیا۔ اس لیے آپ نے اپنے لشکر کے گرد رومیوں کے قاعدے کے موافق دو ہزار آتش خانوں کے راہے لگا کر مورچے بنائے، اور چالیس روز تک آپ وہاں لشکر کے ساتھ خیمہ زن رہے۔ آپ چاہتے تھے کہ دشمن دریا سے اُتر کر آپ کے لشکر پر حملہ آور ہو، اس واسطے آپ نے اپنے لشکر کو حکم دیا کہ تلنگانے کے علاقے کو اور بیجانگر کے دیہات کو جو تنگ بھدرا کے اس طرف تھے خوب غارت کریں تاکہ دشمن غصہ ہو کر حملہ کرے۔ مگر جب دشمن کی فوج نہ آئی تو آپ نے اُمرا کو طلب کر کے مشورہ کیا، اور سب نے مل کر قرآن شریف کی قسم کھائی کہ کل دریا کے پار اُتر کر حملہ کریں گے۔ لیکن اس خبر کے مشہور ہو جانے سے پہلے آپ نے عالم خاں، لودی خاں، اور دلاور خاں سرداران لشکر کے ساتھ دس ہزار فوج لے کر نہایت پھرتی سے دریا پار کیا، اور دشمن پر حملہ آور ہوئے۔ اس وقت اتفاقاً راجہ دیو رائے نیشکر کے ایک ملے میں سو رہا تھا۔ یہ لوگ اتفاقاً اس طرف جا نکلے۔ دیو رائے نے سمجھا کہ وہ قصداً اس کی طرف آ رہے ہیں، اس لیے وہ بہت پریشان ہو کر ملے میں گھس گیا۔ ان لشکریوں نے اوّل نیشکر کھانے کے ارادے سے توڑا، اور ساتھ لے چلنے کے لیے دیو رائے کو ملے کا مالک سمجھ کر پکڑا جس نے اپنا بھیس بدل دیا تھا، اور اس کے سر پر نے شکر کی مولی رکھوا کر اپنے ہمراہ لے چلے۔ راجہ کچھ نہ بولا، اس کو غنیمت سمجھا کہ جان بچی۔ تھوڑی دیر میں خبر اُڑی کہ آپ مع اپنی فوج کے دریا پار اُتر آئے ہیں اور راجہ غائب ہے۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

اس لیے اس کا لشکر تہ و بالا ہو گیا۔ اور سپاہی فوراً سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور شاہی فوج نے دیو رائے کا مال و اسباب سمیٹنا اور قتل و غارت کرنا شروع کیا۔ اس فرصت میں دیو رائے بھی بھاگ گیا اور دوپہر کو وہ اپنے ایک مصاحب امیر سے ملا۔ اس وقت اس نے تاج پہنا اور چتر شاہی سر پر رکھ کر اپنے کو اپنی فوج میں ظاہر کیا جس سے کچھ فوج جمع ہو گئی، مگر اس واقعہ کو اس نے فالِ بد سمجھا اور لڑنے کے بجائے اس نے مجبوراً بھاگ کر بیجا نگر میں پناہ لی۔ اور آپ اپنی فوج کے ساتھ اس کے ملک میں گھس گئے اور مال و متاع پایا۔ اسی تاخت و تاراج کے دوران میں ایام نوروز آگئے، اور مارچ ۱۴۲۳ء م ۸۲۶ھ میں لشکر کا قیام ایک پُر فضا مصنوعی تالاب (حوض) کے کنارے ہوا۔ آپ کو شکار کا بڑا شوق تھا۔ ایک دن آپ چند سواروں کے ساتھ شکار کو نکلے اور ایک ہرن کے پیچھے گھوڑا دوڑا کر لشکر سے چھ کوس کے فاصلے پر اکیلے نکل گئے۔ اور ساتھ کے رفیق بھی جو دو سو کے قریب تھے وہ بھی ادھر ادھر شکار کے پیچھے چلے گئے۔ دشمنوں کے پانچ ہزار سپاہی ایسے موقع کی تلاش میں مدت سے پھر رہے تھے، اور اس کے منتظر تھے کہ جب موقع پائیں آپ کو قتل کر ڈالیں۔ غرض وہ آپ کی تنہائی کی خبر سُن کر گھات سے نکلے اور آپ کو پکڑنے کے لیے دوڑے۔ آپ انھیں پہچان کر سخت مضطرب ہوئے، مگر پھر بھی تجربہ کار بادشاہ تھے ایک طرف دور سے آپ نے ایک چار دیواری دیکھی جو کسی کسان نے اپنے جانور دوپہر کے وقت باندھنے کے لیے بنائی تھی، اس کی طرف رُخ فرمایا۔ کچھ دکنی خادم آپ کے ساتھ تھے۔ ابھی چار دیواری تک نہیں پہنچے کہ آگے نالہ آگیا اور دشمن پیچھے سے آپہنچے، خادم سب قتل ہو گئے، اور اب خود آپ کے قتل یا گرفتاری کی باری آئی تھی کہ یکایک وہ دو سو رفیق تیر انداز جو شکار کے پیچھے چلے گئے تھے اتفاقاً آگئے، اور ان سے لڑنے لگے۔ اس فرصت میں آپ چار دیواری تک پہنچ گئے۔ اب یہ رفیق بھی کچھ قتل ہو ہو کر آپ کے پیچھے لڑتے بھڑتے اسی چار دیواری میں آئے، اور وہاں مورچہ بندی کی۔ دشمن پانچ ہزار تھے اور یہ دو سو بھی نہیں رہے تھے، اور پھر بے سرو سامان، تھکے ماندے اور غیر محفوظ مگر اللہ اکبر کہہ کر مقابلے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ خصوصاً سید حسن بدخشی۔ میر فرخ بدخشی۔ میر علی سیستانی۔ میر علی کرد۔ عبداللہ کابلی۔ خسرو بیگ۔

خواجہ حسن اردستانی۔ خواجہ بیگ قلندر اور خواجہ قاسم صف شکن نے اس روز ایسی داد مردانگی سلطان احمد شاہ
دی کہ آپ ان کی تعریف کرتے رہے۔ غرض کہ سب نے مرنے مارنے پر کمر باندھی۔ بہت سے ولی بہمنی کی فتوحات
مسلمان مارے گئے تھے اور اب دشمنوں نے دیوار توڑنی شروع کی جس کی وجہ سے پریشانی میں اضافہ ہونے لگا۔ مگر اسی اثنا میں ایک لشکری مسمی عبدالقادر بن عیسیٰ بن محمود بن عماد الملک سر سلحداران جو دو صدی منصب دار بھی تھا، اس خیال سے کہ ملک بیگانہ ہے، آپ چند ہمراہیوں کے ساتھ شکار کے لیے تشریف لے گئے ہیں، کہیں دشمن آپ کو آنہ گھیر لیں۔ دو تین ہزار شاہی خاصہ خیل لے کر آپ کی تلاش میں نکلا، اور دور سے یہ ہنگامہ دیکھ کر قریب آیا تو معلوم ہوا کہ دشمنوں نے آپ کو گھیرا ہے، اور اب پکڑنا یا مارا چاہتے ہیں۔ یہ دیکھتے ہی فوراً ان پر حملہ کر دیا۔ گو پانچ سو آدمی مارے گئے، مگر عبدالقادر نے ایک ہزار دشمن سپاہ کو مار کر آپ تک پہنچ کر آپ کی جان بچائی اور دشمن شکست کھا کر بھاگ گئے۔

آپ عبدالقادر کی احتیاط اور عاقبت اندیشی کے باعث اس بلا سے نجات پا کر گویا از سر نو بادشاہ ہوئے۔ آپ جیسے عظیم الشان بادشاہ کا جس کے لاکھوں جان نثار موجود تھے ایک ہی یورش میں ایسی بلا میں گرفتار ہو جانا اور پھر ایسے ورطۂ ہلاکت سے صحیح و سالم بچ کر نکل آنا ایک عجیب واقعہ ہے۔ جان بچانے کے صلے میں آپ نے عبدالقادر کو برادرِ جاں بخش یارِ حق گذار کا لقب اور خطاب خانِ جہاں اور منصب دو ہزاری دے کر سر لشکری و طرفداریٔ برار سے سرفراز فرمایا۔ اور اس کے بھائی عبداللطیف کو جو اس کے ہمراہ تھا خطاب خانِ اعظم مع منصب دو ہزاری دے کر طرفدار و سر لشکر تلنگانہ مقرر کیا۔ میر علی کرد کو لقب کا فرکش اور منصب ہزاری قاسم بیگ کو لقب صف شکن اور منصب پانصدی اور کلّھر[1] اس کی جاگیر میں دیا۔ عبداللہ کابلی کو منصب دار صدہ دے کر جنیر کا حاکم اور خواجہ بیگ کو خطاب قلندر خاں دے کر حسن آباد (گلبرگہ) کا داروغہ بنایا۔ اور چونکہ تیر اندازی سے اس وقت بہت فائدہ

---

[1] احمد نگر کے مغرب میں دکن کا مشہور تاریخی مقام ہے۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

ہوا تھا، اس لیے خواجہ حسن اردستانی اور خسرو بیگ ازبک کو امیر صدہ مقرر کرکے شہزادوں کے استاد تیراندازی مقرر کیا۔ سید حسن بدخشی۔ میر فرخ بدخشی۔ میر علی سیستانی۔ حسن خاں۔ فرخ خاں اور علی خاں کو خطابات اور سہ صدی منصب دے کر خوش کیا۔ غرض آپ نے اس وقت نہایت فیاضی کے ساتھ خطابات۔ انعامات اور جاگیرات دیں اور شہزادوں اور اُمراء کی اولاد کو حکم دیا کہ وہ تیراندازی کی تعلیم حاصل کریں۔ اور خلف حسن بصری ملک التجار کو حکم دیا کہ عراقی۔ خراسانی۔ ماوراالنہری۔ رومی اور عربی تین ہزار تیرانداز ملازم رکھے جائیں۔

غرض کہ جب آپ کو اس بلا سے نجات ملی تو آپ نے اپنی تمام فوج لی اور نہایت احتیاط اور سختی کے ساتھ بیجانگر کا محاصرہ کرلیا اور راجہ کو ایسا تنگ کیا کہ وہ مجبور ہوگیا۔ اور صلح کے شرائط ٹھیراکر تمام پچھلا خراج۔ نفیس اور گراں بہا ہدیے اور طرح طرح کے تحفے اپنے خاصے کے تیس ہاتھیوں پر لاد کر اپنے چھوٹے بیٹے[1] کے ہمراہ نقارہ سرنا وغیرہ باجے بجاکر بھیجا۔ جب اس طرح راجہ کا بیٹا آیا تو اُمراء نے اس کا استقبال کیا اور آپ نے اس سے بغل گیر ہوکر اپنے پاس تخت کے قریب بٹھایا، اور خلعت۔ کمربند۔ خنجر مرصع۔ عربی اور ترکی گھوڑے۔ پانچ چیتے۔ نو شکاری کتے اور تین باز عنایت کیے جو کرناٹکیوں نے کبھی دیکھے نہ تھے۔ اور دریائے کرشنا تک لاکر اسے رخصت کیا اور خود اپنے دارالسلطنت کو واپس تشریف لے گئے۔ آپ اپنے ساتھ بہت سے قیدی لائے جن میں سے دو نام فتح اللہ[2]

---

[1] ۔ فرشتہ نے اس کا نام نہیں دیا ہے۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم میں اس کا نام دیو رائے لکھا ہے۔

[2] ۔ یہ ذات کا ہندو اور راجایان بیجانگر کی اولاد میں تھا۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم میں اس کو ایک برہمن کا لڑکا لکھا ہے جو غلط ہے۔ جنگ میں اسیر ہوکر آنے کے بعد آپ نے اس کو مسلمان کیا اور اس کا اسلامی نام فتح اللہ رکھا۔ اور خان جہاں سپہ سالار و طرفدار برار کو بہ طور غلام کے دے دیا۔ اس نے اس کی اچھی طرح سے پرورش کی خوب پڑھایا، لکھایا، اور حسن قابلیت کو دیکھ کر اپنا معتمد بنایا۔ لیکن جب وہ مرگیا تو یہ سلاطین بہمنیہ کے غلاموں میں شامل ہوگیا اور محمود گاواں کے طفیل عماد الملک کا خطاب اور برار کی طرفداری اور سرلشکری مل گئی تھی۔ ۸۹۵ھ م ۱۴۸۴ء میں وہ مطلق العنان ہوکر "سلطنت عماد شاہیہ" برار کا بانی ہوا جو ۹۸۲ھ م ۱۵۷۴ء تک قایم رہی۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

اور حسن[1]۔ تاریخ دکن میں اب تک زندہ ہیں۔

تلنگانے کے راجہ نے آپ کے خلاف بیجا نگر کے راجہ کو مدد دی تھی' اس لیے آپ نے ایک کثیر فوج جمع کرنے کا حکم دیا اور ۸۲۸ھ م ۱۴۲۴ء میں خود اس لشکر کثیر کے ساتھ تلنگانے پر حملہ آور ہوئے۔ برہان ماثر کے مولف نے لکھا ہے کہ تلنگانے کے لوگ آپ کے آنے کی خبر سُن کر اپنے مکانات اور قلعے چھوڑ کر بھاگ گئے اور آپ نے ملک تلنگانہ کی آخری سرحد پر

---

[1] یہ احمد نگر کے نظام شاہی خاندان کا بانی تھا۔ اصل میں یہ ذات کا برہمن تھا' اس کے اجداد پاتری علاقۂ برار کے پٹواری تھے۔ قحط سالی کے زمانے میں وہ اپنا وطن چھوڑ کر بیجانگر چلا گیا تھا۔ وہاں گدائی یا ملازمت پر اپنی گذر اوقات کرتا تھا یہ اسیروں میں گرفتار ہو کر آپ کے پاس آیا۔ اس کا نام تیما بھٹ تھا' مگر آپ نے اس کو جو حسین اور نوعمر تھا اپنے غلاموں میں شامل کر کے اس کا نام حسن رکھا۔ اپنے بیٹے محمد خاں کے ساتھ مکتب میں شریک کیا۔ اس نے تھوڑے دنوں میں فارسی لکھنا پڑھنا سیکھ لیا۔ یہ ہمیشہ شہزادوں کی صحبت میں رہنے لگا' شہزادۂ محمد خاں جب چھوٹا تھا تو اُس نے حسن بن بہرئیہ کے بجائے بہ تغیر لہجہ حسن بحری کہا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے القاب وخطابات میں اضافہ ہونے لگا۔ محمد شاہ بن ہمایوں شاہ بہمنی نے اس کو نظام الملک کے خطاب سے سرفراز کر کے منصب ہزاری' نقارہ اور ماہی مراتب بھی عطا فرمایا تھا اور خواجہ جہاں عمادالدین محمود گاواں نے اس کو سرلشکر اور طرفدار تلنگانہ مقرر کیا تھا۔ خواجہ جہاں کے قتل کے بعد یہ اس کا قایم مقام ہوا' اور خطاب ملک نایب اور منصب سرلشکر سے بھی سرفراز کیا گیا۔ سلطان محمود شاہ بن محمد شاہ بہمنی کے زمانے میں وکیل السلطنت ہوا۔ آخر یہ اسی بادشاہ کے زمانے میں قتل ہوا' اور اس کے بیٹے احمد نے ۸۹۶ھ م ۱۴۹۰ء میں سلطنت نظام شاہیہ احمد نگر میں قایم کی جو اس کے خاندان میں تقریباً ۱۰۱۶ھ م ۱۶۰۷ء تک قایم رہی۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

پہنچ کر قلعہ مندل اور ورنگل پر قبضہ کیا جو اس علاقے کے خاص قلعے تھے۔ دیورکنڈہ[1] اور راج کنڈہ کے راجاؤں نے آپ کے لشکر سے ڈر کر آپ کے ہاں اپنے قاصد روانہ کر کے اطاعت قبول کی، اور کئی قیمتی تحایف بھیج کر خراج دینا منظور کیا۔ آپ ان پر رحم فرما کر دارالسلطنت بیدر واپس تشریف لے گئے۔ اس حملے کے متعلق فرشتے کا بیان ہے کہ آپ نے ورنگل کے راجہ پر چڑھائی کی اور خود گولکنڈے میں آکر ٹھیر گئے اور خانِ اعظم عبداللطیف طرفدارِ بیدر کو تلنگانے پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ تلنگانے کا راجہ سات ہزار تلنگی سپاہیوں کو لے کر مقابلے کے لیے نکلا اور اپنے کُل آدمیوں سمیت مارا گیا۔ خانِ اعظم عبداللطیف نے تلنگانے کے پایۂ تخت ورنگل پر قبضہ کر لیا۔ خانِ اعظم کی روانگی کے ایک مہینہ بیس روز بعد آپ نے بھی گولکنڈے سے تلنگانے کی جانب کوچ کیا۔ راستے میں آپ کو ورنگل کی فتح کی خبر ملی، آپ ورنگل گئے اور وہ عظیم الشان خزانہ جس کو فرماں روایانِ ورنگل نے مدتوں سے جمع کیا تھا جس پر سلطان محمد تغلق کا بھی قبضہ نہ ہوسکا تھا آپ کے قبضے میں آگیا۔ آپ نے دس بڑے ہاتھی بیس چھوٹے ہاتھی اور ایک ہار جڑاؤ اور چار مروارید کی تسبیحیں اور چالیس ہزار دینار نقد خانِ اعظم کو عنایت کرکے دوسرے مشہور شہروں کی تسخیر کے لیے روانہ کیا۔ اور خود ورنگل میں قیام فرمایا۔ خانِ اعظم تین چار مہینے میں تمام مشہور شہروں پر قبضہ کرکے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس دفعہ بھی آپ نے انھیں شاہی نوازشوں سے سرفراز فرما کر باقی ماندہ ملک تلنگانہ کے قلعوں کی فتح کے لیے روانہ کیا اور خود دارالسلطنت تشریف لے گئے۔

اس فتح کے ایک سال بعد ۸۲۹ھ م ۱۴۲۵ء میں آپ نے قلعہ ماہور[2] کی فتح کا ارادہ کیا۔

---

[1] ۔ دیورکنڈہ ضلع نلگنڈہ میں اب تک تعلقے کا مستقر ہے یہاں کا قلعہ پہاڑ پر بنایا گیا تھا جو آج کل ویران اور خستہ حالت میں ہے۔

[2] ۔ ماہور جنوبی برار میں بان گنگا کے کنارے نہایت مستحکم اور مرکزی مقام ہے، جہاں کا قدیم قلعہ اب تک موجود ہے۔

اس کے متعلق بھی فرشتہ اور برہان مآثر میں اختلاف ہے۔ برہان مآثر کی روایت کے مطابق سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات
قلعۂ ماہور دکن کا ایک بہت مضبوط اور مشہور قلعہ تھا۔ اس کو فتح کرنے کے لیے آپ ایک کثیر فوج
کے ساتھ روانہ ہوئے۔ آپ کی فوجوں نے قلعے کا محاصرہ کیا، اور جو کچھ بھی ملا، لے لیا۔ جب
محاصرے نے طول کھینچا تو آپ نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ محاصرہ اٹھا کر واپس ہو جانا
بہتر ہے، پس آپ اپنی فوج کے ساتھ دارالسلطنت بیدر واپس تشریف لے گئے۔ پھر
اس کے ایک سال کے بعد ۸۳۰ھ م ۱۴۲۶ء میں قلعۂ ماہور پر ایک کثیر فوج کے ساتھ
حملہ آور ہوئے، وہاں کے لوگ قلعہ بند ہو گئے۔ آپ نے اپنی فوج کو انتہائی کوشش
کے ساتھ قلعے پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ آپ کے حکم کے بموجب بہادر سپاہی۔ تیر کمان۔ تلوار
اور نیزوں سے جان توڑ کر لڑے اور قلعہ (خدا کی تائید و مہربانی، اور آپ کی اقبالمندی
اور سپاہیوں کی جان توڑ کوشش سے) فتح ہوا، جس کو آپ سے قبل کوئی بادشاہ فتح
نہ کر سکا تھا۔ فرشتے کا بیان ہے کہ آپ نے قلعۂ ماہور پر لشکر کشی کی جو کچھ زمانے سے بہمنیوں کے
ہاتھ سے نکل کر ایک زمیں دار کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ اگرچہ آپ نے قلعے پر صلح و امان
کے ساتھ قبضہ کیا، لیکن پھر بھی اس زمیں دار کے پانچ چھ ہزار آدمی اس جنگ میں
کام آئے۔ برہان مآثر کی روایت بہ نسبت فرشتے کی صحیح معلوم ہوتی ہے۔

فتح قلعۂ ماہور کے بعد اسی سال آپ شمال میں قلعۂ کلم[1] کی طرف بڑھے، جو ایک باغی
گونڈ کے قبضے میں تھا۔ یہ قلعہ ایک ہی حملے میں فتح ہو گیا۔ فتح کے بعد آپ نے وہاں کئی مسجدیں
تعمیر کرائیں اور ان میں موذن امام مقرر کر کے مساجد میں روشنی کا معقول انتظام کرایا۔
بہ قول فرشتہ آپ نے قلعۂ کلم پر قبضہ کر کے الماس کی کان کو جو حاکم گونڈوانہ کے
تحت تھی، حاصل کی۔ برہان مآثر کا بیان ہے کہ آپ نے قلعۂ کلم اور ماہور کو ایک ہی یورش میں
فتح کیا، جن کو فتح کرنے کی آپ سے پہلے کسی بادشاہ کو توفیق نہیں ہوئی تھی۔

---

[1] کلم جنوب مشرقی برار کا مشہور تاریخی قلعہ ہے، ایک زمانے میں ضلع کا صدر مقام تھا، لیکن اب (ضلع ایوت محل میں) ایک چھوٹا سا گاؤں رہ گیا ہے۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

اس کے بعد تقریباً ایک سال تک آپ نے ایلچپور[1] میں قیام کر کے قلعۂ گاویل[2] کو از سرِ نو بنایا، اور قلعۂ نرنالہ[3] کی مرمت کی۔ یہ دونوں قلعے گجرات، مالوہ اور خاندیس کی سرحد پر واقع تھے۔ اس سے آپ کا مقصد یہ تھا کہ مالوہ، خاندیس اور گجرات کو فتح کریں، جنھیں امیر تیمور نے آپ کے بھائی فیروز شاہ بہمنی کو عطا کیے تھے۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد آپ کا خیال راجۂ بیجانگر کا معقول تدارک کرنے کا تھا جو ہمیشہ تنگ کیا کرتا تھا۔

جب یہ خبر ہوشنگ شاہ[4] والیِ مانڈو (مالوہ) کو معلوم ہوئی تو اس نے ۸۳۳ھ م ۱۴۲۸ء میں نرسنگ والیِ کھیرلا[5] کو جو سلطنت بہمنیہ کا باجگذار تھا اپنی اطاعت کے لیے لکھا، اور جب اس نے نہ مانا تو والیِ خاندیس کی رائے سے دو مرتبہ اس پر حملہ کیا، اور دونوں مرتبہ شکست کھا کر بھاگا، اور اپنی ناکامیوں سے غصے میں آکر تیسری مرتبہ ایک بڑا جرّار لشکر اپنے معتمد اُمراء کے تحت روانہ کیا۔ ان امیروں نے نرسنگ کے مُلک کو تباہ و ویران کر کے بہت سے پرگنوں اور قریوں پر قبضہ کر لیا۔ نرسنگ نے اور زیادہ فوج جمع کرنی شروع کی۔ یہ خبر معلوم کر کے ہوشنگ شاہ خود اپنی باقی فوج کے ساتھ آیا،

---

[1] ایلچپور، برار کا مشہور تاریخی مقام ہے۔ بہمنی سلاطین نے یہاں ایک دارالعلوم قایم کیا تھا، لیکن اب ویران پڑا ہے۔

[2] گاویل، برار کا بہت مستحکم قلعہ تھا، اب ضلع اَمراؤتی میں ویران پڑا ہے۔

[3] نرنالہ شمالی برار کا ایک اور وسیع و مستحکم قلعہ تھا۔ اب اکولا کے ضلع میں واقع ہے، لیکن ویران ہو جانے کے باوجود یہاں مسلمان بادشاہوں کی بہت سی یادگاریں سلامت ہیں۔ خاص کر آب رسانی کے حوض اور زمین دوز نل نہایت ہنرمندی سے بنائے گئے تھے اور ان کے بعض حصے اب تک محفوظ ہیں۔ (از حواشی تاریخ ترجمۂ فرشتہ جلد سوم مولفۂ سید ہاشمی صاحب)۔

[4] فرشتہ، لیکن برہان آثر نے اس بادشاہ کا نام الپ خاں لکھا ہے، اور مانڈو مالوہ کا تاریخی شہر ہے۔

[5] کھیرلا، برار کے شمال میں شہر بیتول کا مشہور قلعہ تھا۔

اور حملہ کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ راجہ نے آپ کے پاس ایلچی کے ذریعے عرضداشت[1] روانہ کی کہ سلطان احمد شاہ ہوشنگ شاہ والیٔ مالوہ کثیر لشکر کے ساتھ اس پر حملہ آور ہوا ہے، اور وہ سلطان فیروز شاہ کا ولی بہمنی کی فتوحات مطیع ہوا تھا اس لیے سب لوگ اس کو آپ کا باجگذار جانتے ہیں، پس امداد اور معاونت کرنے میں کسی طرح کا پس وپیش نہ کرکے جلد مدد کی جائے۔ آپ نے اسی وقت عبدالقادر[2]

---

[1] فرشتہ۔ اس کے برہان مآثر کا بیان ہے کہ کلم فتح کرنے کے بعد آپ بیجانگر کی فتح کے لیے روانہ ہوئے اور جب بیجانگر فتح کرکے بیدر واپس تشریف لائے تو آپ کو نرسنگ والیٔ کھیرلا کی عرضداشت ملی جس میں آپ کی اطاعت اور فرماں برداری کا اقرار کرکے لکھا تھا کہ آپ اس کی مدد کرکے اس کو اس کے ملک والوں کو سرفراز فرمائیں۔

[2] فرشتہ لیکن برہان مآثر کے بموجب عبدالقادر خان جہاں کو روانہ نہیں کیا گیا بلکہ آپ نے نرسنگ کی عرضداشت سے مطلع ہوکر ایک کثیر لشکر کے جمع کرنے کا حکم صادر فرمایا اور بموجب حکم ممالک محروسہ سے اطراف واکناف سے امراء، وزراء، شہزادے اور سپہ دار اپنے اپنے ساتھیوں کے ساتھ حاضر دربار ہوئے۔ آپ خود ایک کثیر لشکر کے ساتھ کھیرلا کی طرف روانہ ہوکر اس کے نواح میں قیام فرمائے تو اس وقت آپ کو اطلاع ملی کہ نرسنگ نے آپ سے عہد شکنی اور بے وفائی کرکے الپ خاں والیٔ مالوہ سے مل گیا ہے اور معاہدہ کیا ہے کہ اگر وہ اس کی مدد کے لیے اس کی سرحد پر آئے گا تو وہ اس کو ایک لاکھ تنکہ دے گا پس الپ خاں اسلامی قوانین اور پیماں کو بھول کر اس کی مدد کے لیے ایک کثیر فوج کے ساتھ روانہ ہوکر کھیرلا میں پہنچا تو آپ مصلحتاً دو تین منزل اپنے ہی علاقے میں ہٹ آئے، اس خیال سے کہ اگر الپ خاں بھی مسلمانوں سے لڑنے کے بجائے لوٹ جائے تو مسلمانوں کی جانیں اور جائیدادیں یقینی طور پر بچ جائیں گی اگر وہ وسوسۂ شیطانی سے دھوکا کھا کر ملک دکن پر چڑھ آئے گا تو واپس آکر آپ اپنی تلوار سے ایسے خیال کو اس کے دماغ سے نکال دیں گے جب امراء، رؤسا، اور سپاہ آپ کے اس ارادے سے آگاہ ہوئے تو ان سب نے دشمن کے سامنے سے واپس ہوجانے کے متعلق آپ سے یہ عرض کرنے کی جرأت کی کہ آپ کا لوٹ جانا دشمن کے لیے باعث جسارت ہوگا، اس لیے بہتر ہے تھوڑی دیر ٹھہر کر ممکنہ کوشش کے ساتھ الپ خاں کا مقابلہ کیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ دشمن کو شکست ہوجائے۔ آپ ان کے معروضے پر التفات نہ کرکے اپنی مملکت کی طرف واپس تشریف لائے۔ جب اس کی خبر الپ خاں کو ملی تو وہ اس کو آپ کے خوف پر محمول کرکے آپ کے تعاقب میں نکلا۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

سرلشکر وطرفدار برار کو حکم دیا کہ لشکر جمع کرکے نرسنگ کی مدد کی جائے اور خود بھی چھ ہزار سواروں کے ساتھ سیر وشکار کرتے ہوئے ایلچپور تشریف لے گئے۔ ہوشنگ شاہ نے قتل وغارت کے بعد کھیرلا کا محاصرہ کیا۔ آپ دو مہینےؔ تک بغیر مقابلے کے ایلچپور میں مقیم رہے، ہوشنگ شاہ نے اس کو آپ کی کمزوری پر محمول کرکے لاف وگزاف کرنا شروع کیا، آپ یہ خبر سُنکر ایلچپور سے کھیرلا تشریف لے گئے، مگر ملا عبد الغنیؔ صدر اور نجم الدین مفتی وغیرہ علماء نے جو آپ کے ساتھ تھے آپ کو جنگ پر آمادہ دیکھ کر کہا کہ اب تک شاہانِ بہمنیہ نے مسلمانوں سے جنگ نہیں کی، اس میں بڑی بدنامی ہے، لوگ کہیں گے کہ ایک غیر مسلم کی حمایت میں مسلمانوں سے جنگ کی۔ آپ پر علماء کے اس کہنے کا بہت اثر ہوا اور مسلمانوں سے لڑنا مناسب نہ سمجھ کر اپنی فوجیں ہٹالیںؔ اور ایلچی بھیج کر ہوشنگ شاہ سے کہلا بھیجا کہ نرسنگ ہمارا باجگذار رہے، اس سے پرخاش نہ کیجئے تاکہ ہم اور آپ دونوں مسلمان آپس میں نہ لڑیں لیکن ہوشنگ شاہ نے اس کو آپ کے عجز پر محمول کرکے اور یہ سمجھ کر کہ آپ کا لشکر پندرہ ہزار ہے، اور اس کے ہمراہ تیس ہزار سوار ہیں آپ کا تعاقبؔ اس طرح کیا کہ جس منزل سے آپ کوچ کرتے تھے وہ اس مقام میں فروکش ہوتا تھا۔ جب آپ نے دیکھا کہ اس طرح کام بگڑتا ہے تو آپ نے علماءؔ کو طلب کیا اور ان سے فرمایا کہ میں آپ کے فتوے شریف پر جہاں تک ممکن تھا

۱و۲و۳ یہ واقعات فرشتے میں مذکور ہیں، برہان مآثر میں نہیں۔

۴- فرشتہ اور برہان آثر میں یہ واقعہ اسی قدر اضافے کے ساتھ ہے کہ آپ کو اپنے علاقے میں دو تین منزل طے کرنے کے بعد ایلچیوں نے اطلاع دی کہ الپ خاں اس طرح شاہی لشکر کا تعاقب کر رہا ہے اور لشکر اسلام سے جنگ کا اصرار کرتا ہے۔

۵- فرشتہ۔ مگر برہانِ مآثر نے اس کو اس طرح پر لکھا ہے:۔ آپ نے مشایخ، علماء اور فضلاء کو طلب کرکے دریافت فرمایا کہ "جب کبھی ایک مسلمان بادشاہ ایک غیر مسلم کی حمایت میں مسلمانوں سے جنگ کرے تو اس سے مقابلہ کرنا از روئے شریعت جائز ہے یا نہیں"، علماء نے جواب دیا کہ "غیر مسلموں کے حمایتیوں سے لڑنا بہ منزلہ جہاد کے سب پر ایسا واجب ہے جیسا کہ ایک

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

عمل کیا اور جو بے غرضی اب تک برداشت کی وہ بہت ہے۔ اب میرا ارادہ ہے کل یہاں سے کوچ کرکے دریائے تاپتی[1] کے کنارے جا کر مقیم ہو جاؤں جو میری ریاست کی سرحد ہے اور جو شخص بلا امتیاز مذہب و ملت وہاں میرے مقابل آئے گا میں اس سے لڑوں گا، ظاہر ہے کہ میں بھی مسلمان فرمانروا ہوں، کوئی مسلمان حریف زبردستی میرے مقابل میں آئے تو خود وہ حریف خدائی بازپرس کا باعث ہوگا نہ کہ میں۔ ایسے معرکہ میں مسلمانوں کے خون کا وبال اس کی گردن پر ہوگا نہ کہ میری۔" علماء نے آپ کی رائے سے اتفاق کیا۔ آپ نے دوسرے دن اپنی فوجوں کو آراستہ کیا اور چار سو جنگی ہاتھی جو جنگ آزما اور مست تھے جا بجا متعین کئے، اور شاہزادہ علاء الدین کو چتر سیاہ دے کر قلب میں اور میمنہ[2] پر خان جہاں عبد القادر کو اور میسرہ پر عبد اللہ خاں نبیرہ اسمٰعیل مغ کو کھڑا کیا، اور

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) دین دار مسلمان کی مدد اور تائید کرنی۔" آپ نے علماء سے فتوے حاصل کرنے کے بعد اُمراء اور سپہ داروں سے فرمایا کہ واپسی سے میرا منشا یہ تھا کہ الپ خاں ایک مسلمان بادشاہ ہے، ہمارے لیے جو ہم مسلمان ہونے کا دعوے کرتے ہیں جائز نہیں ہے کہ جنگ میں مسلمانوں کے لشکر کے ساتھ مقابلے میں سبقت کریں۔ جو ایسا کرتا ہے وہ خدا کا گنہگار ہوتا ہے۔ جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے: الفتنۃ نایمۃ لعن اللہ من انقظہا اس لیے ہم اپنے ملک کی طرف لوٹے تھے کہ اگر الپ خاں ہمارے علاقے میں داخل ہوگا تو ہم اس کے ساتھ جنگ میں سبقت کی تحریک کرنے والے نہیں ہوں گے، کیونکہ اب جب کہ وہ جسارت کرکے ہمارے ملک میں آیا تو ہم پر اس کی تنبیہ کرنی لازمی ہے۔ اس کے بعد آپ نے اپنے لشکر میں تشریف لے جا کر اپنی فوجوں کو بہادری و جواں مردی سے لڑنے کی ترغیب و تحریص دے کر انھیں دشمن کے مقابلے میں آراستہ کیا۔

[1] ۔ فرشتہ، برہان مآثر اور دیگر تواریخ سے اس دریا کے نام کا پتہ نہیں چلتا۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم میں اس دریا کا نام تاپتی لکھا ہے۔ معلوم نہیں کہ اس کا مآخذ کونسی تاریخ سے ہے۔

[2] ۔ یہ تفصیل فرشتے نے دی ہے لیکن برہان مآثر میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

آپ نے خود دو ہزار[1] منتخب سپاہ اور بارہ جنگی ہاتھیوں کو ساتھ لے کر بائیں جانب کمین گاہ میں قیام کیا۔ لڑائی شروع ہوئی، ہوشنگ شاہ پہلے ہی گھمنڈ میں تھا، یہ نہ معلوم تھا کہ آج دوسری حالت ہے، وہ سترہ ہزار آدمیوں سے بڑھا چلا آیا۔ آپ نے کمین گاہ سے خود دو ہزار مسلح آدمیوں اور بارہ جنگی ہاتھیوں سے اس کا شدید مقابلہ کیا۔ مالوی فوجیں نہایت بہادری سے لڑیں، لیکن آخر میں ہوشنگ شاہ سخت شکست کھا کر بھاگا۔ رائے کھیرلا[2] محاصرے سے نکلا اور تعاقب کر کے اس کو راستے میں اور بھی غارت کیا۔ اس وقت ہوشنگ شاہ کے اہل و عیال اور دو سو جنگی ہاتھی آپ کے ہاتھ آئے۔ آپ کو مسلمانوں کی اس خونریزی کا بے حد رنج ہوا۔ آپ نے ہوشنگ شاہ کے اہل و عیال کی بے حد عزت اور خاطر داری کی اور انھیں نہایت اعزاز سے اپنے پانچ سو معتبر سواروں[3] اور خواجہ سراؤں کے ہمراہ ہوشنگ شاہ کے پاس بھیج دیا۔ اس کے بعد نرسنگ[4] مع اپنے بیٹوں کے آپ کی خدمت میں

لے۔ فرشتے میں اس فوج کی تعداد دو ہزار سوار اور بارہ ہاتھی لکھی ہے۔ لیکن برہان مآثر میں لکھا ہے کہ آپ کے ساتھ ڈھائی ہزار زرہ پوش نیزہ باز سوار تھے۔

ٹہ۔ یہ تفصیل فرشتے نے دی ہے۔ برہان مآثر کی دی ہوئی تفصیل اس سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے، اس لیے بیان نہیں کی گئی۔ نرسنگ کے محاصرے سے نکل کر شاہ مالوہ کے تعاقب کرنے کا ذکر برہان مآثر میں نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ جنگ صبح سے شام تک جاری رہی۔ الپ خاں اور اس کی فوجوں نے جان توڑ کوشش کی، مگر انھیں شکست ہوئی اور وہ ہاتھی گھوڑے بارگاہ خیمہ سرا پردہ خوابگاہ حرم خدام اور تمام لوازمات شاہی چھوڑ کر بھاگ گئے۔ آپ کی فوج الپ خاں اور اس کی فوج کا تعاقب کرنا چاہتی تھی، لیکن آپ نے اس کو منع فرمایا اور حاصل شدہ مال غنیمت کو اپنی افواج میں تقسیم کر دیا۔

سہ یہ تعداد ہفت اقلیم اور برہان مآثر کی دی ہوئی ہے۔ فرشتے نے تعداد نہیں دی ہے، لیکن واقعہ کو ایسا ہی بیان کیا ہے جیسا کہ ہفت اقلیم اور برہان مآثر نے۔

سمہ یہ واقعہ فرشتے نے بیان کیا ہے، لیکن برہان مآثر اس کے بالکل خلاف لکھتا ہے کہ آپ نے

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

حاضر ہو کر اپنے ساتھ کھیرلا لے گیا اور بڑی دھوم سے دعوت کی، اور گراں بہا ہدیئے اور تحفے آپ کی خدمت میں پیش کیے جس میں ایک من الماس، یاقوت، اور سچے موتی تھے۔ نرسنگ نے اُمرا کی بھی بہت خاطر و مدارات کی اور ماہور تک آپ کے ہمرکاب آیا اور ماہور سے شاہی خلعت سے سرفراز ہو کر مع اپنے بیٹوں کے کھیرلا واپس گیا، اور آپ اپنے دارالسلطنت کو واپس تشریف لے گئے۔

طبقات اکبری، ہفت اقلیم اور تاریخ مالوہ[1] میں اس جنگ کا واقعہ اس طرح لکھا ہے کہ آپ نے قلعۂ کھیرلا کا محاصرہ کیا۔ رائے کھیرلا نے سلطان ہوشنگ کو اپنی مدد کے لیے اس شرط پر بلایا کہ وہ اس کے روزانہ خرچ کے لیے تین لاکھ تنکہ دیا کرے گا۔ جب ہوشنگ شاہ نزدیک پہنچا تو آپ قلعے کا محاصرہ چھوڑ کر تین منزل پیچھے ہٹے۔ ہوشنگ شاہ نے اس پر قناعت نہ کر کے تین منزل تک آپ کا تعاقب کیا اور آپ اس بے عزتی کو برداشت نہ کر کے پلٹے جس کی وجہ سے ان دونوں بادشاہوں میں لڑائی ہوئی جس کا نتیجہ وہی ہوا جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) نرسنگ کے تمام علاقے پر ماہور تک قبضہ کر کے شاہزادہ محمود خاں کو جاگیر میں دے دیا۔ اور یہ علاقہ شاہزادے کے قید ہونے تک برابر اسی کے قبضے میں قایم رہا۔ آپ الپ خاں کی جنگ سے فارغ ہو کر بیدر تشریف لے گئے (از انگریزی ترجمہ برہان مآثر مترجمۂ میجر کنگ۔ برہان مآثر نسخۂ مولوی عبدالحق صاحب میں جہاں یہ واقعہ مذکور ہے وہاں کے الفاظ بالکل اُڑ گئے ہیں کچھ پڑھا نہیں جاتا اور اس کے بعد کے دو صفحات تو بالکل ہی سفید ہیں)۔

[1] تاریخ مالوہ کا حوالہ فرشتے نے دیا ہے۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات — فرشتے کا بیان ہے کہ آپ نے ۸۳۳ھ م ۱۴۲۹ء میں ملک التجار

لے۔ اسی واقعہ کو برہان مآثر میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے فتح کلم کے بعد ۸۳۰ھ م ۱۴۲۶ء میں ملک التجار خلف حسن بصری کو ایک بہادر اور جرار فوج کے ساتھ کوکن روانہ کیا۔ خلف حسن بصری نے لشکر کے ساتھ کوکن اور بندرگاہوں میں جاکر کافروں کے مکانات اور عمارات کی بیخ کنی کی اور ہر طرف لوگ اس کے حملے کی خبر سن کر پریشان پھر رہے تھے۔ اس نے اس ملک کے کئی قلعے اور شہر فتح کیے اور اپنی بہادری اور نیک نامی کی وجہ سے شہرت حاصل کی۔ آپ نے اس کو شاہانہ عنایات سے سرفراز فرمایا جس کی وجہ سے دکنی اس سے رشک وحسد اور مخالفت کرنے لگے لیکن ان میں اس کو نقصان پہنچانے کی قوت نہیں تھی اس لیے شاہانہ عنایات کی وجہ سے اس کی دولت میں اضافہ ہونے لگا اور اس نے ملک کوکن میں داخل ہو کر تمام قلعے، شہر، بندرگاہ اور پہاڑ فتح کرکے جزیرۂ مہائم پر بھی حملہ کرکے فتح کیا جو شاہان گجرات کے ماتحت تھا۔ وہاں کے باشندوں نے شاہِ گجرات سے شکایت کی اس لیے شاہ گجرات نے ایک کثیر فوج اپنے ولی عہد محمد شاہ کے تحت خلف حسن بصری کی بغاوت فرو کرنے کے لیے روانہ کی۔

آپ نے گجراتی افواج کی آمد کی خبر سن کر اپنے ولی عہد ظفر خاں (جنھیں علاء الدین کا خطاب دیا گیا تھا) کے تحت ایک کثیر فوج ملک التجار کی مدد کے لیے روانہ کی۔ ظفر خاں اپنی فوجوں کے ساتھ جزیرۂ مہایم کی خلیج کے کنارے پر قیام کیا، اور دوسرے کنارے پر محمد شاہ گجراتی اپنی فوجوں کے ساتھ ٹھیرا ہوا تھا۔ تھوڑے عرصے تک دونوں فوجیں ایک دوسرے کے سامنے دن تمام جنگ کے لیے تیار کھڑی رہتی تھیں، لیکن خلیج کو پار کرکے لڑنے کی کسی کی بھی جرات نہ ہوتی تھی۔ جب اس طرح ایک زمانہ گذر گیا تو دکنی امراء نے حسد کی وجہ سے جو انھیں غیر ملکیوں سے تھی شاہزادہ ظفر خاں سے کہا کہ جنگ میں لڑیں گے اور مریں گے تو ہم لیکن نام خلف حسن بصری کا ہوگا۔ شاہزادہ

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) نوجوان تھا، تجربہ نہ رکھنے کی وجہ سے ان مکار دکنی اُمراء کی بے ایمانی اور بدخواہی کو نہ سمجھا اور ان کی عیارانہ چالوں میں آگیا اور خلف حسن بصری کو نہایت پریشانی اور ذلت کی حالت میں چھوڑ کر اپنے لیے ایک بدنامی مول لی۔

جب گجراتی افواج کو اس سازش کی خبر ملی تو وہ اپنی فتح کا یقین کرکے خلف حسن بصری پر حملہ آور ہوئیں۔ خلف حسن بصری بغیر فوج کے اُن کے حملے کو روک نہیں سکتا تھا اس لیے اُس کو مہایم چھوڑنا پڑا اور گجراتی افواج نے اُس کے لشکر کو لوٹا اور اس کے بھائی حسین بن حسن کو قید کرکے گجرات کی راہ لی۔

جب یہ خبر آپ کو ملی تو آپ نے خود جاکر دشمن سے بدلہ لینے کے لیے لشکر کی تیاری کا حکم دیا۔ پس بہ موجب حکم اُمراء اور سپہ سالار اضلاع، قلعوں، شہروں اور جاگیروں سے اپنی اپنی فاتح فوجوں کے ساتھ بیدر میں جمع ہوئے اور آپ نے اس کثیر لشکر کے ساتھ فتح گجرات کے لیے روانہ ہو کر قلعۂ بھول پر جو دکن اور گجرات کی سرحد پر واقع تھا قیام فرمایا۔ آپ کے بہادر لشکریوں نے قلعۂ بھول والوں کی رسد کو روکا اور قلعے کے محاصرے میں مشغول ہوئے۔ اس قلعے کا حاکم غیر مسلم تھا اس نے مضبوط قلعے کے زعم اور سلطان احمد گجراتی کی حمایت کی توقع پر جس کا وہ قدیم الایام سے مطیع و فرماں بردار تھا ایک خط اس مضمون کا اس کے پاس روانہ کیا کہ آپ گجرات کے راستے میں اس کے قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے ہیں اور نہایت عجز و انکسار کے ساتھ لکھا کہ اگر سلطان اپنی عنایت و مہربانی سے اس کو مہلک مصائب سے نجات دلائے گا تو وہ سالانہ ایک کثیر رقم شاہی خزانے میں داخل کیا کرے گا۔ اس وجہ سے سلطان احمد گجراتی قلعۂ بھول کے غیر مسلم حاکم کی امداد کے ارادے سے ایک کثیر لشکر کے ساتھ روانہ ہو کر ایک ہی منزل طے کرکے قلعۂ بھول پہنچ گیا۔ جب آپ کو دشمن کے آنے کی اطلاع ملی تو محاصرے سے ہاتھ اُٹھا کر اس کے مقابلے کے لیے روانہ ہوئے۔ دونوں فوجیں دریا کے کنارے پہنچ کر ایک دوسرے کے مقابلے میں ٹھیریں، اور ان دونوں کے درمیان دریا ہی حائل تھا۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

قلعہ کوکن[1] کے باغیوں کی سرکوبی کا حکم دیا۔ اس نے تھوڑے عرصے میں کل مفسدین کا بہترین طریقے پر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ہر روز دونوں طرف کی فوجیں آراستہ ہو کر ایک دوسرے کے مقابل میں کھڑی ہوتی تھیں، اور دونوں طرف کے بہادر سپاہی دریا کو عبور کر کے لڑنا اور دادِ مردانگی حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن دونوں بادشاہ انھیں اس کی اجازت نہیں دیتے تھے اور مسلمانوں کی خوں ریزی پر راضی نہ ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ تقریباً ایک سال تک دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابلے میں جنگ کے خیال سے ٹھیرے رہے لیکن کسی نے بھی جنگ کی ابتداء نہیں کی جب ایک مدت اس طرح گذر گئی تو دونوں طرف کے علما، و فضلاء درمیان میں آئے اور انھوں نے اپنے وعظ اور نصیحتوں سے جنگ کی بھڑکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کیا، اور دونوں فرماں رواؤں میں صلح کرادی جس کی رو سے طے پایا کہ قلعہ ہول جو ایک زمانے سے گجرات کے قبضے میں تھا، اب بھی اسی طرح اس کے گماشتوں کے ماتحت رہے گا! اور جو کچھ آپ کا ہے وہ آپ کے ماتحت رہے گا۔ اور چند روز بعد دونوں بادشاہوں میں معاہدہ صلح و دوستی ہو کر جھگڑے اور دشمنی کا خاتمہ ہوا جس کی رو سے طے پایا کہ وہ ملکی و دینی اور ملک و ملت کے دشمنوں کے دفع کرنے میں ایک دوسرے کے مدد و معاون رہیں گے اور اسلام کے جھنڈے کو بلند کرنے اور کافروں کے رسوم کے دفع کرنے میں وہ اپنی طرف سے کبھی کوتاہی نہ کریں گے۔ دونوں مسلمان فرماں روا شرایط صلح پر راضی ہو کر ایک دوسرے کو تحفے اور ہدیے بھیجے۔ اور تقریباً سو سال تک ان دونوں میں رابطہ دوستی و محبت قایم رہا، اور سلسلۂ خط و کتابت اور تحایف بھی جاری رہا۔ پس مستقل صلح کی گفت و شنید کے بعد آپ دارالسلطنت بیدر کی طرف روانہ ہوئے۔

تاریخ فرشتہ کے مولف نے اس جنگ کے جو حالات تاریخ محمود شاہی کے حوالے سے بیان کیے ہیں اس سے حسب بالا بیان کی تائید ہوتی ہے۔

[1] کوکن دریائے عمان کے ساحل پر واقع تھا۔

علاج کرکے ملک کو فتنہ و فساد سے پاک و صاف کر دیا، اور روپیہ اور اشرفیاں ہاتھیوں پر لاد کر آپ کی بارگاہ میں گذرانیں۔ آپ نے اس کی کارگذاری سے خوش ہو کر اس کو خلعتِ خاص، کمر بند اور شمشیرِ مرصع مع دیگر شاہی عنایات کے سرفراز فرمایا جو کسی نے اپنے ملازم کو اس قدر عنایت نہیں کیا تھا۔ خلف حسن بصری نے باغیوں کی بیخ کنی کے سلسلے میں جزیرہ مہایم[۱] پر بھی قبضہ کر لیا جو سلطنتِ گجرات کے ماتحت تھا، اس لیے سلطنت بہمنیہ اور سلطنتِ گجرات میں جنگ ہوئی۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

فرشتہ شاہانِ گجرات کے واقعات میں اس جنگ کے واقعہ کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ ۸۳۲ھ م ۱۴۲۹ء میں راجہ کانھا رائے جالوارہ کو جب یقین ہو گیا کہ احمد شاہ والیٔ گجرات ایدر کی فتح کے بعد اس کے علاقے پر چڑھائی کرے گا تو اس نے اپنی بہتری جلاوطنی میں دیکھی۔ جب یہ خبر احمد آباد میں پہنچی تو ایک فوج اُس کے تعاقب میں روانہ کی گئی۔ راجہ کانھا افتاں و خیزاں آسیر و برہان پور میں پہنچا، اور دو ہاتھی یہاں کے حاکم نصیر خاں کی خدمت میں پیش کیے اور اس کے ہاں پناہ گزیں ہوا۔ نصیر خاں نے ظاہراً اس کی مدارات کی، تاہم احمد شاہ گجراتی کے مقابلے کی طاقت اپنے میں نہ دیکھ کر آپ کے پاس ایک سفارشی خط دے کر اس کو بھیج دیا۔ آپ نے کچھ فوج اس کی مدد کو دے کر گجرات کو روانہ کیا جس نے ندربار اور سلطان پور کو خوب تاخت و تاراج کیا۔ اس لیے احمد شاہ گجراتی نے اپنے ولی عہد محمد خاں کو لشکر دے کر بھیجا اور مقرب الملک سپہ سالار اور افتخار الملک سید ابو الخیر اور سید ابو القاسم اور سید عالم وغیرہ سرداروں کو ساتھ کیا۔ ندربار کے قریب گجراتی اور دکنیوں میں جنگ ہوئی۔ دکنی شکست کھا کر بھاگے اور دولت آباد میں آکر پناہ لی۔ جب یہ خبر آپ کو ملی تو آپ نے اپنے ولی عہد شہزادہ علاء الدین اور قدر خاں سرلشکر کو روانہ کیا۔

---

[۱] ۔ مہایم (کلوی مہایم) بمبئی کے تقریباً پچاس میل شمال میں ساحل پر واقع ہے اور اسلامی بادشاہوں کے زمانے میں مشہور شہر تھا۔ مولوی ذکاء اللہ صاحب اور میجر کنگ نے اس کو خاص جزیرہ بمبئی کا قدیم نام قرار دیا ہے۔

سلطان احمد شاہ جب یہ لوگ دولت آباد آئے تو علاء الدین کا خسر نصیر خاں اور راجہ کانھا رائے جالو ابھی دلی بہمنی کی فتوحات آ کر مل گئے۔ جوں ہی یہ متفقہ فوج گھاٹی مانک تک پہنچی تو بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ قدر خاں اور مقرب الملک دونوں سپہ سالار اتفاقاً ایک دوسرے سے مقابل ہو گئے۔ قدر خاں گھوڑے پر سے گر پڑا۔ ملک افتخار الملک نے خاص شہزادہ علاء الدین پر حملہ کر کے شہزادے کے افواجِ خاصہ کو شکست دے کر بڑے بڑے ہاتھیوں کو لوٹ لیا جس سے دکنیوں کو بڑا نقصان پہنچا اور میدان میں نہ ٹھیر سکے۔ نصیر خاں اور راجہ کانھا علاقہ کلند کی طرف بھاگ گئے۔ دکنیوں نے دولت آباد کا راستہ لیا، مگر اسی سال ۸۴۷ھ م ۱۴۴۳ء میں قطب نامی حاکمِ جزیرۂ مہایم جو گجرات کے ماتحت تھا مر گیا۔ آپ اس شکست کی تلافی کی فکر میں تھے، یہ موقعہ ملتے ہی ایک فوج خلف حسن بصری کے تحت روانہ کی جس نے آپ کے حکم سے جزیرۂ مہایم پر قبضہ کر لیا۔

جب یہ خبر گجرات پہنچی تو سلطان احمد گجراتی نے اپنے چھوٹے بیٹے ظفر خاں کو افتخار الملک کی اتابکی میں استردادِ مہایم کے لیے بھیجا، اور مخلص الملک کو توالِ بندر دیو کو بھی اعانت کے لیے لکھا۔ چنانچہ مخلص الملک سترہ جہازوں کا بیڑا لے کر دریا سے اور ظفر خاں خشکی کی طرف سے تھانہ کو چلے جو دکنیوں کے قبضے میں تھا۔ افتخار الملک سر لشکر اور ملک سہراب سلطانی نے شہزادے سے پہلے آ کر محاصرہ کیا، اور جہازوں نے رسد روک دی مگر پھر بھی حاکم تھانہ خوب لڑا اور آخر قلعہ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ شہزادہ تھانہ میں فوجیں مقرر کر کے مہایم کو روانہ ہوا۔ ملک التجار خلف حسن بصری مہایم میں تھا جہاں ساحل کی طرف اس نے کانٹے لگا دیے تھے۔ جب شہزادہ ظفر خاں مع لشکر کے وہاں آیا تو طرفین میں صبح سے شام تک خوب لڑائی ہوئی۔ ملک التجار خلف حسن بصری شکست کھا کر وہیں کسی دوسرے جزیرے میں چلا گیا اور وہاں سے آپ کو مدد کے لیے لکھا۔ چنانچہ آپ نے اپنے چھوٹے شہزادہ محمد خاں اور خواجہ جہاں وزیر کو دس ہزار سوار اور ساٹھ ہاتھی کے ساتھ مدد کے لیے روانہ کیا۔ جب شہزادہ اپنے لشکر کے ساتھ آیا تو ملک التجار خلف حسن بصری محاصرے سے نکل کر شہزادے سے ملا اور بعد مشورے کے دکنی تھانہ کو روانہ ہوئے۔ ظفر خاں بھی وہاں پہنچا۔ پہلے دن صبح سے

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

شام تک دونوں لڑتے رہے، گردکنیوں کو شکست ہوئی اور ملک التجار خلف حسن بصری کا بھائی حسین بن حسن گرفتار ہوا اور دو دکنی سردار مارے گئے اور ملک التجار خلف حسن بصری چاکنہ[1] میں اور محمد خاں دولت آباد میں لوٹ آئے۔ ظفر خاں نے مہایم میں آکر اپنا انتظام کیا اور جو دکنی دریا میں بذریعہ جہاز بھاگ گئے تھے ان کو گرفتار کیا اور بہت سا لوٹ کا مال باپ کے پاس بھیجا۔

اس شکست کی خبر سن کر آپ کو غصہ آیا اور آپ تمام فوج لے کر ۸۴۵ھ م ۱۴۳۱ء میں گجرات کی طرف روانہ ہوئے اور بگلانہ پہنچ کر اس علاقے کو آپ نے تاراج کیا۔ یہاں کا راجہ قلعے میں محصور ہو گیا۔ شہزادہ محمد خاں نے جو اس وقت سرحد گجرات کی حفاظت پر مامور تھا، باپ کو اس کی اطلاع دی اور فوراً نندربار میں آیا۔ آپ بیتول سے اس کے آمد کی خبر سن کر اپنے دارالسلطنت کو واپس ہوئے۔ جب اس کو یہ اطلاع ملی کہ آپ بیتول سے واپس ہو گئے ہیں تو وہ بھی احمد آباد کو لوٹا۔ لیکن پھر یہ خبر ملی کہ آپ بیتول کا محاصرہ کیے ہوئے ہیں اور وہاں کا حاکم ملک سعادت سلطانی محصور ہے تو وہ پھر واپس آیا، اور کہلا بھیجا کہ اگر آپ محاصرہ اُٹھا کر چلے جائیں تو دوستی میں کچھ فرق نہ آئے گا۔ آپ نے اپنے اُمراء سے اس بارے میں مشورہ کیا جنھوں نے اپنے غرور میں اپنی طاقت کا اندازہ نہ کر کے لڑنے کا مشورہ دیا اور قلعے کی فتح میں عجلت سے کام لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قلعے پر بہت سے آدمی مارے گئے اور سلطان احمد شاہ گجراتی کے آنے پر محاصرہ اُٹھانا پڑا۔ آپ نے اپنے سرداروں سے فرمایا کہ ہم کو کئی مرتبہ شکست ہو چکی ہے، اگر یہاں بھی شکست ہوئی تو دکن کی حکومت ہم سے جاتی رہے گی، اس لیے جان توڑ کوشش کرنی چاہیئے۔ آپ نے اپنی فوجوں کو درست کیا اور سلطان احمد گجراتی نے اپنی افواج کی ترتیب شروع کی، دونوں میں جنگ شروع ہوئی۔

---

[1] چاکنہ پونا کے بیس پچیس میل شمال میں ایک مضبوط پہاڑی قلعہ ہے۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

لڑائی کے شروع میں دکنیوں کی طرف سے ایک امیر مسمی اثر در خاں نکلا اور اپنے مقابلے کے لیے کسی کو طلب کیا۔ گجراتیوں میں سے عضد الملک آگے بڑھا اور دونوں سرداروں نے ایک دوسرے پر حملہ کیا، مگر اثر در خاں مغلوب ہو کر قید ہو گیا۔ اس پر طرفین کے لشکر بھڑ گئے اور شام تک خوب لڑتے رہے لیکن دکنیوں کو شکست ہوئی اور ان کا بڑا نقصان ہوا۔ اور بہت سے آدمی مارے گئے۔ اس لیے رات کو وہاں سے کوچ کر کے آپ اپنے دار السلطنت بیدر کو واپس ہوئے۔

تاریخ فرشتہ نے تاریخ الفی اور بہمن نامے کے حوالے سے اس جنگ کے جو حالات لکھے ہیں، ان سے اور طبقات اکبری سے حسب بالا بیان کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن فرشتے کا بیان ہے کہ سراج التواریخ بہمنی میں اس محاصرے کے قصّے کو اور طرح پر لکھا ہے۔ مختصر یہ کہ جب محاصرہ کیے ہوئے دو سال کی مدت گذر گئی تو سلطان احمد گجراتی نے بہ طریق رفق و مدارا آپ سے استدعا کی کہ قلعہ اس کو دے دیا جائے۔ جب آپ نے اس کی استدعا کو قبول نہ فرمایا تو اس نے اپنی سرحد سے کوچ کر کے دکن میں تاخت و تاراج شروع کی۔ اس پر آپ نے محاصرہ اُٹھا لیا۔

اس موقع سے فایدہ اُٹھا کر اپنی سابقہ شکست کا بدلہ لینے کے لیے ہوشنگ شاہ[1] والی مالوہ نے ۸۴۲ھ م ۱۴۳۳ء میں فوج لے کر قلعۂ کھیرلا پر چڑھائی کی اور نرسنگ رائے کو قتل کر کے کھیرلا پر قبضہ کر لیا۔ جب آپ کو اس کی خبر ملی تو مالوے والوں سے مقابلہ کرنے کے لیے بڑھے۔ مگر نصیر خاں والیٔ اسیر نے دونوں بادشاہوں میں صلح کرا دی جس کے بہ موجب برار آپ کے قبضے میں رہا اور کھیرلا ہوشنگ شاہ کو دے دیا گیا۔

برہان مآثر کے مولف نے اس واقعے کو اس طرح لکھا ہے کہ والی مانڈو (مالوہ) سے قلعۂ کھیرلا کے متعلق جھگڑا ہوا۔ آخر بڑے جنگ و جدال کے بعد صلح ہو گئی جس کے بہ موجب قلعۂ کھیرلا والیٔ مانڈو کو دے دیا گیا، اور قلعے کے اس طرف کا علاقہ ممالکِ محروسہ میں شامل

---

[1] فرشتہ۔

کرلیا گیا۔ اس کے بعد دونوں فرماں رواؤں میں دوستی اور موافقت کے عہد وپیمان ہوئے (جو سلطان احمد شاہ ان کی اولاد کے زمانے میں مخالفت ومخاصمت میں مبدل ہوگئے) اور وہ اپنے اپنے دارالسلطنت کو ولی بہمنی کی فتوحات واپس ہوگئے۔ ان دونوں میں جو دوستانہ تعلقات قایم ہوئے وہ گجرات کے جیسے مستحکم نہ تھے۔

جس زمانے میں آپ گجرات اور مالوہ کی جنگوں میں مشغول تھے، اس موقع کو غنیمت خیال کرکے غیر مسلم دشمنوں نے ہر طرف اپنے اپنے علاقوں میں بغاوتیں کیں اور مملکت کے اطراف واکناف کے قلعے، شہر اور سرحدی مقامات کے باجگذار گماشتوں نے بھی سرکشی شروع کی۔ آپ گجرات اور مالوے کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد مفتوحہ علاقوں کی دوبارہ فتح کی طرف متوجہ ہوئے، جہاں کے غیر مسلم حاکموں نے سرکشی شروع کی تھی۔ ایک کثیر فوج جمع کرکے آپ سب سے پہلے تلنگانے کے سرکشوں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوئے۔ تلنگانے کے کئی علاقے بغیر جنگ کے آپ کے قبضے میں آگئے اور بعض قلعوں اور شہروں نے اطاعت قبول کرکے خراج اور مالگذاری برابر ادا کرنے کا اقرار کیا۔ جن علاقوں نے آپ کی اطاعت قبول نہیں کی ان میں آپ کی فوجوں نے قتل وغارت مچائی۔ خدا کی عنایت، اور آپ کی اقبال مندی سے کئی مضبوط قلعے فتح ہوئے جن میں بہت مشہور اور مضبوط قلعہ رام گیر[2] بھی آپ کے قبضے میں آگیا۔ یہ حالت دیکھ کر والیٔ قلعۂ ورنگل کو فکر ہوئی، اور اس نے اپنے اعیانِ سلطنت سے مشورہ کرکے آپ کی خدمت میں ایک وفد روانہ کیا اور فرماں برداری اور اطاعت کے لیے عرضی گذرانی کہ اگر آپ اس کے قصور کو معاف کردیں گے تو وہ خراج گذرانے گا۔ آپ نے اپنی مہربانی سے قلعے کے رہنے والوں کے قصور کو معاف کردیا، اور ضمانت لے کر فوجوں کو لوٹ مچانے سے منع کیا۔ اسی طرح تلنگانے کے جملہ قلعے اور شہر، جو غیر مسلموں کے قبضے میں تھے آپ کے قبضے اور تصرف میں آئے،

---

[1] ۔ برہان مآثر۔

[2] ۔ قلعہ رام گیر جنوب مشرقی برار میں واقع تھا۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

اور جو حکمران خراج دینا قبول کرکے آپ کے مطیع ہوئے آپ نے ان کے علاقے انھی کے قبضے میں بحال رکھے۔ آپ نے ابراہیم سنجر خاں کو سرلشکر بنا کر اور ایک جرار فوج اس کے ماتحت دے کر اس علاقے کی حفاظت کے لیے مقرر کیا اور قلعۂ بھونگیر اور بعض اضلاع اس کی جاگیر میں دیے، اس طرح اس علاقے کو فتح کرنے اور اس کے انتظام سے فارغ ہونے کے بعد آپ اپنے دار السلطنت بیدر کی طرف تشریف لے گئے۔

فرشتے کا بیان ہے کہ ہوشنگ شاہ والیٔ مالوہ سے صلح کرنے کے کچھ عرصے کے بعد آپ کا آخری سفر تلنگانے کی طرف ہوا، اور آپ نے بہت سے زمین داروں کو جنھوں نے شہزادہ داؤد خاں سے سرکشی کی تھی مغلوب کیا۔

عقل کی دوڑ ختم ہو جاتی ہے۔ اب اقبال دل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو طلسموں کو توڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

تیسرے بند میں فرماتے ہیں کہ موت ایک امتحان ہے جس میں کامیابی حاصل کرنے والے "بقائے دوام" کی سند پاتے ہیں۔ یہ وہ راستہ ہے جس پر چل کر بندۂ مومن اپنے اصل مقام تک پہنچ جاتا ہے، جہاں پہنچنے کے بعد عبد اور معبود میں کوئی پردہ حایل نہیں رہتا۔

کیا یہ بتلانے کی ضرورت ہے کہ اس نظم میں "بندۂ مومن" کا اشارہ راس مسعود مرحوم کی طرف ہے، جن کی وفات نے اقبال کے دل پر اس درجہ اثر کیا۔ بالآخر شاعرِ مشرق نے یہ رجائیت آمیز نتیجہ نکالا کہ اصل چیز "خودی" ہے جو غیر فانی ہے۔ سر راس مسعود مرحوم جیسی خودی رکھنے والی ہستیوں کے لیے موت کوئی آفت یا بلا نہیں بلکہ اُن کے جوہر کی تکمیل کا ایک لازمی جزو ہے، چنانچہ علامہ مرحوم نے خود اپنی وفات سے قبل بھی یہی فرمایا:-

"میں موت سے نہیں ڈرتا، میں مسلمان ہوں۔"

غور فرمائیے، اس مرثیے میں اقبال محض رونے رلانے اور آہ و زاری کی ترغیب دینے کی بجائے ایک ابدی مسئلے کے بارے میں کیا کہہ گئے ہیں۔ اس کے باوجود اقبال پر عدم تسلسل اور موضوع سے ہٹ کر بھٹکنے کا الزام عاید کرنے والوں کے متعلق آپ کیا رائے قایم کریں گے؟

اس نظم کو فرمایش کا نتیجہ سمجھنا سراسر غلط ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اقبال مرحوم کی زندگی ہندستان اور خاص کر اسلام کی فلاح کے لیے وقف تھی۔ ہندستان اور مسلمانوں کا نقصان اُن کا اپنا نقصان تھا۔ کیا واقفِ حال اصحاب کے شان و گمان میں بھی یہ خیال آسکتا ہے کہ راس مسعود جیسا محسنِ قوم اور یگانۂ روزگار دنیا سے رخصت ہو جائے تو اظہارِ تاسف کے لیے اقبال جیسے حساس اور صاحب دل شاعر سے فرمایش کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اقبال جیسے دردمندوں کا تو ذکر ہی کیا، معمولی دل و دماغ والے انسانوں سے بھی، اُن کے عزیزوں یا خاص دوستوں کی جُدائی پر رنج کرنے کے لیے فرمایش کی ضرورت نہیں ہوتی! اور علامہ اقبال اپنے پیام اور نصب العین سے ہٹ کر کس کی فرمایش کی تکمیل کرنے والے تھے؟ علاوہ بریں عجیب اتفاق ہے کہ اس مرثیے کو فرمایش کا نتیجہ سمجھنے والے

"بزرگوں" کا ذکر خود علامۂ مرحوم اس نظم میں اس طرح کر گئے ہیں :-

مجھے رُلاتی ہے اہلِ جہاں کی بے دردی ۔ فغانِ مُرغِ سحر خواں کو جانتے ہیں سرود

مزید گُل افشانیاں ملاحظہ ہوں ۔ فرماتے ہیں :- افسوس کہ مسعود بھی اپنے تعلیمی تجربات اور عظمت و خود داری کو لے کر موت کی نیند سو گئے ۔" اس سے "ادارہ" کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ مسعود مرحوم کی عظمت اُن کی ذات سے وابستہ تھی جیسے کسی سرکاری افسر کی ہوتی ہے کیوں کہ تنقید شروع اس طرح فرمائی گئی کہ "نواب مسعود جنگ سر راس مسعود مرحوم اُسی علمی اور معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے جس کے کارنامے دنیا پر آفتاب کی طرح روشن ہیں ...... مسعود جنگ کی ذات اپنے نامور دادا سر سید احمد خاں کے جوشِ عمل اور اپنے لایق باپ جسٹس محمود کی ذکاوت و ذہانت کا سنگم تھی .... عثمانیہ یونیورسٹی کی محرابیں اور مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے بام و در، درسِ مسعود کے احسان سے جھکے رہیں گے .... قوم میں مفکر اور علمی انسانوں کا قحط ہے، جانے والا، اپنا جانشین چھوڑ کر نہیں جاتا ۔" یہ ہے مطلب نگاری کی استعداد ۔ "مفکر اور علمی انسانوں" کی ترکیب بھی خوب ہے ۔ اور پھر اسی کی وجہ سے مصلحِ اعظم سر سید مرحوم اور جسٹس محمود بھی اپنے اس "نادان دوست" کی زد میں آجاتے ہیں ۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں "سر راس مسعود مرحوم، انگریزی عہدہ داروں سے کبھی جھک کر نہ ملتے تھے ۔ وہ جس طرح شکل و صورت کے اعتبار سے وجیہ تھے، اُسی طرح قلب و خمیر کے لحاظ سے خود دار اور حوصلہ مند تھے ۔ اُن کے دل و دماغ مغرب زدگی کے طوفان سے متاثر نہیں ہوئے ۔ راس مسعود مرحوم کی زندگی کا یہ پہلو ہندستانی عہدہ داروں اور ذی مقدرت اصحاب کے لیے اپنے اندر "عبرت" و بصیرت کا درس رکھتا ہے ...."

پڑھنے والوں اور طلبائے جامعہ کو ادارہ مجلۂ عثمانیہ نے لفظ "عبرت" جس طرح استعمال کیا ہے، اس سے البتہ عبرت حاصل کرنی چاہیئے ۔

عابدی

تنقید و تبصرہ

مکاتیبِ غالب ناشر کتاب خانہ ریاست رام پور، مرتبہ امتیاز علی صاحب عرشی ناظم کتابخانہ، قیمت (للعہ)۔

غالب کے متعلق بہت سی کتابیں شایع ہوئیں، لیکن اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کا تعلق ریاست رام پور کے ساتھ کس قدر گہرا تھا۔ غدر سے چند سال پہلے سے لے کر تا دمِ زیست غالب دربارِ رام پور سے فیض یاب ہوتے رہے۔

فاضل مرتب نے ایک طویل دیباچہ بھی لکھا ہے جس سے غالب کی سوانح حیات اور خاص کر دربارِ رام پور کے ساتھ تعلقات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں (۱۱۷) خطوط ہیں جن میں سے (۴۲) نواب یوسف علی خاں اور (۶۵) نواب کلبِ علی خاں کے نام لکھے گئے ہیں۔ دو خطوط صاحبزادہ سید زین العابدین خاں بہادر کے نام ہیں، اور باقی خطوط ریاستِ رام پور کے عہدہ داروں اور ایک مولوی محمد حسن خاں ایڈیٹر "دبدبۂ سکندری" کے نام ہے۔ کتابت نسخ ٹائپ میں ہے، مطبع قیمہ بمبئی میں طبع ہوئی ہے، "مکاتیبِ غالب" ادبیاتِ غالب میں گراں قدر اضافہ ہے اور پرستارانِ غالب کے لیے اس سال کا بیش بہا تحفہ۔

تواریخ کانگریس مصنفہ ڈاکٹر بی پٹا بھائی سیتا رامیا۔ ناشر نیشنل انڈسٹری بک ڈپو موہن لال روڈ لاہور۔ قیمت مجلد (عہ)۔

یہ گیارہ سو صفحے کی ضخیم کتاب کانگریس کی مفصل تاریخ ہے اس کے چھ حصے کیے گئے ہیں اور ہر حصہ متعدد ابواب پر مشتمل ہے۔ اربابِ کانگریس کی چالیس سے زیادہ تصویریں

دی گئی ہیں۔ ممتاز کانگریسیوں کے حالات بھی دیے گئے ہیں۔ کتاب کو ظاہری حسن سے آراستہ کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔

"میری کہانی" پڑھنے کے بعد اس کتاب کو پڑھنا بارِ خاطر ہے۔ اس کے ترجمے میں اصلیت ہے اور وہ ادبیت سے معمور ہے۔ لیکن تواریخ کانگریس کے وہ قارئین جو انگریزی سے ناآشنا ہوں دس۱۰ پانچ۵ صفحے پڑھنے کے بعد کتاب چھوڑ دیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں ایسے انگریزی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن کے لیے اردو الفاظ بہ آسانی مل سکتے تھے۔ صفحہ (۱۶۰) سے صفحہ (۱۸۰) تک صرف بیس۲۰ صفحوں میں حسب ذیل انگریزی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں :۔

میٹنگ، آرگنائزر، ماڈریٹ، کانسٹی ٹیوشن، ایڈمنسٹریشن، سائینٹفک، فرنیچر، پولیٹیکل گائیڈ، امپائر، انسٹی ٹیوشن، پوزیشن، سپرٹ، کنزرویٹیو، پبلک لائف، کیرکٹر، سوشیل رفارمر، ریگولیشن، انڈین ڈیپوٹیشن، آفیسر، ہسٹری، ڈیپوٹیشن، پروٹسٹ، سروسنر، اکسابز ڈیوٹی، بیوروکریسی، ڈرافٹ۔

اسی کتاب میں انھیں الفاظ کے ترجمے دوسرے مقامات پر استعمال کیے گئے ہیں۔ ترجمہ کرتے وقت بہت سہل انکاری سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن جب ہم ناشرین کا یہ اعلان پڑھتے ہیں کہ یہ کتاب صرف تین۳ ہفتے کی شبانہ روز مسلسل محنتوں کا نتیجہ ہے، تو پھر داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے گیارہ سو۱۱۰۰ صفحے کی کتاب کی کتابت اور طباعت اور اس کا بازار میں آجانا اردو طباعتی دنیا کا معجزہ ہے، اور پھر اس قدر ضخیم کتاب صرف ۱۲؎ میں مفت ہی ہے۔ کتابت اور طباعت معمولی سی ہے، لیکن جب عجلت پر نظر کی جائے تو یہی بہت غنیمت ہے۔ فہرست مضامین یا ابواب کی عدم موجودگی اس کتاب کے لیے تکلیف دہ ہے۔

آصفی کہانیاں

مولفہٗ عبدالسلام صاحب ذکی بی۔ اے، بی ٹی ڈی (عثمانیہ) قیمت سرکار عالی سے (عہ) اور عوام سے (۸؍)۔

یہ خانوادۂ آصفی کے حالات کا مجموعہ ہے، جو بچوں کے لیے کہانیوں کی شکل میں

لکھا گیا ہے۔ اس میں گیارہ کہانیاں ہیں، پہلی کہانی میں حضرت آصف جاہِ اوّل کے جدِ امجد کے حالات ہیں، اس کے بعد ہر کہانی میں ہر ایک بادشاہ کا حال سلیس پیرایے میں بیان کیا گیا ہے، اس طرح گیارھویں کہانی میں حضرت آصف جاہِ سادس کے حالات ہیں۔ کتاب کو پرنس والا شان کرنل نواب مکرم جاہ بہادر اطال العمرہٗ کے نام نامی سے معنون کرنے کی عزت حاصل کی گئی ہے۔ ایسی چیزوں کی اُردو ادب میں سخت ضرورت ہے۔ بچوں کے لیے کتابیں لکھنا، اور بالخصوص ایسی کتابیں جو تاریخی واقعات کی حامل ہوں مشکل چیز ہے۔ بچوں کو ابتدا ہی میں اگر اپنے مُلک کے واقعات معلوم ہو جائیں تو نہ صرف تاریخ سے اُنس پیدا ہوگا، بلکہ وہ اپنے مُلک کی تاریخ سے واقف ہو کر مُلک سے محبت کرنا سیکھ لیں گے۔ کتاب میں "پیش لفظ" مولوی عبد المجید صاحب صدیقی نے لکھا ہے، اور مقدمہ مولوی عبد القادر صاحب سروری نے۔ صدیقی صاحب بجا فرماتے ہیں "یوں تو تاریخ ہر وقت، ہر زمانے میں پیشِ نظر رہنی چاہیئے، لیکن اس کا صحیح ذوق اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب کہ اس کو ابتدائی تعلیم کا جز بنا دیا جائے۔" تاریخ ابتدائی تعلیم کا جز اب بھی ہے، لیکن اس کے لیے ایسی کتابیں نہیں جن کو بچوں کے قابل کہا جا سکے۔ زبان کو اور زیادہ آسان بنانے کی کوشش کی جاتی تو اچھا تھا۔ اس میں محاورے زیادہ استعمال کیے گئے ہیں اور بعض مشکل الفاظ کے معنے بھی نہیں دیے گئے۔ کتابت میں "غازی" ایک طرف اور "الدین" دوسری طرف۔ "زین" ایک طرف "دار" دوسری طرف لکھا گیا ہے اس طرح لکھنے سے الفاظ مہمل ہو جاتے ہیں، اس کا خیال نہ صرف مصنفین و مولفین، بلکہ ہر کاتب کو رکھنا چاہیئے۔ بہ حیثیتِ مجموعی مولف کی یہ کوشش قابلِ ستایش ہے۔ امید ہے کہ نونہالانِ مُلک اس سے اچھی طرح استفادہ کریں گے۔

نارجیلستان ماہوار۔ تلچری، مالا بار۔ زیرِ ادارت مولوی سید ہارون "ندوی" قیمت سالانہ ڈھائی روپیے۔

مدیرِ اعزازی	مالک	نگرانِ وصول
اعجاز صدیقی اکبر آبادی	عبد الکریم سیٹھ اختر تلچری	مولانا محوی لکھنوی

نارجیلستان کا پہلا نمبر ہمارے پیشِ نظر ہے۔ فاضل مدیر کا کہنا ہے کہ اس میں مذہبی، تاریخی، ادبی اور

اصلاحی مضامین شایع ہوں گے۔ پہلے نمبر میں جملہ بیش مضامین ہیں جن میں نظموں کی تعداد گیارہ ہے۔ مذہبی مضامین کی تعداد زیادہ ہے۔ نظموں کا معیار بلند ہے، اور نثر کے مضامین بھی برے نہیں۔ لیکن ہم امید کرتے ہیں کہ اعجاز صدیقی اکبرآبادی اور مولانا محوی صدیقی کے مشوروں کے بعد رسالہ ترقی کے منازل طے کرے گا۔ مالابار سے نارجیلستان کا اجرا اس امر کی شہادت کے لیے کافی ہے کہ اردو قراقرم کی چوٹیوں سے راس کماری تک کی عام زبان ہے۔

قابل مدیر "معروضات" میں لکھتے ہیں "یہاں کی فضا بندیان اردو کی فضا ہے، اردو سیکھنے کا نیا نیا ذوق و شوق ہے اس اعتبار سے یہاں کی ادبی دنیا میں ابتدائی مدارج کی چیز پیش کرنے کی ضرورت ہے"۔

اس بیان کے بعد ہم محسوس کرتے ہیں کہ رسالے میں نظم کا حصہ حد سے زیادہ ہو گیا ہے، مبتدیوں کو نظم بہ نسبت نثر کے مشکل معلوم ہوتی ہے۔ نثر کا حصہ زیادہ رہے تو بہتر ہے۔ ہم اپنے معاصر کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

فہرس کتب خانہ سٹی کالج۔ مرتبہ مولوی غلام رسول صاحب مددگار سٹی کالج حیدرآباد۔ قیمت (عالہ)

مولوی غلام رسول صاحب سے ادبی دنیا ناواقف نہیں ہے۔ آپ کو ہندی اور اردو ادبیات سے خاص لگاؤ ہے۔ کتابیات سے بھی خاص دلچسپی ہے اسی لیے مولوی سید محمد اعظم صاحب پرنسپل سٹی کالج نے اپنے مدرسے کے کتب خانے کی فہرس کا کام آپ کے سپرد کیا کتب خانہ سٹی کالج میں فوقانی طلبا کے لیے اردو کتابوں کا اتنا ذخیرہ ہے کہ حیدرآباد کے کسی دوسرے فوقانیہ مدرسے میں نہیں۔ مولوی غلام رسول صاحب نے اس کتب خانے کی ایک فہرس کولن تقسیم کے طریقے پر مرتب کی ہے۔ طریقۂ کولن تقسیم مدراس میں تقریباً پندرہ سال سے رائج ہے، اردو زبان میں اب تک کوئی ایسی کوشش نہیں کی گئی اور نہ علم کتاب داری ہی کو کوئی مستقل علم سمجھا گیا۔ حالانکہ ترقی یافتہ زبانوں میں یہ علم ایک مستقل صورت اختیار کر چکا ہے۔ اور کتاب داری کے مختلف طریقے مثلاً ڈیوی ڈسمل اور کانگرس وغیرہ رائج ہو چکے ہیں۔ اردو زبان میں فہرس کتب کی جدید طریقے سے ترتیب کا سہرا حیدرآباد دکن کے سر رہا۔

محمد اکبر الدین صدیقی

ششماہی رپورٹ

انجمن طیلسانئین عثمانیہ

۲۶؍آبان ۱۳۴۳ف کو انجمن کے جلسۂ عام میں سال ۱۳۴۴ف کے لیے انجمن کی کابینہ کی تشکیل حسب ذیل قرار پائی۔

کلیم الدین صاحب انصاری بی اے ال ال بی وکیل ہائیکورٹ صدر	۲۔ پروفیسر ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی ام اے پی ایچ ڈی نائب صدر
۳۔ محمد غوث ام اے ال ال بی معتمد	۴۔ شنکر جی صاحب بی اے نائب معتمد
۵۔ گنڈے راؤ صاحب ہرد الکر بی اے ال ال بی خازن	۶۔ میر احمد علی خاں صاحب ام اے ال ال بی رکن
۷۔ میر اکبر علی خاں صاحب بی اے بیرسٹر رکن	۸۔ سید محمد صاحب ام اے رکن
۹۔ عبد المجید صاحب صدیقی ام اے رکن	۱۰۔ رگھو بیر علی صاحب بی اے رکن
۱۱۔ میر وزیر علی خاں صاحب بی اے ال ال بی رکن	۱۲۔ محمد داور حسین صاحب بی اے ال ال بی رکن

اس ششماہی میں کابینہ کی اس تشکیل میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ البتہ گنڈے راؤ صاحب خازن انجمن کو بہ اغراض سرکاری طویل مدت کے لیے بلدہ سے باہر رہنا پڑتا ہے، اس لیے کابینہ نے قرار دیا کہ خازن کے فرائض بھی معتمد ہی انجام دے۔

واضح ہو کہ انجمن کے کاروبار کو دو نوعیتوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو خود انجمن کے اندرونی امور دوسرے وہ امور جن کے متعلق انجمن سرکار عالی اور دوسرے سرکاری و غیر سرکاری اداروں کی توجہ مبذول کراتی ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر ہر نوعیت کار کے متعلق

علٰحدہ وضاحت کی جائے۔ پہلے خود انجمن کے اندرونی کاروبار کے متعلق صراحت کی جاتی ہے۔

انجمن کے اندرونی کاروبار انجمن کے کاروبار کی وسعت کے لحاظ سے کام کئی ذیلی اور ملحقہ کمیٹیوں میں تقسیم ہے، بعض کمیٹیاں مستقل ہیں اور بعض عارضی اور وقتیہ۔ مستقل کمیٹیوں میں عثمانیہ بلدی جماعت اور معاشی کمیٹی گو انجمن کی ملحقہ کمیٹیاں ہیں، لیکن اپنے کاروبار میں بڑی حد تک آزاد ہیں۔ ان کے مستقل قواعد انجمن نے منظور کیے ہیں۔

عثمانیہ بلدی جماعت عثمانیہ بلدی جماعت کچھ عرصے سے مصروف عمل ہے، اس کی روئداد کار کے متعلق اس موقع پر کسی زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے، البتہ یہ اشارہ کافی ہے کہ فی الوقت (۱۳) منتخب ارکان مجلس بلدیہ کے منجملہ (۷) ارکان عثمانیہ بلدی جماعت کے رکن ہیں اور جماعت آہستہ آہستہ اپنا وقار قایم کرتی جارہی ہے۔ یہاں یہ صراحت ضروری ہے کہ قواعد عثمانیہ بلدی جماعت کے دفعہ (۱۰) ضمن ب کی رو سے جماعت کی مجلس عاملہ میں کابینہ انجمن کو پانچ ارکان کے مقرر کرنے کا حق حاصل ہے، حسبہ کابینہ نے سال حال کے لیے حسب ذیل اصحاب کو رکن مقرر کیا:-

۱۔ میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر　　۲۔ میر احمد علی خاں صاحب ام، اے، ال، ال، بی

۳۔ محمد غوث ام، اے، ال، ال، بی　　۴۔ شنکرجی صاحب بی، اے

۵۔ میر وزیر علی خاں صاحب بی، اے، ال، ال، بی وکیل ہائیکورٹ

انجمن کے جلسۂ عام منعقدہ ۲۰ ردے ۱۳۴۷ف میں عثمانیہ بلدی جماعت کے قواعد میں متعدد ترمیمات منظور ہوئیں۔ ایک اہم ترمیم یہ منظور ہوئی کہ آیندہ سے جماعت کی رکنیت کے لیے کابینۂ انجمن کی منظوری ضروری نہیں ہے۔ قرار دیا گیا ہے کہ جماعت کی رکنیت کے لیے جملہ ارکان مجلس بلدیہ، جملہ میر محلہ گان اعزازی اور جملہ طیلسانئین عثمانیہ مقیم حدود بلدیہ، جماعت کی مجلس عاملہ کی منظوری کے بغیر جماعت کے رکن ہوسکیں گے، لیکن دوسرے اصحاب کی شرکت کے متعلق یہ امر لازم قرار دیا گیا ہے کہ ان کے نام مجلس عاملہ جماعت میں

پیش ہو کر منظور کیے جائیں۔

معاشی کمیٹی سال حال عثمانیہ بلدی جماعت کی طرح انجمن کے جلسۂ عام منعقدہ ۲۷؍دے ۱۳۴۹ف نے معاشی کمیٹی حیدر آباد کے قواعد منظور کیے۔

ان قواعد کا خلاصہ یہ ہے:۔

۱۔ انجمن طیلسانئین عثمانیہ کی ایک مستقل ذیلی کمیٹی، بنام معاشی کمیٹی قایم رہے گی اس کا نام "معاشی کمیٹی حیدر آباد" ہوگا۔

۲۔ معاشی کمیٹی کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہوں گے:۔

الف، ملک کی معاشی ترقی کے لیے جدوجہد کرنا۔

ب، تعلیم یافتہ افرادِ ملک اور بالخصوص فرزندانِ جامعہ عثمانیہ کی معاشی زندگی کی جدوجہد میں ان کا ہاتھ بٹانا۔

۳۔ معاشی کمیٹی میں ہر وہ شخص شریک ہو سکے گا جو کمیٹی کے اغراض و مقاصد سے دلچسپی رکھتا ہو اور جس کی رکنیت کو کمیٹی کی مجلس عاملہ منظور کرے۔

۴۔ کمیٹی کی رکنیت کا سالانہ چندہ (عہ) سکۂ عثمانیہ ہوگا لیکن ارکان انجمنِ طیلسانئین عثمانیہ بلا ادائی چندہ، رکن متصوّر ہوں گے۔ انجمن طیلسانئین عثمانیہ اپنے ارکان کے سالانہ چندۂ موصولہ کا آٹھواں حصہ ہر سال کمیٹی کو دیا کرے گی۔

۵۔ معاشی کمیٹی کی مجلسِ عاملہ حسب ذیل ہوگی:۔

۱۔ صدر۔ ۲۔ معتمد۔ ۳۔ نائب معتمد۔

چار ارکان جنھیں کابینۂ انجمن طیلسانئین عثمانیہ نامزد کرے گی۔ چار ارکان جن کا انتخاب کمیٹی کا جلسۂ عام ہر سال بہ ماہ آبان بہ ذریعہ خفیہ رائے دہی کرے گا۔

۶۔ صدر معتمد اور نائب معتمد کا انتخاب بھی خفیہ رائے دہی کے ذریعے سالانہ جلسۂ عام میں بہ ماہ آبان ہوگا۔

کمیٹی کے جلسۂ عام منعقدہ ۳۰؍اردی بہشت میں مجلسِ عاملہ کی تشکیل حسب ذیل قرار پائی:۔ صدر، میر محمود علی صاحب ام اے، معتمد، محمد عبدالرحیم صاحب بی اے۔

نائب معتمد محمد علی خاں صاحب بی۔اے۔ ارکان کے لیے راجہ رائے گرداس صاحب، مرزا عبدالباسط بیگ صاحب، خواجہ حمید احمد صاحب اور غلام دستگیر صاحب رشید کا انتخاب عمل میں آیا۔ کابینہ نے اپنی جانب سے حسب ذیل اصحاب کو مجلسِ عاملہ کا رکن مقرر کیا ہے:۔

۱۔ سید محمد احسن صاحب بی۔اے، ال ال بی، وکیل ہائیکورٹ، رکن مجلس بلدیہ۔

۲۔ شنکر جی صاحب بی۔اے۔

۳۔ منوہر سنگھ صاحب ام۔اے، ال ال بی، وکیل ہائیکورٹ۔

۴۔ محمد غوث ام۔اے، ال ال بی۔

یہ کمیٹی ابتدائی امور کو طے کرنے میں مصروف ہے۔

مجلسِ علمیہ عثمانیہ بلدی جماعت اور معاشی کمیٹی کے سوا انجمن کی ایک مستقل ذیلی کمیٹی مجلس علمیہ ہے، گو اس کے لیے ابھی مستقل قواعد کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، لیکن مجلس اپنے کام میں پورے انہماک سے مصروف ہے۔ "مجلۂ طیلسانیین" اس مجلس کے اہتمام میں شایع ہوتا ہے۔ اس مجلہ کے استحکام اور ترقی کے لیے کابینہ نے مد متفرق سے (۵۰۰) روپیہ منظور کیے۔ مزید پچاس روپیے کے لیے جلسۂ عام کی منظوری لی جائے گی۔ مجلہ کی ترقی کے وسایل سوچنے اور اس کی مالی حالت کو مستحکم کرنے کے لیے کابینہ نے قرار دیا ہے کہ کلیم الدین صاحب انصاری، شنکر جی صاحب، ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی اور میر احمد علی خاں صاحب مجلسِ علمیہ سے مشاورت فرمائیں اور کوشش و سعی کا حق ادا کریں۔

میر احمد علی خاں صاحب نے مجلہ کے لیے (۵۰) روپیے کے ایک علاحدہ عطیہ کا وعدہ فرمایا ہے۔

مجلۂ طیلسانیین مجلہ کے متعلق ارکانِ انجمن کو خاص توجہ کرنے کی ضرورت ہے، اس لیے اس کی سالانہ رپورٹ جو کابینہ میں پیش ہوئی یہاں نقل کی جاتی ہے:۔

آذر ۱۳۴۵ف میں "مجلۂ طیلسانیین" کی اجرائی عمل میں آئی اور آبان ۱۳۴۶ف تک چار نمبر شایع ہوئے جس میں مختلف مضامین نظم و نثر کے علاوہ حسب ذیل مقالے بھی شایع ہوئے:۔

۱۔ اردو ادب بیسویں صدی میں۔

۲۔ عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متولیانِ ریاست۔

۳۔ احمد شاہ ولی بہمنی۔

ان میں اوّل الذکر دو مقالے علحدہ کتابی صورت میں ڈھائی ڈھائی سو کی تعداد میں طبع کیے جا چکے ہیں اور آخرالذکر زیر طبع ہے۔ رسالہ طیلسانئین میں دیگر حضرات کے علمی وادبی مضامین اور نظموں اور تنقیدوں کے علاوہ انجمن کی رودادیں بھی شایع ہوتی رہتی ہیں۔

تعداد خریداران | اس وقت تک خریداروں کی تعداد جس میں معطی بھی شامل ہیں صرف (۱۴۰) ہے۔

عطیہ وچندہ | جملہ آمدنی (للعہ) ہے جس میں (سماللعہ) حسب ذیل حضرات کے عطیوں کے بھی شامل ہیں۔

۱۔ انجمن طیلسانئین عثمانیہ	(مار)	۷۔ مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ال ال بی	(عـہ)
۲۔ نواب میر اکبر علی خاں صاحب برسٹر	(صہ)	۸۔ مولوی سید محمد صاحب ایم اے	(عـہ)
۳۔ پروفیسر محمد علی خاں صاحب نظام کالج	(عـہ)	۹۔ نواب عزیز یار جنگ بہادر	(صہ)
۴۔ نواب میر سعادت علی صاحب رضوی ایم اے	(عـہ)	۱۰۔ ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی	(عـہ)
۵۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور	(عـہ)	۱۱۔ مولوی شاہ عالم خاں صاحب	(عہ)
۶۔ ڈاکٹر میر سیادت علی خاں صاحب	(عـہ)	۱۲۔ احمد اللہ صاحب انسپکٹر آبکاری	(صہ)

اخراجات | رسالے کے تمام حسابات آمدنی وخرچ بہ صحت تمام مندرج ومحفوظ ہیں۔

جملہ آمدنی للاصہ

جملہ خرچ للعہ

سلک عـہ

اس وقت سلک میں (عـہ) ہیں جس میں (لے) سال آیندہ کے چندے کے بھی شریک ہیں۔

مختلف رسائل کو تبادلہ اور ریویو کے لیے ملک کی مختلف پبلک انجمنوں استفادۂ عام کے لیے مجلس علمیہ تیس پرچے مفت تقسیم کر رہی ہے۔

کابینہ نے مجلس علمیہ میں بی این چوبے صاحب کی بجائے جنھوں نے مجلس کی رکنیت سے استعفا دے دیا رائے مہندر راج صاحب سکسینہ ام ایس سی کو رکن مقرر کیا ہے۔

عارضی کمیٹیاں | فی الوقت جو عارضی کمیٹیاں قایم ہیں حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ کمیٹی ترمیم دستور۔

۲۔ کمیٹی برائے قیام انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ۔
۳۔ کمیٹی برائے انعقاد جلسۂ عام در بارہ احتجاج تحدید کلیات۔
۴۔ کمیٹی برائے قیام والنٹیر کور۔
۵۔ کمیٹی برائے تکمیل پروگرام انجمن برائے سالِ حال۔
۶۔ کمیٹی اس غرض سے کہ حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس سے طیلسانئین میں دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

کانفرنس طیلسانئین عثمانیہ انجمن کی سالانہ سرگرمیوں میں کانفرنس طیلسانئین عثمانیہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ سالِ حال کی کانفرنس کے لیے مرزا عبدالباسط بیگ صاحب بی اے معتمد مقرر کیے گئے تھے انھوں نے فرض شناسی اور محنت و سرگرمی اور کفایت سے کانفرنس کو کامیاب بنانے کی پوری سعی کی۔ کانفرنس صدرِ انجمن کی صدارت میں بہ تواریخ ۱۵ و ۱۶ ر آذر ۱۳۴۷ف بہ مقام سٹی کالج منعقد ہوئی۔ سالِ حال ڈرامے اور مشاعرے کا انتظام نہ ہو سکا۔ البتہ نمایشِ کتب اور ڈنر کا انتظام عمل میں آیا۔ نیز ریڈیو اسٹیشن پر کانفرنس کے سلسلے میں ایک خاص پروگرام نشر کیا گیا جس میں طیلسانی خواتین نے بھی حصہ لیا۔ کانفرنس پر جملہ اخراجات بشمول ڈنر (۳۴۲ر۶) عائد ہوئے (...) ارکان مجلس استقبالیہ سے وصول ہوئے۔ باقی رقم انجمن کے عام فنڈ سے یا تو ادا ہو چکی ہے یا ادا ہو رہی ہے۔ کانفرنس کے متعلق ایک تفصیلی نوٹ مجلۂ ہٰذا کی گزشتہ اشاعت میں طبع ہو چکا ہے۔

انجمن کے لیے سالِ حال کا پروگرام سالِ حال کے لیے انجمن کا جو لائحۂ عمل ہونا چاہیئے اس کے متعلق کابینہ نے قرار دیا ہے کہ بہ دوران سال امورِ ذیل کی تکمیل کی کوشش کی جائے۔

۱۔ عثمانئین کی مختلف علمی و ادبی کوششوں کو ایک مرکز پر لانے کی سعی۔
۲۔ "مجلۂ طیلسانئین" کو ترقی دینا اور اس کی اصلاح۔
۳۔ نصاب تعلیم نسواں کی ترتیب۔
۴۔ ایک سرمایۂ محفوظ کی فراہمی، تاکہ ایک پریس قایم کیا جا سکے اور اخبار کی اجرائی

ممکن ہو جائے اور طیلسانیئن عثمانیہ کے مختلف علمی کارنامے منظرِ عام پر آسکیں۔

اس سلسلے میں کابینہ نے قرار دیا کہ فراہمی سرمایہ کے لیے پہلے اضلاع میں کام شروع کیا جائے اور اس ضمن میں کام کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے قرار دیا گیا کہ صدر صاحب انجمن حسب صوابدید خود کارروائی عمل میں لائیں۔ صدر صاحب انجمن نے سرمایۂ محفوظ کے فراہم کرنے کی کوشش کے لیے حسب ذیل ارکان کی کمیٹی مقرر کی :-

۱۔ عبدالرؤف صاحب بی، اے، ال، بی۔ ۲۔ سید محمود احمد صاحب بی، اے، ال، بی

۳۔ شنکرجی صاحب بی، اے۔ ۴۔ سید یامین صاحب زبیری بی، اے، ال، بی

۵۔ بنکٹ پرشاد صاحب بی، اے، ال، بی۔ ۶۔ معتمد انجمن۔

۷۔ صدر انجمن۔

اس سلسلے میں معتمد و نائب معتمد نے بیڑ اور پربھنی کا سفر اختیار کیا۔ اس سفر سے کئی ایک فوائد حاصل ہوئے۔ انجمن سے ایک بڑی جماعت واقف ہوگئی، انجمن کا ادب کئی ہاتھوں میں پہنچ گیا۔ تبادلۂ خیالات اور باہمی ارتباط کا موقع ہاتھ آیا، اور اس امر کا احساس ہوا کہ ساری عثمانیہ برادری میں کام کرنے کی تڑپ اور ان میں ملک کی خدمت کا پورا ولولہ موجود ہے۔ بہرحال کام کرنے کے لیے بہت اچھے مواقع حاصل ہیں ضرورت یہ ہے کہ خود ہم مستعدی اور استقلال کو ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔

اغراض و مقاصد انجمن میں وسعت

یہ امر محسوس کیا گیا کہ مملکتِ آصفیہ کی ترقی کے اس عبوری دور میں ایک سے زیادہ مسائل ایسے پیش ہوں گے جن کے متعلق انجمن کو غور کرنے اور اپنی رائے ظاہر کرنے کی ضرورت پیش آئے گی، لیکن دستور انجمن میں جو اغراض و مقاصد مقرر کیے گئے تھے، وہ کافی طور پر وسیع نہیں تھے۔ اس لیے جلسۂ عام منعقدہ ۷، ارہبن ۱۳۵۵ف میں قرار پایا کہ اغراض و مقاصدِ انجمن بہ موجب دفعہ ۲ ضمن ۲ الف دستور انجمن۔ "ملک کی علمی، اخلاقی، معاشی، معاشرتی ترقی کی جد و جہد کرنا اور طیلسانیئن عثمانیہ میں خدمتِ ملک کا احساس پیدا کرنا" کی بجائے حسب ذیل ہوں گے :-

"ملک کی علمی، اخلاقی، معاشی، معاشرتی، اور دیگر ہرجہتی ترقی کی جد و جہد کرنا اور

مفادِ ملک کے تمام مسائل میں حصہ لینا اور نیز طیلسانئین عثمانیہ میں خدمتِ ملک کا احساس پیدا کرنا۔"

اس وسعتِ مقاصد سے انجمن اور کابینہ کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔

تعدادِ ارکان زیرِ تبصرہ ششماہی میں (۱۲) جدید ارکان کی شرکت عمل میں آئی۔ اب انجمن کے ارکان کی تعداد (۴۸۳) ہے۔ بلدہ کے (۳۳۶) اور اضلاع کے (۱۴۷)۔ ضرورت ہے کہ توسیعِ ارکان کے متعلق خود ارکانِ انجمن خاص کوشش عمل میں لائیں۔

انجمن کی شاخیں ورنگل، گلبرگہ، بیڑ، محبوب نگر میں انجمن کی شاخیں قایم ہیں، لیکن تفصیلات سے مطلع نہیں کیا گیا ہے۔ توقع تھی کہ رائچور اور پربھنی میں جلد ایک ایک شاخ قایم ہو جائے گی، لیکن تا حال ان کا قیام عمل میں نہیں آیا۔

انجمن کی توجہ دہانیاں اب ان امور کے سلسلے میں کیفیت پیش کی جاتی ہے جن کے متعلق انجمن توجہ دہانی کا فرض انجام دیتی ہے۔

تحریکاتِ کانفرنس سب سے اول تحریکاتِ کانفرنس کے متعلق کیفیت پیش ہے۔ کانفرنس میں اعلیحضرت بندگانِ عالی متعالی سے اظہارِ عقیدت کی جو تحریک منظور ہوئی وہ بذریعہ تار بارگاہِ خسروی میں گزرانی گئی تھی۔ جناب چیف سکرٹری صاحب پیشیِ خداوندی نے جو جواب مرحمت فرمایا وہ بہ کمالِ بہجت و افتخار ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

His Exalted Highness, appreciates the loyal sentiments expressed therein.

پہلی سالانہ کانفرنس میں یہ قرارداد منظور ہوئی تھی کہ جامعہ عثمانیہ سے متعلقہ مجالس میں ایسے طیلسانئین عثمانیہ کو بھی شریک کیا جائے جن کو جامعہ سے کوئی تعلق ملازمت نہ ہو۔ یہ تحریک یوں تو عرصے سے اربابِ جامعہ کے زیرِ غور ہے اور توجہ دہانی کا سلسلہ جاری ہے لیکن سالِ حال کے اجلاس مجلسِ رفقاء میں میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر کی تحریک کی بنا پر مختلف مجالسِ نصاب میں ایسے عثمانیین کا انتخاب عمل میں آیا ہے جو جامعہ کے دائرۂ ملازمت میں شامل نہیں ہیں، یا جن کا تعلق انٹرمیڈیٹ کالجوں سے ہے یا جن کو

نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تفصیل یہ ہے :۔

۱۔ مجلسِ نصاب انگریزی ۔ فضلِ حق صاحب بی اے (عثمانیہ) بی اے آنرز (کنٹب)، پروفیسر نظام کالج۔

۲۔ مجلسِ نصاب فارسی ۔ غلام دستگیر صاحب رشید ام اے (عثمانیہ) لکچرار فارسی نظام کالج۔

۳۔ مجلسِ نصاب تاریخ ۔ میر محمود علی صاحب ام اے لکچرار سٹی کالج۔

۴۔ مجلسِ نصاب معاشیات و عمرانیات ۔ عبداللطیف صاحب رضوی بی اے (عثمانیہ) بی ایس سی (لندن)۔

۵۔ مجلسِ نصاب ریاضی فنون ۔ وینکٹیش نرسہوان راؤ صاحب پٹواری ام اے لکچرار سٹی کالج۔

۶۔ مجلسِ دینیات لازمی ۔ محمد غوث ام اے ال ال بی

۷۔ مجلسِ ریاضی شعبۂ سائنس ۔ وینکٹیش نرسہوان راؤ صاحب پٹواری ام اے

مجالسِ نصاب اُردو کیمیا اور طبعیات اور مجلس شعبۂ قانون کے لیے جو اسما پیش کیے گئے تھے، وہ غالباً کسی امر ضابطہ کی بنا پر منتخب نہ ہو سکے، البتہ کلیم الدین صاحب انصاری بی اے ال ال بی کا انتخاب بہ حیثیتِ جز وقتی لکچرار شعبۂ قانون میں رکنیت پر عمل میں آیا ہے۔

امتناع مسکرات کے لیے قانون وضع کرنے کے متعلق جو تحریک منظور ہوئی ہے اس کے سلسلے میں کارروائی عمل میں لانے پر محمد عبداللہ پاشا صاحب بی اے ال ال بی رکن مجلس وضع قوانین نے مطلع کیا ہے کہ وہ اس غرض کے لیے قانون کا مسودہ مرتب فرما رہے ہیں۔

امتحان میٹرک کے نصاب میں تاریخ انگلستان کی طرح تاریخ اسلام کو بھی شامل کرنے کے لیے کانفرنس ۴۶ف نے تحریک منظور کی تھی۔ مسجل صاحب جامعہ عثمانیہ نے اب مطلع کیا ہے کہ مجلس رفقاء نے تاریخ اسلام کو نصابِ میٹرک میں بہ طور مضمون اختیاری شریک کرنے کی اجازت دے دی ہے۔

قرض دہندگان کو اپنا کاروبار بعد حصولِ اجازت سرکاری انجام دینے کے لیے کانفرنس ۴۵ف نے تحریک منظور کی تھی، اس کے متعلق محکمۂ معتمدی مالگذاری سے اطلاع ملی ہے کہ مسودۂ قانون قرض دہندگان مرتب ہو چکا اور حکومت کے زیرِ غور ہے اور یہ کہ مسودۂ مذکور کانفرنس کی تحریک پر حاوی ہے، اس سلسلے میں ابھی دو ایک دن بیشتر

سررشتۂ معلوماتِ عامہ نے جو کمیونکے شایع کیا ہے اس سے سرکار عالی کے سارے تجاویز اب عام ہو چکے ہیں۔

۱۳۴۶ف کی کانفرنس میں یہ قرار داد منظور ہوئی تھی کہ ممالکِ محروسہ سرکار عالی کے امتحانات ڈرائنگ کا تعلق بمبئی سے منقطع کر دیا جائے، اور خود سرکار عالی اپنے امتحانات کا انتظام فرمائے۔ اس بارے میں نظامتِ تعلیمات کی اطلاع ہے کہ کارروائی جاری ہے اور جلد اس کے انتظام کی توقع ہے۔

شعبۂ قانون میں ال، ال، بی سے مافوق قانونی تعلیم کے انتظام کے سلسلے میں ۱۳۴۴ف میں کانفرنس نے ایک تحریک منظور کی تھی۔ اس کے سلسلے میں معتمد صاحب جامعہ عثمانیہ نے مطلع کیا ہے کہ کارروائی جاری ہے۔ اس طرح مابعد ام، اے ریسرچ پر جامعہ عثمانیہ میں ڈگری عطا کیے جانے کے متعلق جناب پرو وایس چانسلر صاحب کی اس تجویز سے مطلع کیا گیا ہے کہ "یہ امر پہلے ہی سے جامعہ کے زیرِ غور ہے، اور اس کے متعلق کارروائی ہو رہی ہے۔"

جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل طلبہ کو حصولِ معاش میں اعانت کرنے کے لیے ایک مجلس فراہمیٔ روزگار کی کارروائی انجمن نے ۱۳۴۲ف سے جاری رکھی ہے، اب اس سلسلے میں معتمد صاحب نے مطلع کیا ہے کہ:—

"جامعہ عثمانیہ میں تقررات کا ایک ادارہ قایم کرنے کے لیے جناب نائب معین امیر صاحب کی تجاویز پیش ہونے پر مجلسِ اعلےٰ سے تصفیہ ہوا ہے کہ سرکار عالی کی جانب سے پبلک سروس کمیشن کے مجوزہ قیام کے مدِ نظر سرِ دست اس ادارے کا قیام ملتوی رکھا جائے۔"

کانفرنس کی دوسری تحریکات کے متعلق بھی پوری توجہ سے اربابِ متعلق سے سلسلۂ مراسلت جاری ہے اور کچھ نہ کچھ توجہ ضرور مبذول ہو جاتی ہے۔

تحریکاتِ کابینہ

سالِ حال کابینہ نے جن متعدد اُمور پر اربابِ متعلقہ کی توجہ مبذول کرائی ہے اس کے سلسلے میں بھی کچھ نہ کچھ وضاحت ضروری ہے۔

دستوری اصلاحات

سب کو علم ہے کہ اس وقت ممالک محروسہ سرکار عالی میں دستوری اصلاحات پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی کام کر رہی ہے۔ ہماری برادری کے ایک ممتاز فرد

اور انجمن کے سابق صدر میر اکبر علی خاں صاحب بھی بہ حیثیت رکن شریک ہیں۔ سرکار عالی نے اعلان کیا تھا کہ ملک کے ادارے اگر چاہیں تو اس کمیٹی کے غور کے لیے اپنی اپنی رائے ظاہر کر سکتے ہیں۔ کابینہ نے بھی مجلس وضع قوانین کی توسیع کے سلسلے میں غور کیا۔ جو مراسلہ اور یادداشت معتمد صاحب کمیٹی کے پاس روانہ کی گئی، وہ بہ طور ضمیمہ اس رپوٹ کے ساتھ منسلک ہے۔

جامعہ کے وظائف میں کمی جامعہ عثمانیہ میں طلبا کے وظائف میں جو کمی عمل میں لائی جارہی ہے اور معافیِ فیس کا تناسب جو کم کیا جارہا ہے اس کے متعلق کابینہ نے جو قرارداد طے کی ہے، وہ ارباب جامعہ کی خدمت میں بھیجی گئی ہے۔ اخبارات میں اس کی اشاعت عمل میں آچکی ہے، اس لیے اس کا اعادہ غیر ضروری ہے۔

تحریکات متعلق سررشتۂ عدالت کابینہ نے سررشتۂ عدالت اور تعلیم قانون کے متعلق بھی کئی امور میں سرکار عالی اور جامعہ کو متوجہ کیا ہے مثلاً ۱۔ ال ال بی میں اوّل آنے والے طالب علم کے لیے منصفی کی ایک جائداد محفوظ کی جائے۔ ۲۔ ال ال بی کلاس میں وظائف اور معافیِ فیس کی ضرورت ہے۔ ۳۔ سررشتۂ عدالت میں سیولینس کا داخلہ روک دینا چاہیے۔ ۴۔ امتحان وکالت درجۂ سوم و دوم کی مسدودی عمل میں لائی جائے۔ ۵۔ جونیر وکلا کی بہترین تربیت کا انتظام عمل میں لایا جائے۔ ۶۔ سررشتۂ عدالت میں ماتحت جائدادوں پر ال ال بی کامیاب اصحاب کو زیادہ بہ زیادہ مامور کیا جائے۔

ان امور پر توجہ دلانے کے لیے کابینہ کے ایک وفد نے جناب میر مجلس صاحب عدالت سے ملاقات بھی کی۔ وفد کو توقع ہے کہ ضرور ان معاملات میں مجلس عالیہ عدالت کی توجہ مناسب طور سے مبذول ہوگی

سالِ حال سول سروس، تحصیلداری اور کیڈٹوں کے انتخابات کے سلسلے میں عثمانئین کو جو محرومی نصیب ہوئی، اس کے بارے میں بھی کابینہ اصحابِ مقتدر سے مراسلت کر رہی ہے۔ چنانچہ نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ کی خدمت میں ایک یادداشت روانہ کی گئی۔ اس کا مناسب جواب وصول ہوا ہے اور ابھی سلسلۂ مراسلت جاری ہے۔

خاتمہ انجمن کے کاروبار کے چھ ماہ کی یہ ایک مختصر روداد ہے، اس چھ ماہ کے عرصے میں دفتری طور سے جو کام انجام پایا اور جو مراسلت ہوئی اور کابینہ نے کئی کئی گھنٹے بیٹھ کر جو کام کیا اس کی ساری تفصیلات بہت طویل ہو جائیں گی۔ مختصر یہ کہ کام کرنے اور اس سے اچھے سے اچھے نتائج حاصل کرنے کا ایک سنہری موقع ہمیں حاصل ہے! کامیابی کی بڑی بڑی وسعتیں اپنا دامن پھیلائے پڑی ہیں۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ ہماری طیلسانی برادری اپنی توجہ بڑھائے اور درم و قدم کی اعانت میں ذرا تیز روی بتائے۔

حسابات

آمدنی ۴۶-۱۳۴۵ف کا آغاز (ما للعہ ۱۵/۱/۱۳) کی سلک سے ہوا۔ اس شش ماہی میں موازنہ کے مدات منظورہ کے تحت جو آمدنی ہوئی اس کا حال یہ ہے:-

۱۔ چندۂ ارکان۔ رقم مجوزہ سال تمام (صماد) ہے۔ ۱۳۱ اردی بہشت ۱۳۴۶ف تک (ما ۱ عسہ) وصول ہوئے۔ اس رقم کے منجملہ چندۂ شش ماہیِ اوّل کی بابتہ (ما سعسہ) وصول ہوئے۔ باقی رقم (ماء) سال ہائے گزشتہ کے بقایا کی بابت ہے۔

چندۂ رکنیت کی ادائی کی طرف ارکان صاحبان انجمن زیادہ توجہ مبذول فرمائیں تو مناسب ہوگا۔

مجلہ کی قیمت اور انجمن کے چندے کی وصولی کے لیے جو ریلوے اپیل پارسل کیے گئے، ان کو بعض بلند ہمت طیلسانی برادروں نے لعہ۔ لعہ روپیے بھی ادا کر کے حاصل کیے۔ خدا کرے کہ ایسے مخلص برادروں کی مثالیں دن بہ دن زیادہ ہوتی جائیں۔

۲۔ مد کانفرنس کے تحت (صہ) کا اندازہ تھا۔ (ہیسہ ۲/۶/۷) کی آمدنی ہوئی، (مسے ۲/۶/۷) تو مرزا عبدالباسط بیگ صاحب نے واپس فرمائے، اور (سہ) ۱۳۴۶ف کی کانفرنس کے متعلق شنکرجی صاحب نے ڈاکٹر سید حسین صاحب کے عطیے کی باقی سلک کے سلسلے میں جمع کرائے۔

۳۔ عطیات کا اندازہ سال تمام میں (سماسہ) کیا گیا ہے۔ اس شش ماہی کے دوران میں

(مالِلعہ ۵ر۴ہر) وصول ہوئے (سے ۵ر۴ہر)۔ میرزا ہدعلی صاحب کاملؔ کا یک مشت عطیہ ہے۔ میر احمد علی خاں صاحب نے (عـہ) اور ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی نے (صعـہ) اور سید سراج الدین احمد صاحب ام' اے نے (عـہ) مرحمت فرمائے۔

۴۔ متفرق میں زائد از موازنہ (عـہ ۵ر) وصول ہوئے۔ (عـہ) اعظم خاں صاحب ام' اے کو ۱۳۴۵ف تعمیر عمارت کی کمیٹی کے کام کے سلسلے میں اخراجات کے لیے دیے گئے تھے، اب انھوں نے بہ وجہ قیام اضلاع کام کرنا متعذر خیال کیا اور رقم بازگشت کردی۔

۵۔ سرمایۂ محفوظ کے لیے بینک میں (صہ) نقد وصول ہوئے اس طرح جملہ آمدنی پورے ششش ماہی میں (سماسحیلعہ) ہوئی۔

اخراجات ار ۱ ہر ۱۔ عثمانیہ بلدی جماعت کو جو رقم ادا ہوگی اس کا اندازہ سال تمام میں (للعہ) ہے اس ششش ماہی میں (صـہ) ادا کیے گئے۔

۲۔ تنخواہ ملازمین میں سال تمام (سماللعـہ) کے منجملہ (ماسـہ) ادا ہوئے۔ دو ملازم ہیں، جزو وقتی محرر کو (عـہ) اور کل وقتی ملازم کو (للعـہ) ادا ہونے ہیں۔

۳۔ صادر میں رقم مجوزہ سال بھر کے لیے (للعہ) ہے۔ اس ششش ماہی کے دوران میں (معہ ۸ر) صرف ہوئے۔

۴۔ ٹکٹ ٹپہ میں سال تمام کے لیے (عـہ) کا اندازہ کیا گیا تھا لیکن اسفندیار ۱۳۴۵ف تک (عـہ) صرف ہوئے۔ اس طرح پہلے چھ ماہ میں ہی (عا ۵ر) زائد از موازنہ خرچ ہوئے ہیں، اس زائد خرچ کی بڑی وجہ مراسلت کی زیادتی اور اس کے علاوہ ویلیو پے ایبل پارسلوں کی روانگی ہے، اس پر (سحہ ۱۱ر۸ہر) کا خرچ ہوا، لیکن اس کی وجہ سے اضلاع سے (سحـہ) روپیے وصول ہوئے۔

۵۔ اخراجات کانفرنس کے لیے (ماا) روپیے مجوزہ ہیں اس کے منجملہ سالِ حال کی کانفرنس پر (ماہسـہ) خرچ ہوئے۔

۶۔ خریدیٔ فرنیچر کے لیے (صـہ) کی گنجایش رکھی گئی ہے۔ اس ششش ماہی میں (صـہ) روپیے کا خرچ الماری کی خریدی پر عائد ہوا، سراج الدین احمد صاحب ام' اے کا عطیہ (عـہ) روپیے

المارى كى خريدى كے ليے مخصوص تھا۔

۷۔ اخراجات متفرق کے لیے (صحـــہ) کی رقم مجوزہ ہے تا حال (لہ ـــہ) کا خرچ عائد ہوا۔

کابینہ نے اس مد کے تحت طے کیا کہ مجلۂ طیلسانین کو (صـــہ) کی رقم ادا کی جائے تا حال (صللعـــہ) ادا کیے جا چکے ہیں۔

۸۔ طباعت کے لیے (عـــہ) رقم مجوزہ ہے اس ششماہی میں (عـــہ) کا خرچ عائد ہوگیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ (عـــہ) بابت طباعت رپورٹ انجمن ۴۵ف مجلہ کو ادا کرنے کی کابینہ نے منظوری دی، یہ رقم بہت عرصے سے ادا شدنی تھی۔ توقع ہے کہ دوسری ششماہی میں زائد از موازنہ خرچ عائد ہوگا۔

۹۔ جلد سازی میں (عـــہ) رقم مجوزہ کے نسبت جملہ ۸ر صرف ہوئے۔

۱۰۔ درستیٔ سیکل کے مد میں (عـــہ) منظورہ کے منجملہ (صـــہ) خرچ ہوئے۔

۱۱۔ دورۂ اضلاع کے لیے (صـــہ) منظورہ کے منجملہ (عـــہ) ادا ہوئے۔

۱۲۔ خریدیٔ کتب کے لیے صـــہ
۱۳۔ الونس فراہمی چندہ کے لیے صـــہ } شریکِ موازنہ ہے۔
۱۴۔ امداد کمیٹیان کی غرض سے صـــہ

لیکن ان مدات میں اس ششماہی میں کوئی خرچ عائد نہیں ہوا۔

محمد غوث (معتمد)

*

ضمیمہ

۲۲ر اسفندار ۱۳۴۷ف کو معتمد صاحب دستوری کمیٹی کو جو مراسلہ لکھا گیا اور جو یادداشت روانہ کی گئی اس کی نقل حسب ذیل ہے:۔

نقل مراسلہ

"سررشتۂ معلومات عامہ سرکار عالی نے ۲۲ر دے ۱۳۴۷ف کو عام طور سے یہ اطلاع شایع کی کہ ملک کے مختلف اغراض اور حکومت کے مابین زیادہ موثر اشتراک عمل کے ایسے متبادل طریقوں کی تحقیق کرنے اور ان کے متعلق سفارشات پیش کرنے جو ریاست کے حالات اور ضروریات کے مدنظر موزوں اور قابل عمل ہوں اور جن سے حکومت رعایا کی ضروریات اور جذبات سے ہمیشہ واقف رہ سکے جو کمیٹی حسب فرمان خسروی برسرعمل ہے اس کے افادہ کے لیے اظہار رائے کا ہر خواہش مند ادارہ اپنی تجاویز جناب کی خدمت میں ارسال کرے۔

کابینۂ انجمن طیلسانئین عثمانیہ نے بھی مناسب خیال کیا کہ وہ بھی ان مسائل پر غور کرے۔ کابینۂ انجمن نے جو یادداشت مرتب کی ہے وہ حسب ہدایت کابینہ جناب کی خدمت میں مرسل ہے" امید کہ براہ کرم اس کو کمیٹی کے ملاحظہ میں پیش فرمایا دیا جائے گا۔

انجمن کی جانب سے دستوری کمیٹی پر اس امر کو واضح کیا جانا غالباً نامناسب نہ ہوگا کہ انجمن ملک کی اعلےٰ تعلیم یافتہ جماعت ہونے کے لحاظ سے ہر اس تحریک کی حقیقی اعانت کے لیے تیار رہے جو صحیح اصول پر مملکت آصفیہ کی سیاسی ترقی کی باعث ہو سکے، لیکن سیاسی ترقی کے لیے بنیادی امر جو ملحوظ رہنا لازم ہے وہ یہ کہ ملک کے مختلف فرقوں اور طبقوں میں خیرسگالی اور حقیقی طور سے باہمی اعتماد قایم ہو۔ جہاں کہیں اعتماد موجود نہ ہو وہاں پہلی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ حقیقی طور پر یہ اعتماد پیدا ہو جائے جو بھی اسکیم ملک کی

سیاسی ترقی کی خاطر مرتب کی جائے، اس کو اس بات کا ممد ہونا چاہیئے کہ اعتماد نہ صرف قایم رہے، بلکہ وہ اور قوی تر ہوتا جائے۔ حیدرآباد میں اس قسم کی کوشش کی سخت تر ضرورت ہے کہ ہندوستان میں جو فرقہ وارانہ بے اعتمادی ہے، وہ دور ہوتی جائے۔

انجمن یہ بات محسوس کرتی ہے کہ باہمی اعتماد کے قوی ہونے کے لیے ملک کے دو اہم فرقے ایک دوسرے کو غالب یا مغلوب نہ خیال کریں۔

جیسا کہ منسلک یادداشت سے واضح ہوگا، ملک میں مشترکہ انتخاب اور بلا تحفظ نشست غیر فرقہ وارانہ نمایندگی کی ضرورت ہے۔ توقع ہے کہ ایک عظیم تر حیدرآباد کی خاطر سارے جزوی اختلافات خود بہ خود دور ہو جائیں گے، اور جو اصحاب بھی رکن منتخب ہوں ان کا واحد نصب العین محض خدمت ملک رہے گا۔

ایک فارغ البال اور خوش حال حیدرآباد دائمی وقت اپنی برتری کا سکہ چلا سکے گا جب کہ اس کے جمہوری اداروں میں ایسے نمایندے منتخب ہوں جو سارے فرقہ وارانہ جذبات سے پاک ہوں۔

کابینۂ انجمن، دستوری کمیٹی پر اپنے پورے اعتماد کا اظہار ضروری خیال کرتی ہے اور یہ توقع کرتی ہے کہ کمیٹی کے مباحث کا نتیجہ ایک متفقہ غیر فرقہ وارانہ اسکیم کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ بدقسمتی سے ملک میں یہ خیال عام طور سے پھیلا ہوا ہے کہ اصلاحی اور تعمیری کام میں بھی مختلف طبقات کے حیدرآبادی متحد نہیں ہوسکتے۔ یہ خیال جس قدر جلد دور ہو جائے بہتر ہوگا اور اس کی وجہ سے ملک کی مزید صلاح و فلاح کا سامان مہیا ہوگا۔ توقع ہے کہ دستوری کمیٹی کی رپورٹ سے اس قسم کے خیالات نہ صرف فی الوقت زائل ہو جائیں گے، بلکہ آیندہ پھر کبھی ان کے پیدا ہونے کا احتمال باقی نہ رہے گا۔ یہ امید بے جا نہیں کہ کمیٹی ان اعلیٰ جذبات اور آزاد تصورات سے کام لے گی جو حقیقت میں ملکی ترقی اور قومی برتری کے ضامن ہوسکیں۔

انجمن کی یہ آرزو ہے کہ جناب کی کمیٹی کی مخلصانہ سعی و کوشش سے مملکت آصفیہ کی عظمت و برتری کے لیے متحدہ جدوجہد کا نیا سلسلہ لازوال طور پر شروع ہوگا حب وطن کا

تازہ ولولہ اور خدمتِ ملک کی نئی تپش پیدا ہوگی اور اس کی وجہ سے کیا عجب ہے کہ اس سنسانی کے عالم میں حیات و تازگی کے جسد میں قوت و جوش کی روح از سرِ نو بھرنے کے لیے کوئی پُرزور تگ و پو پھر آغاز ہو اور سلطنت آصف جاہی کی قدر و منزلت کی بقا کے لیے سب فرزندانِ وطن پھر ایک جدید راہِ عمل میں گام زن ہوں اور اس طرح ملک کی آیندہ نسلیں زیادہ باوقار اور زیادہ سربلند ہوں۔

نہ صرف انجمن طیلسانئین عثمانیہ، بلکہ ملک کے تمام بہی خواہوں کی ساری تمنائیں اس نقطہ پر قایم ہیں کہ "حیدرآباد کا نام تمام دنیا میں روشن دماغی، آزادانہ ترقی، اور ہر شخص کے لیے سرچشمۂ ہدایت کا مترادف بن کر گونج اُٹھے" اور سلطنت آصف جاہی کے زیرِ سایہ اعلیحضرت بندگانِ عالی متعالی نواب میر عثمان علی خاں بہادر مدظلہ العالی اپنے تاریخی زرین روایات کے ساتھ قوی تر اور زیادہ پائدار ہو۔ ملک منتظر ہے کہ دستوری کمیٹی ان آرزوؤں کی تکمیل کے لیے کیا قدم اُٹھاتی ہے۔"

یادداشت

دو صدیوں کا طویل زمانہ گزر چکا جب کہ حضرت مغفرت مآب آصف جاہ اول نے سلطنت آصفیہ کی بنیاد رکھی۔ مغفرت مآب نے جن اصولوں کو اپنی کار فرمائی کی اساس قرار دی وہ ہر کامل اور بلند سے بلند سیاست رانی کے ہم پلہ ہے۔ ایسے زمانے میں جب کہ مغلیہ شاہنشاہی میں آثارِ ضعف پیدا ہو کر ہر طرف ناروا قتل و خون کا بازار گرم تھا۔ آسایش و فلاحِ رعایا کی خاطر مغفرت مآب نے "دستوری بادشاہت" کی مثال قایم کرنے کی کوشش فرمائی، اور عملاً یہ ثابت کر دکھایا کہ سرکارِ آصفی اور رعایائے آصفیہ دونوں کا ایک مقصد اور ایک ہی مطمح نظر ہے، جو دستوری اور قانونی حقوق حضرت مغفرت مآب نے رعایائے آصفیہ کو عطا فرمائے وہ قوموں کو شیر و شکر کرنے کا سبب ٹھیرے۔

چند اہم اصول جن پر مغفرت مآب نے اپنی حکمرانی کی بنا رکھی حسب ذیل ہیں:-

۱۔ بادشاہ کو بذاتہ قتل کا حق نہیں ہے۔ شریعت (قانون) کے مطابق حکم جاری ہونا چاہیے۔

۲۔ تمام سزائیں بالکل قانون کے مطابق آزادی کے ساتھ حکام عدالت کو ہی دینی چاہیے۔ ان پر کسی طرح کا کوئی ناجایز دباؤ نہ پڑنا چاہیے۔

۳۔ ناجایز محاصل کا بار ہرگز رعایا پر نہ ڈالا جانا چاہیے۔

۴۔ مذہبی آزادی سب کو حاصل رہے اور رواداری برتی جائے۔

۵۔ رُوسائے غیر سے مسالمت برتی جائے۔

(ماخوذ از وصایا آصف جاہ بہ ناصر جنگ شہید)۔

زمانۂ مابعد میں رُوسائے سلطنتِ آصفیہ نے انھیں اصولوں کو اپنی حکمرانی کی بھی اساس قرار دی۔

اعلیحضرت بندگان عالی کی سلور جوبلی کی تقریب مسعود کے موقع پر صدر اعظم وقت مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنت نے نہایت صحیح طور سے ارشاد فرمایا تھا کہ:-

"حضرت مغفرت مآب آصف جاہ اول نے دکن میں تخت آصفی کی بنیاد رعایا کے ساتھ شفقت، محبت، بے تعصبی اور رعایا کے ہی فائدہ کے لیے حکومت کے زرین اصول پر قایم فرمائی، اور دو صد سالہ عہد آصفیہ میں ہمیشہ استواری کے ساتھ ان ہی اصول پر فرماں فرمائی کا سلسلۃ الذہب قایم ہے۔" (سپاس نامہ منجانب رعایا)۔

تاآں کہ نواب مختار الملک مرحوم نے ملک کے نظم و نسق کو نئے سانچوں میں ڈھالنا شروع کیا۔ گو اس وقت تک آصفی اصول حکمرانی برابر مدار عمل رہے، لیکن ابھی "دستور" اپنے عصری مفہوم میں قایم ہونے نہ پایا تھا، شخصی اور ذاتی حکمرانی کی حیثیت برقرار رہی۔ البتہ یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ اس زمانے میں مجالس صفائی کا قیام عمل میں آیا، اگرچہ حق انتخاب رعایا کو عطا نہیں ہوا، لیکن اراکین غیر سرکاری کے تقرر کا آغاز ہو گیا۔

بہرحال حضرت غفراں مکاں میر محبوب علی خاں نے ۷ ربیع الثانی ۱۳۰۱ھ مطابق ۳۰ اسفندار ۱۲۹۳ف کو زمام سلطنت اپنے ہاتھ میں لی اور قلمدان وزارت نواب عماد السلطنت مرحوم کو عطا ہوا۔ نوجوان شاہ و وزیر نے طے کر دیا کہ نئی صدی کے ساتھ ساتھ امور ملک کا انصرام ایک ضابطہ و آئین کے تحت مشورے سے انجام پانا چاہیے۔ چنانچہ مسند نشینی کے تیسرے ہی ہفتے میں سلخ ربیع الثانی ۱۳۰۱ھ کو پہلی دفعہ "کونسل آف اسٹیٹ" کا اجلاس منعقد ہوا۔ حضرت غفراں مکاں نے اس یادگار تاریخی موقع پر جو گہر ریز کلمات ارشاد فرمائے وہ مملکت آصفیہ کی دستوری تاریخ میں ہمیشہ آب زر سے لکھے جائیں گے حضرت غفراں مکاں نے ارشاد فرمایا کہ:-

"آج شاید حیدرآباد کی تاریخ میں یہ اول روز ہے کہ یہاں کے امرا، بالاتفاق رئیس وقت کے سامنے سرکاری کاموں کی مدد دینے کی غرض سے جمع ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں ایسے تجویزوں کا بہت کم رواج ہے۔ ..... میری بڑی خوشی تھی کہ یہ کونسل مقرر ہو۔ ..... اور میں یہ بھی امید رکھتا ہوں کہ آپ لوگ اپنی ذاتی اغراض کو

سرکاری کاموں میں راہ نہ دو گے اور سب مل کر بالا تفاق کام کرو گے۔ آپ لوگ اگر چاہو تو اپنے ملک کی بہت بھلائی کر سکتے ہو اور ملک کی بھلائی میں میری بھلائی اور عین آپ کی اپنی بھلائی ہے، اس واسطے میں ہرگز پسند نہ کروں گا کہ کوئی رکن اپنی رائے کے خلاف کسی امر میں میری رائے کی تقلید کرے بلکہ مجھ کو یہ امید ہے کہ آپ لوگ ہر مقدمہ میں نیک نیتی اور خیر خواہی کے ساتھ آزادانہ رائے دو گے .... آپ لوگ یقین جانو کہ مجھے ہر فرقہ و ہر گروہ کی رعایت مدنظر ہے میں نہیں چاہتا ہوں کہ کسی کے واجبی حقوق تلف ہوں۔ میں سرکار و رعایا دونوں کے حقوق کی یکساں حفاظت کروں گا اور امرا کی بھی اسی قدر رعایت کروں گا جس قدر غربا کی۔"

(جریدہ اعلامیہ ۴ رجمادی الاول ۱۳۰۱ھ صفحہ ۱۴)

ابتدا میں بہ ذریعۂ فرمان مبارک مورخہ غرۂ ذی حجہ ۱۳۰۲ھ حکم صادر ہوا کہ وضع قوانین کا کام بھی اسی کونسل میں انجام پائے (جریدہ اعلامیہ مورخہ ۴ ارذی حجہ ۱۳۰۲ھ جلد چہارم صفحہ ۲۷۵)۔

کچھ عرصے کے بعد جب "کونسل آف اسٹیٹ" کا عدم و وجود مساوی ہو گیا تو حضرت غفراں مکاں نے اصلاح دستور مملکت پر پھر توجہ فرمائی اور اسفندار ۱۳۰۲ف مطابق ۱۸۹۲ء میں "مملکت آصفیہ" کے نظم کے لیے ایک جدید ضابطہ مرتب فرما کر بہ نام "قانونچہ مبارک" جاری فرمایا۔ اس جدید دستور سے جو نمایاں تغیر عمل میں آیا وہ یہ کہ "کونسل آف اسٹیٹ" کے بجائے "کیبنٹ کونسل" کا قیام منظور فرمایا گیا اور ایک علٰحدہ "مجلس وضع قوانین" کا انعقاد اس غرض سے کیا گیا کہ قوانین و ضوابط کی تدوین قابل و تجربہ کار ملازمین و غیر ملازمین کی مدد اور مشورے سے کی جائے۔" (فرمان مبارک صادر شدہ بہ وقت قیام باب حکومت)۔

مجلس وضع قوانین کے افتتاح کے موقع پر نواب وقارالامرا مرحوم نے نہایت درست کہا تھا کہ کیسی بڑی تمدنی نعمت رعایائے آصفیہ کو حاصل ہوئی۔

یہ ایک امر واقعہ ہے کہ اور ممالک میں رعایا کو یہ حق سال ہا سال کی جدوجہد اور بعض وقت بڑی بڑی قربانیوں کے بعد حاصل ہوا، لیکن حضرت غفراں مکاں نے سلطنتِ آصفیہ کے اس اصلی اصول کے لحاظ سے کہ سرکار آصفی اور رعایائے آصفیہ دونوں کا مطمح نظر ایک ہی ہے

یہ حق خود ہی رعایا کو عطا فرمایا۔

اصولِ انتخاب بھی سرکار عالی نے اصولاً طے کر دیا چنانچہ وکلاء اور جاگیرداروں کا تقرر خود اسی زمرے سے بہ ذریعۂ انتخاب عام عمل میں آتا ہے۔

اعلیٰحضرت بندگانِ عالی مدظلہ العالی کی سرپرآرائی کے ساتھ ہی مجلس وضع قوانین میں توسیع پر توجہ مبذول فرمائی گئی۔ ایوان مجلس وضع قوانین کے افتتاح کے موقع پر خورداد ۱۳۲۱ف میں مدارالمہام وقت مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت بہادر نے اعلان فرمایا تھا کہ:۔

"مجلس کی اس درخواست کو کہ ارکان غیر ملازم میں تین ارکان کا اضافہ کیا جائے بندگان اعلیٰحضرت قدر قدرت نے منظور فرما کر ارشاد فرمایا ہے کہ چونکہ مجلس نے اب تک قابل تحسین طور سے کام کیا ہے لہٰذا میں اس درخواست کو بالفعل چھ سال کے لیے امتحاناً منظور کرتا ہوں کہ میر مجلس اور نائب میر مجلس کے علاوہ گیارہ ارکان ملازم جو ہیں ان کی تعداد کے مساوی گیارہ ارکان غیر ملازم مقرر کیے جائیں اور اس طور سے ارکان غیر ملازم کی موجودہ تعداد میں تین ارکان کا اضافہ جو ہوگا ان میں سے ایک رکن غیر ملازم کے انتخاب کا حق مجلس صفائی بلدہ کو دیا جائے اور دو ارکان غیر ملازم کا انتخاب اضلاع کے لوکل بورڈز باری باری سے کریں۔"

آٹھ سال کے بعد قیامِ باب حکومت کے وقت حضور پرنور نے قطعی طور سے یہ طے فرما دیا کہ:۔

"مملکت کے بہترین نظم کے لیے ما بدولت کا ارادہ ہے کہ وسعت کے ساتھ زیادہ اجتماعی نہ کہ شخصی اختیارات کا عمل درآمد ہو۔"

(فرمان مبارک دربارہ تنظیم باب حکومت ۲۲ صفر ۱۳۳۸ھ)۔

اس مختصر تاریخی مساحت سے واضح ہوگا کہ:۔

۱۔ رعایا اور سرکار دونوں کے اغراض و مقاصد ایک ہیں یا مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنت کے الفاظ میں "شاہ و رعیت میں کوئی مغائرت نہیں۔" (سپاس نامہ رعایا بہ وقت سلور جوبلی مبارک)۔

۲۔ امورِ مملکت کے انصرام کے لیے شوریٰ کا اصول طے فرما دیا گیا ہے۔

۴۔ حقِ انتخاب کو بھی اصولاً طے فرمادیا گیا ہے۔

اب وقت آگیا ہے کہ شوریٰ میں رعایا کو مزید حصہ ملے اور حقِ انتخاب میں مزید وسعت اور عمومیت پیدا کی جائے اور بہ لحاظ اس کے کہ رعایا اور سرکار کا مقصد ایک ہی ہے سرکارِ عالی بہ راہ رعایا پروری دستوری اصلاحات کی آخری منزل کا اعلان فرمادے۔

قیامِ باب حکومت کے موقع پہ حضور پرنور نے ارشاد فرمایا تھا کہ:۔

"انقلاب زمانہ، زمانہ حال کی زندگی کے پیچیدہ مسائل، مشرقی اقوام کے جدید سیاسی احساس اور خود اس ملک کے اندرونی اور بیرونی تعلقات کے نازک مسائل نے ذاتی حکومت کے بار کو اس قدر گراں کر دیا ہے کہ اس سے ایک حد تک سبک دوشی حاصل کرنے کے لیے فوری تدبیر کی ضرورت ہے۔"

(خطبۂ مبارک دربار افتتاح باب حکومت ۲۷ صفر ۱۳۳۸ھ)۔

محترم باب حکومت نے اپنے قیام کی غرض پوری کر دی ہے اور اب وقت کا تقاضا یہ ہے کہ ان ہی وجوہ و اسباب کی بنا پر جو بندگان عالی مدظلہ العالی نے قیام باب حکومت کے لیے ارشاد فرمائے خود باب حکومت کو قوی تر اور زیادہ مستحکم کرنے کے لیے وفادار اور خیراندیش رعایا کو اس امر کا موقع دیا جائے کہ جہاں وہ ایک طرف سرکاری مصالح اور ذمہ داریوں کو بہ راہ راست سمجھ سکے تو دوسری طرف وہ اپنے جذبات و احساسات، ضروریات و مصالح کو، آئین اور ضابطے کے تحت، سرکارِ عالی کے گوش گذار کر سکے۔

مخفی نہ رہے کہ ممالک محروسہ سرکار عالی میں مجلس وضع قوانین کا قیام محض توضیح قانون کی حد تک، اس زمانے میں عمل میں آیا جب کہ برٹش انڈیا میں لارڈ لنسڈون نے اسی سال یعنے ۱۸۹۲ء میں مجالس وضع قوانین ہند کی اصلاح و توسیع کر دی تھی، ارکان غیر سرکاری کا انتخاب بہ ذریعہ رائے عام ہونے لگا تھا، ارکان کو حقِ سوال بھی مل چکا تھا اور موازنے پر اظہارِ رائے کیا جا سکتا تھا۔ (ملاحظہ ہو برطانوی ہند کا نظام سیاسی صفحہ ۵۷۔ تالیف ای، اے، ہارن۔ ترجمہ سید نجیب اشرف سلسلۂ جامعہ عثمانیہ)۔

اب حالت یہ ہے کہ برٹش انڈیا کے سارے صوبوں کو حکومت خود اختیاری

ل چکی ہے اور دوسری ہندوستانی ریاستیں تیزروی سے اپنی رعایا کو اپنی ذمہ داریوں میں شریک کر رہی ہیں۔

ممالک محروسہ سرکار عالی میں مجلس وضع قوانین کو قایم ہو کر ۴۵ سال گزر چکے ہیں اور اس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس کا وجود مفید اور صلاح و فلاح رعایا کا موجب ہوا۔ ارکان غیر سرکاری نے بھی اپنے آپ کو اس اعتماد کا پورا اہل ثابت کیا جو ان پر سرکار عالی نے قایم فرمایا تھا۔ انھوں نے یہ امر ثابت کر دیا ہے کہ وہ اب اس قابل ہیں کہ ان پر مزید اعتماد کیا جائے اور ان کی ذمہ داریوں میں وسعت پیدا کی جائے۔

یہ امر پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ ممالک محروسہ سرکار عالی کے خاص حالات اور خاص مسائل ہیں، موجودہ حالات کے تحت جو تجاویز مناسب معلوم ہوئیں ان کو ذیل میں قلمبند کیا جاتا ہے:۔

مجلس وضع قوانین کے آیندہ اختیارات

مناسب ہو گا کہ مجلس وضع قوانین کے فرایض و اختیارات آیندہ حسب ذیل قرار دیے جائیں:۔

۱۔ قانون سازی:۔

الف۔ سرکار کے پیش کردہ مسوداتِ قانون پر غور کرنا۔

ب۔ غیر سرکاری ارکان کے مسوداتِ قانون پر غور کرنا۔

اگر باب حکومت کی رائے میں کسی غیر سرکاری رکن کا مسودۂ قانون ناقابل غور قرار پائے اور وہ اس کو مجلس وضع قوانین میں پیش کرنا مناسب نہ خیال کرے تو اس کو بندگان عالی کے ملاحظے میں بہ غرض حصولِ ہدایت پیش کیا جائے گا۔

۲۔ تحریکات منظور کرنا:۔

مجلس کے ہر رکن کو اختیار ہو گا کہ ملک کی ہر جہتی ترقی اور مفاد ملک کے ہر پہلو پر سرکار عالی کو متوجہ کرنے کے لیے تحریکات پیش کرے۔ اگر باب حکومت کو کسی تحریک کے پیش کرنے میں اختلاف ہو تو اس کو بہ غرض حصولِ ہدایت بندگان عالی کے ملاحظے میں پیش کیا جائے گا۔

۳۔ حقِ سوال :۔

مجلس کے ہر غیر سرکاری رکن کو یہ حق حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ امورِ نظم ونسق کے متعلق سوالات کرسکے، اور جواب ملنے پر ضمنی سوالات کرے۔ البتہ سرکار کو یہ حق حاصل ہوگا کہ اگر کسی سوال کے جواب دینے سے مفادِ عام کو ضرر پہنچتا ہو تو جواب دینے سے انکار کردے۔

۴۔ موازنۂ سالانہ پر بحث، اور مداتِ مقررہ پر رائے دہی :۔

سرکارِ عالی سالانہ موازنے کو مجلس وضع قوانین میں پیش کرے گی۔ مجلس اس پر بحث کرے گی اور مناسب تحریکات منظور کرے گی۔ مجلس کے تحریکات بندگان عالی کے ملاحظے میں پیش کردیے جائیں گے۔ بندگان عالی حکم مناسب صادر فرمائیں گے۔

موازنے کے مداتِ ذیل پر مجلس میں نہ تو بحث ہوگی اور نہ کوئی تحریک ان کے متعلق پیش ہوسکے گی۔

الف ۔ مد داخل حضور پرنور، اخراجات متعلق ذاتِ شاہانہ، اور شہزادگان، مُرشدزادگان کے الونس و اخراجات ۔

ب ۔ مدات فوج ۔

ج ۔ مدات امورِ مذہبی ۔

۵ ۔ ٹکس ۔

الف ۔ اگر سرکار کی رائے میں کسی جدید محصول کا عاید کیا جانا مناسب ہو تو اس کے متعلق مجلس کی رائے حاصل کی جائے گی، اگر مجلس کی رائے میں اس کی ضرورت نہ ہو تو اس کو بندگان عالی کے ملاحظے میں بہ غرض صدورِ حکم مناسب پیش کیا جائے گا۔

ب ۔ مجلس بہ طور خود بھی کسی جدید ٹکس کے عاید کرنے کی تجویز منظور کرسکے گی۔ نیز کسی ٹکس کے تخفیف اور اس کے تنسیخ کے متعلق بھی تجاویز منظور کرسکے گی، اگر سرکار کو اس سے اختلاف ہو تو مجلس کی تجویز بندگان عالی کے ملاحظے میں بہ غرض صدورِ حکم مناسب پیش کی جائے گی۔

مجلس کے اختیارات پر تحدید

مناسب ہوگا کہ حسب ذیل امور کے متعلق سرکار کے سوا کسی اور رکن کی جانب سے کوئی مسودہ قانون تحریک اور سوال پیش نہ کیا جائے۔

۱۔ ذات شاہانہ اور خاندان شاہی۔

۲۔ فوج۔

۳۔ اُمور مذہبی۔

ایسے معاملات جو کسی خاص مذہب اور فرقے سے متعلق ہوں، یا جن کا مضر اثر خاص طور پر کسی مذہب، یا فرقے کے اشخاص پر پڑتا ہو، البتہ اگر اس خاص فرقے کے ارکان مجلس کے منجملہ (۳/۴) تین چوتھائی ارکان اس مسئلے پر بحث کے لیے آمادہ ہوں تو اجازت دی جائے گی۔

۴۔ عطیات شاہی کی عطا اور مسدودی

۵۔ ملازمتیں۔

ایسا قانون، یا تحریک، یا سوال جس کا اثر یہ ہو کہ مسئلۂ ملازمت کو فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے۔

۶۔ سرکاری زبان۔

ایوانِ مجلس یہ امر مناسب ہے کہ ممالک محروسہ سرکار عالی کے سارے طبقاتِ رعایا میں زیادہ سے زیادہ میل جول پیدا کرنے کے لیے، نیز دو ایوانوں کی خاص طور پر ضرورت نہ ہونے اور کفایت شعاری کے مدِ نظر مجلس کا ایک ہی ایوان ہو۔

مجلس کی ترکیب بہ حالاتِ موجودہ مناسب ہے کہ اس مجلس کے ارکان کی تعداد (۱۰۰) قرار دی جائے اور ان کی تقسیم اس طرح کی جائے:۔

۱۔ عام حلقہ ہائے انتخاب

الف۔ ہر ضلع سے دو ارکان ۳۲ } ۴۰

ب۔ بلدہ حیدرآباد سے آٹھ ارکان ۸

نوٹ۔ ضلع کی تعریف میں وہ جاگیرات اور سمستانات وغیرہ بھی داخل ہوں گے جو اس ضلع کے حدود اراضی میں داخل ہوں۔

۲۔ جاگیرداروں سے ۲۰

نوٹ۔ یہ نشستیں صرف خاص مبارک، پائیگاہوں، اُمرائے عظام، سمستانوں اور جاگیرداروں

کے لیے ہوں گے۔

۳۔ جامعہ عثمانیہ۔

۴۔ سرکاری نام زد کردہ ارکان۔

الف۔ ملازم سرکار ۱۵ }
ب۔ غیر ملازم ۲۰ } ۳۵

نوٹ۔ (۲۰) اراکین غیر ملازم کو سرکار عالی مختلف مفادات کے تحفظ کے لیے بہ ذریعۂ نام زدگی یا خود اہل مفاد کے باہمی انتخاب کے ذریعے پر کرے گی۔

طریقۂ انتخاب یہ امر مناسب ہے کہ عام حلقوں میں نمایندگی اور انتخاب بہ ذریعہ عام رائے دہی کے اور بلا تحفظِ نشست ہو، انتخاب راست عمل میں آئے۔

حقِ رائے دہی عام طور پر حقِ رائے دہی کی متعدد اور مختلف بنیادیں تسلیم کی جاتی ہیں، لیکن انجمن طیلسانئین عثمانیہ تعلیم یافتہ لوگوں کی جماعت ہونے کی وجہ سے، نیز بہ لحاظِ حالات ملک نوشت و خواند کی اہلیت کے سوا رائے دہی کے لیے اور کسی بنیاد کو تسلیم نہیں کرتی۔ صرف تعلیم یافتہ لوگ ہی طریقۂ حکمرانی کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر حقِ رائے دہی کی بنیاد نوشت و خواند کو قرار دیا جائے تو ملک کی تعلیمی حالت بہت جلد ترقی کر جائے گی۔

بہر حال حقِ رائے دہی کی بنیاد صرف یہ قرار دینی مناسب ہوگی کہ ہر شخص جو ملک کی کسی مسلمہ یا مروجہ زبان میں لکھ پڑھ سکتا ہو، رائے دہنے کا مجاز قرار دیا جائے۔ بہ شرطیکہ رائے دہندہ ممالک محروسہ سرکار عالی میں پانچ سال اقامت پذیر رہا ہو۔

اعلانِ حکومت فہمہ وارانہ یہ امر محسوس کیا جاتا ہے کہ ان سب اصلاحات کا مدعا ایک ایسا دستور ہے کہ جس کی رو سے کامل ذمہ دار حکومت قائم ہو جائے، اس لیے نامناسب نہ ہوگا کہ سرکار عالی یہ اعلان فرمادے کہ ممالک محروسہ سرکار عالی میں خانوادۂ آصفی کے زیرِ سایۂ عاطفت، اور شاہی اقتدارات کے کامل تحفظ کے ساتھ ذمہ دار حکومت کا قیام اس کے پیشِ نظر ہے۔

کامل توقع ہے کہ ان تجاویز کی منظوری اور نافذ کرنے سے حضرت بندگان عالی کے منشائے مبارک کی تکمیل ہوگی، اور صلاح و فلاح رعایا، اور سود و بہبود ملک کی ایک اور سبیل ہو جائے گی۔ فقط

قواعد معاشی کمیٹی

منظورہ جلسہ عام کاروباری انجمن طیلسانئین عثمانیہ منعقدہ ۲۷ دے ۱۳۴۷ف

ف ۱۔ انجمن طیلسانئین عثمانیہ کی ایک مستقل ذیلی کمیٹی بہ نام "معاشی کمیٹی" قایم رہے گا، اس کا نام "معاشی کمیٹی حیدرآباد" ہوگا۔

ف ۔ یہ کمیٹی انجمن طیلسانئین عثمانیہ سے ملحق ہوگی، اور اس کے قواعد وضوابط تابع منظوری انجمن طیلسانئین عثمانیہ ہوں گے۔

ف ۲۔ اس کمیٹی کے اغراض ومقاصد حسب ذیل ہوں گے:۔

ا۔ ملک کی معاشی ترقی کے لیے جدوجہد کرنا۔

ب۔ تعلیم یافتہ افرادِ ملک اور بالخصوص فرزندانِ جامعہ عثمانیہ کی معاشی زندگی کی جدوجہد میں ان کا ہاتھ بٹانا۔

ف ۳۔ معاشی کمیٹی میں ہر وہ شخص شریک ہوسکے گا جو کمیٹی کے اغراض ومقاصد سے دلچسپی رکھتا ہو، اور جس کی رکنیت کو کمیٹی کی مجلس عاملہ منظور کرے۔

ف ۴۔ کمیٹی کی رکنیت کا چندہ (عہ) سالانہ ہوگا، لیکن ارکان انجمن طیلسانئین عثمانیہ بلا ادائی چندہ کمیٹی کے رکن متصور ہوں گے۔ البتہ انجمن طیلسانئین عثمانیہ اپنے ارکان کے سالانہ چندہ موصولہ کا آٹھواں حصہ ہر سال "معاشی کمیٹی" کو دیا کرے گی۔

ف ۵۔ معاشی کمیٹی کو اختیار رہو گا کہ علاوہ زر رکنیت کے مزید عطیات کی وصولی کے لیے مناسب

انتظام کرے۔

ف ۶۔ "معاشی کمیٹی" کی مجلسِ عاملہ حسب ذیل ہوگی:۔

۱۔ صدر۔ ۲۔ معتمد۔ ۳۔ نائب معتمد۔

ا۔ چار ارکان جنھیں کابینۂ انجمن طیلسانئین عثمانیہ نامزد کرے گی۔

ب۔ چار ارکان جن کا سالانہ انتخاب، صدر۔ نائب صدر و معتمد کے سوا کمیٹی کا جلسۂ عام ہر سال بہ ماہ آبان بہ ذریعۂ خفیہ رائے دہی کرے گا۔

ف ۷۔ کوئی شخص نہ تو انتخاب میں امیدوار ہو سکے گا، اور نہ رائے دے سکے گا، تاوقتیکہ اس نے اپنے ذمگی جملہ مطالبات اعلانِ انتخاب سے قبل ادا نہ کر دیے ہوں۔

ف ۸۔ استعفا، یا کسی اور وجہ سے مجلسِ عاملہ کی رکنیت خالی ہو تو خود مجلسِ عاملہ باقی مدت کے لیے نیا انتخاب عمل میں لائے گی۔

ف ۹۔ معاشی کمیٹی کے صدر کے فرائض حسب ذیل ہوں گے:۔

۱۔ کمیٹی کا کاروبار مسلسل اور خوش اسلوبی سے چلتے رہنے کی نگرانی۔

۲۔ کمیٹی کے جلسوں کی صدارت۔

۳۔ کمیٹی کے ہر جلسے میں جلسۂ ماقبل کی روئداد سن کر حسب صوابدید ارکان حاضر توثیق۔

۴۔ کمیٹی کے جلسوں میں بہ صورت تساوی آرا فیصلہ کُن رائے کا اظہار۔

۵۔ کابینۂ انجمن طیلسانئین عثمانیہ اور دفاترِ سرکاری سے جو مراسلت عمل میں آئے اس کے مسودات کی توثیق۔

۶۔ کمیٹی کے عام امور کے متعلق معتمد کو ہدایت دینا۔

ف ۱۰۔ "معاشی کمیٹی" کے معتمد کے فرائض حسب ذیل ہوں گے:۔

۱۔ جو امور کمیٹی کے جلسوں میں طے ہوں، ان کی تعمیلی کارروائی۔

۲۔ منجانب کمیٹی مراسلت۔

۳۔ کمیٹی کے جلسوں کی روئداد کی ترتیب۔

۴۔ بعد مشورہ صدر کمیٹی کے جلسوں کے اطلاع نامے جاری کرنا۔

۵۔کمیٹی کے حسابات کی ترتیب۔ ۶۔کمیٹی کے دفتر کی حفاظت اور نگرانی

ف ۱۱۔"معاشی کمیٹی" کی مجلسِ عاملہ کے فرائض و اختیارات حسب ذیل ہوں گے:۔

ا۔مجلسِ عاملہ ہر سال موازنہ منظور کرے گی۔

ب۔مختلف مقامات میں کمیٹی کی شاخیں قایم کرے گی۔

ج۔کمیٹی کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے طریقہ ہائے کار سوچے گی، اور انھیں بروئے کار لانے کی تدابیر اختیار کرے گی۔

د۔حسب ضرورت ملازموں کو مقرر اور علٰحدہ کرے گی۔

ھ۔حسابات کی تنقیح کے لیے ہر سال تنقیح سازوں کو مقرر کرے گی۔

و۔کمیٹی کے جلسۂ عام کے انعقاد کی تاریخ مقرر کرے گی، اور ان کے سلسلے میں سب انتظامات کے لیے معتمد کو ہدایات دے گی۔

ز۔نائب معتمد کے فرایض کا تعین۔

ف ۱۲۔مجلسِ عاملہ کا کوئی رکن، یا کمیٹی کا کوئی عہدہ دار بلا اطلاع تحریری مجلسِ عاملہ کے تین جلسوں میں مسلسل غیر حاضر رہے تو ایسا شخص رکنیت یا عہدے پر باقی نہ رہے گا۔

ف ۱۳۔ہر ماہ ایک مرتبہ "معاشی کمیٹی" کی مجلسِ عاملہ کا جلسہ منعقد ہوگا، لیکن تین ارکان کی تحریری درخواست پر معتمد کا فرض ہوگا کہ بہ مشورۂ صدر کمیٹی مجلسِ عاملہ کے جلسے کا انعقاد عمل میں لائے۔

ف ۱۴۔کسی غیر معمولی اہم مسئلے کے تصفیے کے لیے صدر "معاشی کمیٹی" کو اختیار حاصل ہوگا کہ مجلسِ عاملہ کا جلسہ طلب کرنے کے لیے معتمد کو تحریری ہدایت دے۔

ف ۱۵۔"معاشی کمیٹی" کا جلسۂ عام سال میں کم از کم ایک مرتبہ اراکین مجلسِ عاملہ کے انتخاب اور سالِ ماسبق کی کارروائیوں پر بحث و تبصرہ کرنے کے لیے ماہ آبان میں منعقد ہوگا، لیکن مجلسِ عاملہ اگر چاہے تو غیر معمولی جلسہ ہائے عام بھی منعقد کر سکے گی۔

ف ۱۶۔اگر "معاشی کمیٹی" کے دس ارکان معتمد سے کسی خاص مسئلے کے لیے غیر معمولی جلسۂ عام کے

انعقاد کی تحریری خواہش کریں تو معتمد کا فرض ہوگا کہ بہ اطلاع مجلسِ عاملہ دو ہفتے کی مدت میں جلسہ منعقد کرے۔

ف ۱۷۔ "معاشی کمیٹی" کے مختلف جلسوں کا نصاب بہ موجب تفصیل ذیل ہوگا:۔

۱۔ جلسۂ عام ایک ثلث، یا (۱۵) ارکان کی حاضری۔

۲۔ مجلسِ عاملہ، (۴) ارکان کی حاضری۔

ف ۱۸۔ معتمد کا فرض ہوگا کہ "معاشی کمیٹی" کے جلسوں کی تاریخ سے اتنی مدت قبل جو ہر جلسے کے محاذی ذیل میں درج ہے، جمیع ارکان متعلقہ کو اطلاع دے:۔

۱۔ ماہانہ مجلسِ عاملہ   ایک روز

۲۔ جلسہ ہائے عام   ایک ہفتہ

ف ۱۹۔ اگر "معاشی کمیٹی" کی مجلسِ عاملہ ضرورت سمجھے تو علاوہ جلسہ ہائے عام کے ایک عام معاشی کانفرنس سال کے کسی مہینے میں منعقد کرسکے گی۔

ف ۲۰۔ ہر سال صدر اور معتمد "معاشی کمیٹی" کی آمدنی اور خرچ کا موازنہ تیار کرکے مجلسِ عاملہ میں بہ غرض منظوری پیش کریں گے۔ اس موازنے کے اندر خرچ کا اختیار معتمد کو بہ منظوری مجلسِ عاملہ حاصل ہوگا۔ باقی جملہ رقم کسی بنک میں جس کی منظوری مجلسِ عاملہ دے، ہو بہ مدِ امانت رکھی جائے گی، اور اس کی داد و ستد صدر کمیٹی کے توسط سے ہوگی۔

ف ۲۱۔ ان قواعد میں ترمیم مجلسِ عاملہ کرسکے گی، جو تابع منظوری انجمن طیلسانیین عثمانیہ ہوگی۔

ف ۲۲۔ اگر کوئی رکن پندرہ ارکان کی دستخطی تائید کے ساتھ کسی عہدہ دار یا رکن مجلس عاملہ کے خلاف قرارداد عدم اعتماد کی تحریک کرے تو معتمد کا فرض ہوگا کہ ایک ہفتے کے اندر کمیٹی کا ایک جلسہ عام طلب کرکے اس تحریک کو پیش کرے۔ اگر تحریک بہ غلبۂ آرا منظور ہو جائے تو اس عہدہ دار یا رکن کو فوراً مستعفی ہو جانا پڑے گا۔ فقط

عثمانیین کی کتابیں

۱۔ پروفیسر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

۱۔ اُردو شہ پارے جلد اول .... لے ۱۲/

۲۔ روحِ تنقید ۱۲/

۳۔ تنقیدی مقالات ۸/

۴۔ اُردو کے اسالیب بیان ۸/

۵۔ ہندستانی لسانیات .... عاں

۶۔ تین شاعر (میر تقی میر، میر حسن اور میر انیس) ...

۷۔ دیوان زادہ حاتم ....

۸۔ تازیانہ (ایک معاشرتی قصہ ....

۹۔ طلسمِ تقدیر (حیدرآباد سے متعلق ایک نیم تاریخی قصہ) ۸/

۱۰۔ گارساں دتاسی، مجلد ۴/

۱۱۔ گلزار ابراہیم، مجلد ۲/

۱۲۔ محمود غزنوی کی بزمِ ادب ۱۲/

۱۳۔ فنِ انشا پردازی ۸/

۱۴۔ عہد عثمانی میں اُردو کی ترقی ۸/

۱۵۔ کیفِ سخن (کلام کیفی حیدرآبادی) ... ۱۲/

۱۶۔ متاعِ سخن (کلام نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز) ۱۲/

۱۷۔ بادۂ سخن (کلام ڈاکٹر احمد حسین مائل) ۱۲/

۱۸۔ مرقع سخن، جلد اول و دوم، فی جلد ...

۱۹۔ سیر گولکنڈہ ۱۵/

۲۰۔ گولکنڈے کے ہیرے، مجلد ۱۲/

۲۔ پروفیسر عبدالقادر سروری

۱۔ دنیائے افسانہ ۸/

۲۔ کردار اور افسانہ ۸/

۳۔ جدید اُردو شاعری، مجلد ...

۴۔ حیدرآباد کی تعلیمی ترقی ...

۵۔ چینی اور جاپانی افسانے ۹/

۶۔ انگریزی افسانے ۸/

۷۔ سراجِ سخن (کلام شاہ سراج اورنگ آبادی) .. ۱۲/

۳۔ سید محمد ام، اے

۱۔ اربابِ نثرِ اُردو (فورٹ ولیم کالج کے اُردو نثر نگاروں کا تذکرہ) عاں

۲۔ مثنویاتِ میر .... عاں

۳۔ گلشنِ گفتار (اُردو شعراء کا قدیم ترین تذکرہ) ۱۲/

۴۔ قصائدِ ایمان ۸/

۵۔ ایمانِ سخن (کلام شیر محمد خاں ایمان) ۱۲/

۶۔ ابتدائی قواعد فارسی ۱۲/

۷۔ یادگارِ ولی .... عاں

۴۔ گرو داس ام، اے، ال، بی

۱۔ جیون چرتر راجہ تیج رائے انجہانی کی سوانح عمری۔

۵۔ میر حسن ام، اے

۱۔ ورڈسورتھ اور اس کی شاعری ..... ۸؍
۲۔ ہوش کے ناخن (ڈراما) .... (۱۰؍)

۶۔ مخدوم محی الدین ام، اے

۱۔ ٹیگور اور اُن کی شاعری .... عہ

۷۔ نبی الحسن شمیم بی، اے

۱۔ شعاع امید (مصنف کی نظموں کا مجموعہ ......
۲۔ شمیم سخن (〃 غزلیات کا مجموعہ ......
۳۔ عالم حسیات (〃 غزلوں و نظموں کا مجموعہ) ...

۸۔ احمد بن عبداللہ بی، اے

۱۔ کیفی تشریح (طلبائے انٹر سائنس کے لیے) .... ۱۲؍
۲۔ عملی کیمیا (طلبائے انٹرمیڈیٹ کے لیے) عاں ۸؍

۹۔ اعظم خاں ام، اے

۱۔ سید الانبیاءؐ (کارلائل کے مشہور لکچر ہیرافٹ کا اردو ترجمہ) عہ
۲۔ رہنمائے صحت (مہاتما گاندھی کی کتاب گائڈ ٹو ہیلتھ کا اردو ترجمہ) عہ

۱۰۔ وینکٹ پرشاد بی، اے، ال ال بی

۱۔ حیدر آباد اور ہندو مسلم زندگی ..... ۲؍

۱۱۔ ڈاکٹر سید جعفر حسن پی، اچ، ڈی (لندن)

۱۔ منتخبات کلام ہندی (ہندی کلام، اس کی تشریح و تبصرہ) عاں ۱۲؍

۱۲۔ ڈاکٹر حمید اللہ پی، اچ، ڈی (جرمنی)

۱۔ نیلگری (نیلگری کے متعلق عام فہم معلومات) .... ۴؍
۲۔ قانون بین الممالک .... ۸؍

۱۳۔ سدرشن راج ام، ایس، سی

۱۔ طبعیات مکمل (عثمانیہ میٹرک کے طلبائے سائنس کے لیے)

۱۴۔ سردار خاں بی، اے

۱۔ جدید نصاب طبعیات (دو جلدیں عثمانیہ میٹرک کے لیے) فی جلد عہ
۲۔ جدید نصاب کیمیا (〃 〃) عاں

۱۵۔ عباس حسین لطفی

۱۔ مصنوعی بیوی (ایک دلچسپ انگریزی ناول کا ترجمہ) ۱۲؍

۱۶۔ محمد عبدالرحمٰن مدیر "وقت"

۱۔ قواعد اردو (طلبائے مدارس وسطانیہ کے لیے) ۱۲؍
۲۔ سیرت و کردار (بچوں کے لیے اخلاق کی کتاب) ... ۸؍

۱۷۔ محمد عبدالحفیظ بی، اے، بی، ٹی، ام، اے (اڈنبرا)
ایف، ایس، سی (لندن)

۱۔ مبادی کیمیا حصہ اول و دوم و سوم فی جلد .. ۱۲؍
۲۔ حفظ صحت (طلبائے مدارس کے لیے) .... ۴؍

۱۸۔ محمد عبدالسلام ذکی بی، اے، بی، ٹی

۱۔ شہادت نامہ (حضرت امام حسینؑ کے واقعات شہادت) عہ
۲۔ گلزار اطفال (بچوں کے لیے) .... (۸؍)
۳۔ گلزار حکایات (〃) (۶؍)
۴۔ جذبات عالیہ (حمد اور قومی نظموں کا انگریزی ترجمہ) ۸؍
۵۔ شرح نصاب اردو (حصہ اول .....
  〃 دوم
۶۔ آصفی کہانیاں ...... ۸؍

۱۹۔ شیخ چاند مرحوم ام اے ال ال بی

۱۔ ملک عنبر عہ/۸

۲۔ ایکناتھ .... عہ

۳۔ سودا (مقالۂ تحقیقی) ۱۲/

۲۰۔ ابو المکارم فیض محمد صدیقی بی اے ڈپ ایڈ

۱۔ ابتدائی الجبرا (عثمانیہ میٹرک کے لیے) عہ/۸

۲۔ حساب عہ/۸

۳۔ مطالعۂ قدرت حصۂ اول ۱۲/

۴۔ جدید نصاب طبعیات .... عا/

۵۔ مصلحانِ تعلیم .... عہ/

۶۔ ابن سعود عا/۸

۷۔ مسز سپسن .... عہ

۲۱۔ محمد امیر بی اے، بی، ٹی

۱۔ سلیم (مولانا وحید الدین سلیم مرحوم پروفیسر جامعہ عثمانیہ) عہ

۲۔ شیب و شباب (براؤننگ کی مشہور آفاق نظموں کا ترجمہ) ۲/

۲۲۔ پروفیسر ڈاکٹر میر ولی الدین

۱۔ فلسفہ کی پہلی کتاب (فلسفہ کی ایک انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ) ۸/

۲۔ مقدمہ ما بعد الطبعیات ....

۳۔ ابطال مادیت ....

۴۔ قنوطیت یعنی فلسفۂ یاس (خیر و شر و غایت حیات) عا/

۲۳۔ مخدوم علی

۱۔ جغرافیہ سلطنتِ آصفیہ (مدارس کے لیے) ۸/

۲۔ جغرافیۂ عالم عہ/۸

۳۔ جغرافیہ کی تعلیم (جغرافیہ پڑھانے کا عام طریقہ) ۱/

۴۔ ذہنی حساب (مدارس کے لیے) ۲/

۵۔ رفیق مدرسین ۸/

۶۔ دو صد سالہ جنتری ۲/

۷۔ سلیس کہانیاں (بچوں کے لیے) ۲/

۲۴۔ سید معین الدین قریشی ام اے

۱۔ غالب (ڈاکٹر سید عبد اللطیف کی انگریزی کتاب "غالب" کا اردو ترجمہ) عہ/۸

۲۵۔ محمد منیر الدین ام اے ڈپ ایڈ (ایڈنبرا)

۱۔ مکمل ہندسۂ عملی (طلبائے عثمانیہ میٹرک کے لیے) عہ/۴

۲۔ حل پرچہ جات ریاضی (امتحانات عثمانیہ میٹرک کے لیے) عہ/۲

۲۵۔ میر حسن الدین بی اے ال ال بی

۱۔ مبادی فلسفہ (فلسفہ پر عام فہم کتاب) ۱۴/

۲۔ فلسفۂ عجم (ڈاکٹر سر اقبال مرحوم کے مشہور مقالے کا اردو ترجمہ) عا/۸

۳۔ برگسان (مشہور فلسفی برگسان کے اصول و نظریات) عہ/۴

۴۔ وفاق اور ریاستیں ۱۲/

۲۶۔ سید وقار احمد ام اے ال ال بی

۱۔ براؤننگ (براؤننگ کی بعض نظموں کا نفیس ترجمہ اور ان پر تبصرہ) .... عہ

۲۔ ہنری چہارم (شکسپیر کے مشہور ڈرامے کا اردو ترجمہ) عہ

۲۷۔ انوار حسین بی اے

۱۔ جبر و مقابلہ (مدارس وسطانیہ کے لیے) ... ۱۵ار

۲۔ جغرافیہ طبعی (" ") ... (۱۰ار)

۲۸۔ محمد عبدالشکور بی اے

۱۔ التدبیر (ایک معاشرتی ناول) ۸ار

۲۹۔ عبدالقادر وفا (عثمانیہ)

۱۔ خواب راحت (فلمی ڈراما) ....

۲۔ دیوان وفا ....

۳۰۔ احمد عبداللہ المسدوسی بی اے ال ال بی

۱۔ اسوۂ حسنہ (آنحضرت صلعم کے اخلاق و عادات کا مرقع) ۸ار

۳۱۔ عبداللطیف بی اے

۱۔ عملی ہندسہ (عثمانیہ میٹرک کے لیے) ۱۲ار

۲۔ علم مساحت (" ") ۱۲ار

۳۲۔ محمد عبدالوہاب بی اے بی ای

۱۔ جلد اول ریاضیہ (طلبائے مدارس کے لیے) ....

۳۳۔ عزیز احمد بی اے

۱۔ فرانسیسی افسانہ (فرانسیسی افسانوں کا اردو ترجمہ) ۱۲ار

۳۴۔ غلام طیب بی اے

۱۔ دیسی کہانیاں (بچوں کے لیے) ....

۳۵۔ محسن بن شبیر بی اے

۱۔ یوسف ہندی قید فرنگ میں ...... عہ

۳۶۔ محشر عابدی بی اے

۱۔ محشرستان (مصنف کے افسانوں کا مجموعہ) ... عہ/

۳۷۔ محمد احمد عثمانی بی اے ام ایس سی

۱۔ طبعیات عملی (انٹرمیڈیٹ سائنس کے لیے) عہ/۸

۲۔ مبادی سائنس (طبعیات کا ابتدائی رسالہ)

۳۸۔ نجم الغنی (عثمانیہ)

۱۔ خیالات عالیہ (امرسن اور دوسرے مصنفین کے مضامین کا ترجمہ) عہ/

۳۹۔ ندیم الحسن ناثیر بی اے

۱۔ اردو کی قومیت (اردو زبان کی سرگذشت)

۴۰۔ نوراللہ محمد نوری

۱۔ شرح انتخاب دیوان غالب ۱۲ار

۲۔ داغ (داغ دہلوی کے حالات اور کلام کی تنقیدی تحسین) عہ/۸

۴۱۔ میر محمود علی ام اے

۱۔ آصف جاہ ثانی (نواب میر نظام علی خاں کی سوانح عمری) .... عہ/

۲۔ گلدستۂ تاریخ (عثمانیہ میٹرک کے لیے) ۱۲ار

ملنے کے پتے: ۱۔ مکتبۂ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدرآباد دکن۔ ۲۔ غلام دستگیر تاجر کتب حیدرآباد دکن۔
۳۔ سید عبدالرزاق تاجر کتب چار مینار حیدرآباد دکن۔ ۵۔ مکتبۂ جامعہ قرول باغ دہلی۔ ۶۔ دفتر مجلس علمیہ گھانسی بازار
حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیاتِ اردو کی مطبوعات

۱۔ مرقعِ سخن (جلد اوّل) حیدرآباد کے پچیس شعرائے دورِ آصفیہ کا باتصویر تذکرہ۔ چار سو سے زیادہ صفحات۔ پچاس سے زیادہ تصاویر۔ مجلد قیمت (صہ) اس بیش قیمت کتاب کے اب صرف چند نسخے باقی رہ گئے ہیں۔

۲۔ مرقعِ سخن (جلد دوم) حیدرآباد کے دیگر پچاس شعرائے دورِ آصفیہ کا باتصویر تذکرہ۔ چار سو سے زیادہ صفحات پچاس سے زیادہ تصاویر قیمت مجلد (صہ) اس جلد میں ان سلاطین و خانوادۂ آصفی کے اور امرائے کبار کے تذکرے بھی درج ہیں جنکی شاعری یا علم دوستی قابلِ ذکر ہے۔

۳۔ سراجِ سخن حضرت شاہ سراج الدین سراج اورنگ آبادی کے حالاتِ زندگی کلام پر تبصرہ اور جملہ اصنافِ سخن کا بہترین انتخاب از پروفیسر عبدالقادر سروری ایم اے ال ال بی صفحے (۱۵۲) قیمت (۱۲ر) مع تصویر خط سراج۔

۴۔ ایمانِ سخن استاد الشعرا شیر محمد خاں ایمان حیدرآبادی کے حالاتِ زندگی کلام پر تبصرہ اور جملہ اصنافِ سخن کا بہترین انتخاب از مولوی سید محمد ایم اے لکچرار اردو و فارسی گورنمنٹ سٹی کالج حیدرآباد (۱۲۰) صفحے ایمان عہدِ آصفجاہ ثانی کے ملک الشعرائے دکن تھے۔

۵۔ فیضِ سخن استادِ کل حضرت میر شمس الدین محمد فیض علیہ الرحمۃ کے حالاتِ زندگی کلام پر تبصرہ اور جملہ اصنافِ سخن کا بہترین انتخاب از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی پروفیسر ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ (۱۴۴) صفحے قیمت (۱۲ر) مع نقشۂ وزرۂ فیض

۶۔ بادۂ سخن ڈاکٹر احمد حسین مائل کے حالاتِ زندگی کلام پر تبصرہ اور جملہ اصنافِ سخن کا بہترین انتخاب از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی پروفیسر ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ (۱۲۸) صفحے قیمت (۱۲ر) مع تصویرِ شاعر۔

۷۔ کیفِ سخن سید ضیاء الدین حسن کیفی کے حالاتِ زندگی کلام پر تبصرہ اور جملہ اصنافِ سخن کا انتخاب از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور (۱۲۲) صفحے قیمت (۱۲ر)

۸۔ متاعِ سخن نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز کے حالاتِ زندگی کلام پر تبصرہ اور جملہ اصنافِ سخن کا بہترین انتخاب 〃 〃 (۱۲۵) صفحے قیمت (۱۲ر) مع تصویرِ شاعر

۹۔ نقدِ سخن کلامِ فانی پر ناقدانہ تنقید، از نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز۔

۱۰۔ ورڈسورتھ اور اس کی شاعری انگلستان کے مشہور شاعر کے حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام جس نے اردو کی فطری شاعری کو خاص طور پر متاثر کیا، از مولوی میر حسن صاحب ایم اے (۱۸۴) صفحے قیمت (عہ) مع تصویرِ شاعر

۱۱۔ ٹیگور اور انکی شاعری ہندستان کے مشہور شاعرِ اعظم کے حالاتِ زندگی اور تصنیفات پر تبصرہ از مولوی مخدوم محی الدین صاحب ایم اے (۲۸۰) صفحے قیمت (عہ)

۱۲۔ ہوش کے ناخن حیدرآباد کی زندگی کا ایک مرقع جو ڈرامے کی شکل میں پیش کیا گیا ہے، از مولوی میر حسن و مخدوم محی الدین صاحبان ایم اے (۹۶) صفحے قیمت (۱۲ر)

۱۳۔ یوسفِ ہند کی قیدِ فرنگ میں مرزا غالب مرحوم کے واقعۂ قید کا مستند تذکرہ از مولوی محسن بن شبیر صاحب قبائی بی اے ال ال بی (۸۰) صفحے قیمت (۸ر)

۱۴۔ نذرِ ولی بابائے ریختہ حضرت ولی اورنگ آبادی کی خدمت میں طلباتِ جامعہ عثمانیہ کی نذرِ عقیدت (۲۵۰) صفحے قیمت مجلد (عار)

المشتہر

خواجہ حمید الدین مہتمم ادارۂ ادبیاتِ اردو

۳۸ء کی چند مطبوعات

دلی کا سنبھالا:۔ از خواجہ محمد شفیع (دہلوی) مرحوم دہلی کے ایام عروج کی مرقع نگاری دہلی کی اس ٹکسالی زبان میں کی گئی ہے جو اب نابود ہے۔ انداز بیان ایسا موثر ہے کہ دل بے اختیار ہو جاتا ہے قیمت مجلد عہ/

لطائف غالب:۔ مسز ایم اے شاہ، مرزا اسد اللہ خاں غالب کی شوخیِ بیان، خوش طبعی اور ظرافت سے محظوظ ہونے کے لئے اسے ضرور پڑھئے۔ قیمت (۴ر)۔

شعلۂ طور (طبع ثانی):۔ حضرت جگر مراد آبادی کے کلام کا مجموعہ، بالکل نئی ترتیب بہت کچھ تازہ کلام کا اضافہ قیمت بھی کم کر دی گئی ہے یعنی (تے) کے بجائے (عاں)۔

سبد چین:۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب کے نایاب فارسی کلام کا مجموعہ جس میں ان کے وہ فارسی قطعات، ترجیع بند، ترکیب بند، مثنویاں، نظمیں، غزلیں اور رباعیاں شامل ہیں جو ان کی کلیات میں موجود نہیں ہیں مع مکمل سوانح حیات قیمت (۲/۱ر)

ذکر غالب:۔ مرزا غالب کی مختصر اور جامع لیکن مکمل اور مستند ترین سوانحعمری جس میں بہت سی نئی باتیں پیش کی گئی ہیں اور جو طلباء کے لئے خاص طور سے بہت مفید ہے قیمت (۸ر)۔

قرآن کیا ہے اور اس نے کیا کر دکھایا؟ از عبد الواحد (سندھی) استاد مدرسہ جامعہ، بچوں کی نفسیات، شعور اور استعداد کو مد نظر رکھ کر تیار کی گئی ہے۔ مسلمان بچوں کے لئے اب تک کوئی ایسی کتاب نہیں چھپی۔ قیمت (۶ر)۔

دلی:۔ بچوں کے لئے دلی کی خاص خاص عمارتوں کا دلچسپ بیان جس کے پردے میں دہلی کی مختصر تاریخ بتائی گئی ہے۔ بلاک کی (۶) تصاویر، دو نقشے۔ قیمت صرف (۴ر)۔

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور

سب رس

کا

زیرِ ادارت	زیرِ نگرانی
صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

اقبال نمبر

مشہور شعرا کی بلند پایہ نظمیں۔ اقبال کی نایاب تصاویر۔ اقبال کے کلام اور حیات کے مختلف پہلوؤں پر بصیرت افروز مضامین عالمی شہرت رکھنے والے اصحاب کے بیانات۔ اقبال کے غلوہ کا عکس "حیدرآباد اور اقبال" سے متعلق معلومات آفریں اقتباسات

سب رس کے محرم نمبر نے تمام ہندوستان میں مقبولیت حاصل کی۔ اقبال نمبر بھی شاعر مشرق کے شایانِ شان شائع کیا گیا ہے۔ اقبال کے ہر پرستار کا یہ مقدس فریضہ ہے کہ اِس نمبر کا مطالعہ کرے اور اس کے حیات افروز پیام کو دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچا دے۔

سالانہ خریداروں کو بلا قیمت دیا جائے گا

بچوں کے سب رس کا سالانہ چندہ	ماہ نامۂ سب رس کا سالانہ چندہ
عصہ/	للعہ/

پتہ

خواجہ حمید الدین شاہد

مہتمم سب رس رفعت منزل

خیریت آباد حیدرآباد دکن



سہ ماہی علمی و ادبی رسالہ





QUARTERLY

شمارہ سوم و چہارم
سنہ ۱۳۴۷ف

جلد دوم
سنہ ۱۹۳۷ء

مجلہ طیلسانین

مجلس علمیہ طیلسانین عثمانیہ کا ماہی رسالہ

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ام، اے (عثمانیہ) پی، ایچ، ڈی (لندن) پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ صدر

عبدالمجید صدیقی ام، اے، ال ال بی (عثمانیہ) پروفیسر تاریخ جامعہ عثمانیہ رکن

غلام دستگیر رشید ام، اے (عثمانیہ) لکچرار فارسی نظام کالج ...... ″

مہندر راج سکسینہ ام، ایس، سی (عثمانیہ) پروفیسر شعبہ حیاتیات جامعہ عثمانیہ ″

سید محمد ام، اے (عثمانیہ) لکچرار اردو و فارسی گورنمنٹ سٹی کالج ...... معتمد

ناشر

مجلس علمیہ طیلسانین عثمانیہ گھانسی بازار

حیدرآباد دکن

مجلۂ طیلسانئین

۱۔ یہ مجلس علمیہ طیلسانئین عثمانیہ کا سہ ماہی علمی و ادبی رسالہ ہے جو جنوری' اپریل' جولائی' اکتوبر مطابق بہمن' اردی بہشت' امرداد' آبان میں شایع ہوگا۔

۲۔ اس رسالے میں طیلسانئین عثمانیہ کے علمی و ادبی مضامین' بلند پایہ نظمیں' اور وہ تحقیقی مقالات بھی بالاقساط شایع ہونگے جو جامعہ عثمانیہ کی ام اے اور ام ایس سی کی ڈگریوں کے لیے قبول کیے گئے ہیں نیز انجمن طیلسانئین عثمانیہ کی علمی سرگرمیونکی روداد بھی پیش کیجائے گی۔

۳۔ مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ' اور دل آزار تنقیدیں کسی صورت سے قابلِ اشاعت متصور نہونگی۔

۴۔ رسالے کی ضخامت کم سے کم (۱۲۵) صفحے ہوگی۔

۵۔ سالانہ چندہ پیشگی خریدارانِ بلدہ سے ہے اور خریدارانِ اضلاع سے ۱۲/ ہے بشمول محصول ٹپہ۔

۶۔ زرِ چندہ اور تمام مضامین نظم و نثر مدیر کے نام بھیجے جائیں اور دیگر امور کے لیے منتظم اعزازی سے مراسلت کی جائے۔

مجلۂ طیلسانین

فہرست

اداریہ

مجلۂ طیلسانین کا یہ نمبر بعض دشواریوں کی وجہ سے بہت دیر سے شایع ہو رہا ہے۔ اس کی تلافی کے لیے ہم نے اس نمبر میں جو ڈبل نمبر ہے مقالہ "سلطان احمد شاہ ولی بہمنی" کو تمام و کمال شایع کر دیا ہے۔ انشاء اللہ آیندہ نمبر پابندی سے شایع کیے جاینگے۔ انتظامی دشواریوں کو دور کرنے کے لیے دفتر مجلۂ طیلسانین بھی انجمن طیلسانین میں ہی منتقل کر دیا گیا ہے اس سے رسالے کی بر وقت اشاعت کے علاوہ تقسیم وغیرہ کی سہولتیں بھی حاصل ہونگی۔ اس نمبر پر مجلے کی دوسری جلد ختم ہو رہی ہے۔ دو سال کے عرصے میں مجلے نے تین علمی مقالے مکمل طور پر شایع کیے۔ اگرچہ ان مقالوں کی اشاعت کی وجہ سے بعض دوسرے عام پسند مضامین کو مجلے میں جگہ نہ دی جا سکی لیکن اجرائے مجلہ کے وقت کارکنوں کے پیش نظر یہ مقصد تھا کہ طیلسانین کی ان خالص علمی خدمات کو جو مقالوں کی صورت میں جامعہ کی الماریوں میں بند ہیں کم سے کم خرچ سے منظر عام پر لایا جائے اور اس طرح اُن کم استطاعت مصنفین کی مدد کی جائے اور اُردو کے علمی ذخیرے میں اضافہ کیا جائے۔ مجلہ کی اشاعت سے یہ مقصد بحمد اللہ پورا ہو رہا ہے۔ اس وقت تک جو مقالے شایع کیے گئے ہیں وہ علمی دنیا میں کافی قدر و منزلت سے دیکھے گئے۔ خصوصاً دونوں تاریخی مقالے

اس لحاظ سے کہ ان میں دکن کی تاریخ کا بہت ہی کارآمد مواد تحقیق و تدقیق کے ساتھ فراہم کیا گیا ہے تاریخ کے متعلمین کے لیے بہت ہی بیش قیمت ثابت ہوئے۔

آیندہ سال کے شروع سے انجمن طیلسانئین کے سابق معتمد اور مخلص کارکن مولوی محمد عبدالرحیم صاحب بی۔اے نے مجلے کی انتظامی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے اعزازی طور پر مہتمم مجلہ کے فرایض انجام دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔موصوف کے حسن توجہ اور انہماک سے امید ہے کہ مجلے کی ساری انتظامی دشواریاں حل ہو جائینگی۔

اجنتا

جہاں خونِ جگر پیتے رہے اہلِ ہنر برسوں ۔۔۔ جہاں گلنار رنگوں میں آہوں کا اثر برسوں
جہاں کھنچتا رہا پتھر پہ عکسِ خیر و شر برسوں ۔۔۔ جہاں قایم رہے گی جنتِ قلب و نظر برسوں
جہاں نغمے جنم لیتے ہیں رنگینی برستی ہے
دکن کی گود میں آباد وہ خوابوں کی بستی ہے

شرابِ شعر کی تاثیر ہے ٹھنڈی ہواؤں میں ۔۔۔ بہارِ زندگی غلطاں ہے سبزے کی اداؤں میں
نوائے سرمدی آتی ہے جھرنوں کی صداؤں میں ۔۔۔ بیاں ممکن نہیں وہ لطف آتا ہے دعاؤں میں
یہاں صدیوں سے رایج ہے سکونِ شیریں مقالی ہے
یہاں کا ذرہ ذرہ مظہرِ شانِ جمالی ہے

در و دیوار پر ہے نقشِ حسن و عشق کی گھاتیں ۔۔۔ پیامِ زندگی دیتی ہیں شرمیلی ملاقاتیں
جواں برسات کے دن جان لیوا چاندنی راتیں ۔۔۔ فضا میں ہر قدم پر گونجتی ہیں دلنشیں باتیں
یہاں پیری پہ ہو جاتا ہے دھوکا نوجوانی کا
سبق دیتا ہے ہر چہرہ حیاتِ جاودانی کا

جگر کے خون سے کھینچے گئے ہیں نقشِ لاثانی ۔۔۔ تصدق جن کے ہر خط پر تحیر خانہ مانی
مشکل ہے شبابِ حسن میں تخئیل انسانی ۔۔۔ تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوقِ عریانی
گلستانِ اجنتا پر جنوں کا راج ہے گویا
یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا

بہانہ مل گیا دستِ جنوں کو حُسن کاری کا
اثاثہ لوٹ ڈالا شوق میں فصلِ بہاری کا
چٹانوں پر بنایا نقش دل کی بیقراری کا
سکھایا گر اُسے جذبات کی آئینہ داری کا

دلِ کہسار میں محفوظ اپنی داستاں کر دی
جگر داروں نے بنیادِ جہانِ جاوداں کر دی

ہنرمندوں نے تصویروں میں گویا جان بھر دی ہے
تراز و دل میں ہو جاتی ہے وہ کافر نظر دی ہے
اداؤں سے عیاں ہے لذتِ دردِ جگر دی ہے
کھلیں گے راز اس ڈر سے دہن پر مُہر کر دی ہے

یہ تصویریں بظاہر گو یونہی خاموش رہتی ہیں
مگر اہلِ نظر پوچھیں تو دل کے بھید کہتی ہیں

کرشمہ ہے یہ سب اہلِ جنوں کی سعیِ پیہم کا
جنھیں احساس تک باقی نہ تھا کچھ شادی و غم کا
دلوں پر عکس کھنچ آیا تھا جن کے حُسنِ عالم کا
قلم کو نقش ازبر ہو گیا تھا اسمِ اعظم کا

چٹانوں پر شباب و حُسن کی موجیں رواں کر دیں
فسوں کاروں نے رنگوں میں مقید بجلیاں کر دیں

جہاں چھوڑا خوشی سے عشق کے پیغام کی خاطر
خوشا مد اہلِ دنیا کی نہیں کی کام کی خاطر
نہ چھانی خاک در در کی کسی انعام کی خاطر
جئے بھی کام کی خاطر مرے بھی کام کی خاطر

زمانے کی جبیں پر عکس چھوڑے ہیں نگاہوں کے
رہیں گے نقش ان کے، نام مٹ جائیں گے شاہوں کے

سید سکندر علی وجد

۹

اُردو کا تجدّدِ ادبی

ادب، زندگی کا پروردہ اور آئینہ دار ہے۔ ہر انقلاب آفریں واقعہ جو کسی قوم یا مُلک کی تاریخ پر اثرانداز ہوتا ہے۔ ادب پر بھی اپنا اثر چھوڑ جاتا ہے۔ ادبیاتِ اُردو کی تاریخ بھی ہندوستان کے عروج و زوال سے متاثر ہوتی رہی ہے۔ قدیم دکھنی ادب نے جس ماحول میں پرورش پائی وہ سیاسی اور معاشی برتری کا ضامن تھا۔ قوم میں جوشِ عمل تھا، زندگی تھی۔ بادشاہ اپنی رعیت کے لیے حقیقی معنوں میں ظل اللہ تھا۔ مُلک خوش تھا اور لوگ امن میں زندگی بسر کر رہے تھے یہی زمین تھی جس پر ادبیاتِ اُردو کا عطر کھینچا گیا یہی وجہ ہے کہ اس دور کی ادبیات میں بعد کے آنے والے دور کی طرح یاس و حرمان کے جذبات اور قنوطیت کا رنگ نظر نہیں آتا، بلکہ مسرت اور خوش حالی کی ہلکی ہلکی لہریں اُٹھتی ہیں جو ماحول کی پیدا کردہ ہیں۔ قدیم دکھنی ادب پر ہندی اثر غالب ہے۔ اس دور کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ہمارا ادب جمہور سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا قطب شاہی بادشاہوں نے فاتح و مفتوح کی تفریق کو دور کرنے کی جو کوشش کی تھی اس کا اثر ادبیات میں بھی اجاگر ہوتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ نے ہندوؤں کی عیدوں اور تہواروں پر نظمیں کہیں اور موضوعات شاعری میں مقامی اثر قبول کیا۔ اس دور کے ادب میں یہ رجحان عام تھا، اور شاعری صرف غزل ہی تک محدود نہیں تھی بلکہ طویل اور مسلسل نظمیں بھی لکھی گئیں جن میں رزم اور بزم کی داستانیں بیان کی گئیں۔ وؔلی کے زمانے تک ادبیاتِ اُردو پر بھی رنگ چڑھا رہا۔ وؔلی کے یہاں ہندی اثر گھٹتا اور فارسی اثر بڑھتا ہے، اور ادبیاتِ اُردو کی اُٹھان قطعی فارسی بنیادوں پر ہوتی ہے۔ ابتدا میں اسلوب سادہ تھا، مگر ہر شعر خیال ہی کے لحاظ سے نہیں بلکہ اسلوب کے لحاظ سے بھی فارسی کا ترجمہ ہوتا تھا۔ وؔلی کے بعد اُردو ادب کو ایک ایسا ماحول

نصیب ہوا جو سیاسی اور معاشی پستی کا آئینہ دار تھا۔ قوم ادبار و نکبت کی گہرائیوں میں گری جارہی تھی۔ شاہانِ مغلیہ کی عظمت و شوکت کا آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ بابری رزم آزمائیوں کی بجائے اب مغلوں کے تخت سے محمد شاہی عیش و عشرت کی تانیں اڑ رہی تھیں۔ قوم و ملک کی بدبختی کی تصویر مکمل ہوتی جارہی تھی۔ نادر شاہ کے حملے اور مرہٹوں کی خود سری نے ملک کے امن و عافیت کا نقشہ بدل دیا اور ہر طرف بدامنی اور بے اطمینانی پھیل گئی۔ ان حالات سے ایک تیسری قوم نے فایدہ اٹھایا اور رفتہ رفتہ ہندوستان کی تاریخ بدلنے لگی۔

سلطنتِ دہلی کا زوال صرف شاہانِ مغلیہ کا زوال نہ تھا بلکہ ساری قوم کا زوال تھا۔ قوم کا کردار بگڑ چکا تھا، ذاتی اور شخصی اغراض کے سامنے قوم کے مشترکہ مفاد کو ٹھکرا دیا گیا، ارکاٹ، سرینگا پٹم، پلاسی اور بکسر کی لڑائیوں میں ہندوستانی قومیت کو ایک کاری ضرب لگی، اور آخر سامنتی تمدن نے حرفتی تمدن کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اسی پست اور مایوس کن ماحول نے ادبیات اردو کے فطری بہاؤ کو روک دیا۔ اسی دور کے شعرا نے اجتماعی زندگی کی ترجمانی نہیں کی۔ سوسائٹی کی زبوں حالی اور پستی کے اثر نے انھیں قنوطی تو بنا دیا، اور وہ اپنے آشیانوں پر بجلیاں گراتے اور اپنے جنازے کو معشوق کی گلی میں سے جاتا دیکھتے رہے۔ مگر قوم کی قسمت پر جو بجلیاں گر رہی تھیں اس کا انھوں نے کہیں ذکر نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے شعرا نے اپنے گرد ایک حصار کھینچ لی تھی جس میں وہ آنکھیں بند کیے اپنے معشوق کے ساتھ کبھی سیرِ چمن کو نکلتے تو کبھی اس کی بے اعتنائیوں پر آہیں کھینچتے اور اس طرح انھوں نے سوسائٹی اور معاشرے کی کلفتوں اور بے چینیوں کو ادبیات میں داخل ہونے نہیں دیا، اور ہمارا ادب تقلیدی اور مصنوعی بن کر رہ گیا۔

شاعری دربار سے متعلق تھی اس لیے ادب کا مرکز اور محور خاص خاص شخصیتیں ہوا کرتی تھیں۔ اور شاعری میں بادشاہ اور امراہی کے رجحانات کا جن کے سایہ میں شعرا کی پرورش ہوتی تھی لحاظ رکھا جاتا تھا۔ آزاد نے "آبِ حیات" میں میاں بے تاب کا ایک قول نقل کیا ہے کہ "سید انشا کے فضل و کمال کو شاعری نے کھویا اور شاعری کو سعادت علی خاں کی مصاحبت نے ڈبویا۔" انشا کے فضل و کمال کو شاعری نے کھویا ہو یا نہ ہو، مگر حقیقت ہے کہ انشا کی شاعری نے بے راہ روی کا سبق سعادت علی خاں ہی سے سیکھا۔ یہ قول ہمارے ان سارے شاعروں پر

صادق آتا ہے جو دربار سے متوسل رہے۔ ہمارے شعرا کا مرجع سخن بادشاہ ہوتے تھے یا اُمرا۔ اس لیے شاعری میں بھی ان ہی کے مذاق اور ضروریات کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ دربار کے اثر نے ہر دور میں دو استاد شاعروں کو ایک دوسرے کا حریف بنا دیا، گویا دربار ایک ایسا اکھاڑا ہوتا تھا جس میں دو حریف شاعر اپنے سارے ہتھیاروں کے ساتھ نبرد آزما ہوتے تھے اور بادشاہ بیٹھے تماشا کرتے رہتے تھے۔ بعض وقت یہ مخالفت اتنی شدت اختیار کر لیتی کہ شعرا انتہائی رکاکت پر اتر آتے اور شاعری کی فضا ان کی گالی گلوچ سے مسموم ہو جاتی تھی۔ انشا اور مصحفی کی مخالفت نے یہی رنگ اختیار کیا تھا۔

موضوع کے لحاظ سے یہ سارا دفتر تقلیدی اور مصنوعی ہے اور اسلوب میں بھی طبقۂ متوسط کے شعرا اور متاخرین نے سادگی اور معنی آفرینی کی بجائے سارا زور فکر صنائع لفظی پر صرف کیا ہے اور ایسے دور از کار استعارے اور تشبیہیں جو ان ہی لوگوں کی سمجھ میں آسکتے تھے یا وہی پسند کرتے تھے جو زبان کی باریکیوں سے واقف ہوں اس ادب کا مایۂ ناز تھے ظاہر ہے کہ ایسا طرز نبھنے والا نہیں ہوتا اس میں ترقی کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ بند پانی کی طرح یہ ادبیات بھی چند مخصوص طبقوں میں محدود ہو کر رہ گئی۔ غرض ہماری ادبیات کا یہ کاخ بلند عوام کی رسائی سے بہت دور ہوتا گیا، اور ان کے جذبات و احساسات اور درد اور دُکھ کو اس میں کہیں جگہ نہ ملی۔ اسی دور میں صرف نظیر اکبر آبادی کی ایک ذات ایسی ہے جو بجات دہندہ کی طرح ادبیاتِ اُردو میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ نظیر نے اس خود ساختہ طبقے کے مصنوعی ادب کی بندشوں کو توڑ کر ادبیات کا دروازہ عوام کے لیے کھول دیا۔ اس نے ان ہی کی زبان میں ان سے تخاطب کیا اور ان کے درد دُکھ اور مسرت و خوشی کو ادبیات میں جگہ دی۔ اور بہ قول[1] مولوی وحید الدین سلیم مرحوم۔ "نظیر اکبر آبادی نے عام لوگوں کے میلوں ٹھیلوں اور ان کے حالات و خیالات اور مشاغلِ زندگی کی ایسی سچی تصویریں کھینچی ہیں کہ کوئی شاعر اس کا مقابلہ اس باب میں نہیں کر سکتا۔ عام شعرا نے اس کی زبان کو تسلیم نہیں کیا۔ مگر یہ ان کی غلطی ہے۔ کیوں کہ جب وہ عوام کی زندگی کا نقشہ کھینچنا چاہتا ہے تو بجز اس کے

---

[1] رسالہ اُردو، جنوری ۱۹۳۴ء۔

کوئی چارہ نہیں کہ وہ انھیں کی زبان اور انھیں کی بول چال اختیار کرے۔ اگر کبھی ہمارے تنقید نگاروں کی آنکھیں کھلیں تو اس شاعر پر اس قدر تبصرے لکھے جائیں گے جتنے کہ انگریزی زبان کے مشہور شاعر اور ڈراما نویس شکسپیر پر لکھے گئے ہیں۔ ڈاکٹر فالن نے نظیر کو ایشیا کا شاعر بتایا ہے اور اس میں شک کرنے کی مجال نہیں۔"

غدر سے پہلے کی شاعری قنوطی خیالات اور یاس انگیز جذبات سے لبریز ہے۔ ماحول کے اثر سے شعرا کی امنگیں پست اور اغراض محدود تھیں ان کی شاعری داخلی شاعری تھی، اور غزل کی ہر تان آہوں اور چیخوں پر ٹوٹتی تھی۔ اس دور کی بہترین شاعری وہی ہے جس میں رونے اور ماتم کرنے کا ذکر ہے۔ لکھنؤ میں تو جنازہ، موت اور تجہیز و تکفین لازمۂ غزل ہو گئے۔ عشق و محبت کی باتوں اور نفسیاتِ انسانی کے ذکر میں ایک طرف بلند مضامین لکھے گئے تو دوسری طرف پست ترین خیالات کا اظہار بھی کیا گیا۔ اس دور کے سب سے بڑے شاعر میر کے متعلق تک یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی شاعری "بلندش بہ غایت بلند و پستش بہ غایت پست" ہے۔ اسی دور کی ادبی قحط سالی پوری ہو جاتی، اگر اسی میں مرثیہ جیسی قابلِ قدر صنف کی شاعری کا نشو و نما نہ ہوتا۔ مرثیے نے اردو میں منظر نگاری، حقیقت نگاری اور واقعات نگاری کو رواج دیا، اور اسی طرح ادبیاتِ اردو میں رزمیہ نظموں کی کمی پوری ہو جاتی ہے۔ انیس اور دبیر اردو شاعری میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ افسوس ہے کہ ان کے بعد اس صنف میں کوئی ایسا شاعر پیدا نہ ہو سکا جو اس صنف کو آگے بڑھا سکتا۔ اور مرثیے کا عروج انیس اور دبیر ہی پر ختم ہو گیا۔

۱۸۵۷ء سے ۱۷۵۷ء تک کا دور ہندوستان کی تاریخ کا اہم ترین دور ہے۔ اس ایک صدی کی تاریخ میں ہندوستانیوں کے زوال و انحطاط کے سانحے بھی ہیں، اور بیداری کی کرنیں بھی۔ ان صفحات میں رات بھر کی رنگ رلیاں بھی ہیں، اور وہ عبرتناک صبح بھی جب نیند سے بند آنکھوں سے ان عیش پرستوں نے اپنے اسلاف کی مقدس امانت کو ایک غیر قوم کے ہاتھوں میں ہمیشہ کے لیے دے دیا۔ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ، ۱۷۵۹ء میں شاہ عالم کا انگریزوں کے ہاں پناہ لینا اور ۱۷۶۴ء میں

لہ۔ جدید اردو شاعری۔

کمپنی کو بنگال کے دیوانی کے حقوق کا دیا جانا، ایسی ہی تاریخیں ہیں جن میں ہندوستان کی تاریخ کے نقشے پر ایک نیا رنگ چڑھ رہا تھا۔ قوم کی آنکھیں اس وقت کھلیں جب کمپنی نے اپنے اختیارات کا بے جا استعمال شروع کیا۔ کمپنی کی رشوت ستانی، اور ظلم وجور نے ہندوستانیوں کو خواب سے بیدار کیا۔ مسلمانوں نے دیکھا کہ جس ملک پر صدیوں سے وہ حکمراں بن کر رہے ہیں۔ اسی سرزمین پر اب انھیں غلام بن کر جینا پڑے گا تو ان میں کمپنی کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہوئے۔ دوسری طرف ہندو اپنے نئے حکمرانوں کی تہذیب اور تمدن سے متاثر ہو رہے تھے، اور انھوں نے بہت جلد مغربی تعلیم کو قبول کر لیا۔ راجہ رام موہن رائے کی ذات میں ہندوؤں نے ایک مصلح اور ایک مذہبی پیشوا کو بھی پا لیا جس نے مذہب و معاشرت کے قدیم بندھنوں کو توڑ کر برہمو سماج کی بنیاد رکھی۔ بنگال میں مغربی تعلیم کا رواج بڑھنے لگا۔ راجہ رام موہن رائے نے اپنے خرچ سے ایک کالج قایم کیا، اور ہندوؤں کی ترقی کے لیے ایک نئی راہ کھول دی ابھی تک کمپنی مشرقی علوم ہی کی سرپرستی کر رہی تھی، اور دیسی زبانوں کو ترقی دینے میں کوشاں تھی۔ فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج اس کی مثالیں ہیں۔ فورٹ ولیم کالج ہی وہ جگہ ہے جہاں اُردو اور ہندی جھگڑے کا پہلا بیج بویا گیا۔ اُردو کے ساتھ ہندی کی (جو ابھی تک صرف بول چال کی زبان تھی) کتابیں بھی لکھی گئیں۔ اور اس طرح ہندوؤں، اور مسلمانوں کے درمیان ایک نئی خلیج کی بنیاد رکھی گئیں۔ دہلی کالج[1] ابتدا میں مشرقی علوم کی درس گاہ تھا۔ ۱۸۲۸ء جب سر چارلس مٹکاف برٹش رزیڈنٹ کی سفارش پر کالج میں انگریزی جماعت کا اضافہ ہوا، تو اس بدعت سے لوگوں میں بڑی بے چینی پھیلی اور ہندو، مسلمان دونوں نے اس کی مخالفت کی۔ یہی مشکل بنگال میں بھی پیش آئی تھی، لیکن وہاں رام موہن رائے جیسا روشن خیال رہنما موجود تھا، وہاں یہ آندھی اُٹھی تو سہی، مگر چند ہی روز میں بیٹھ گئی۔ وہاں مخالفت برہمنوں سے شروع ہوئی تھی، تو یہاں مسلمان پیش پیش تھے اور یہ کہتے تھے کہ انگریزی تعلیم ہمارے نوجوانوں کا مذہب بگاڑنے، اور اندر ہی اندر عیسائی مذہب پھیلانے کی ترکیب ہے۔ اور یہ تعلیم صرف سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ہے، نہ یہ کہ اس سے کوئی

---

[1] مرحوم دہلی کالج۔

علم حاصل ہوتا ہے۔"

۱۸۳۵ء ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں ایک انقلاب انگیز سال ہے، اور لارڈ بنٹنگ کے عہد سے جسے سرسید "گولڈن ایج" کہتے ہیں ہندوستان کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ میکالے کی کوشش سے کمپنی کی تعلیمی پالیسی بدلتی ہے۔ مشرقی تعلیم کی بجائے دفتری تعلیم کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ ۷ مارچ ۱۸۳۵ء ایک یادگار تاریخ ہے جس میں لارڈ بنٹنگ کا مشہور رزولیشن پاس ہوتا ہے۔ اس حکم کے جاری ہوتے ہی مخالفت کا ایک طوفان اٹھا۔ اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے علاوہ بڑے بڑے صاحب اثر یوروپین عہدہ دار بھی شریک تھے، جو مشرقی علوم والسنہ کے حامی تھے۔ مشرقی علوم والسنہ کا سب سے بڑا حامی اور اس معاملے میں میکالے کا بہت بڑا حریف ہنری ٹامس پرنسب[2] تھا جو گورنر جنرل کی کونسل کا ممبر تھا۔ لیکن حکم جاری ہو چکا تھا اور اس کی تعمیل ہونی ضروری تھی۔ ہندوؤں میں رفتہ رفتہ مغربی تعلیم کی مخالفت کم ہوتی گئی، اور انھوں نے اس کے حصول کی کوشش میں اپنے آپ کو ایسی جگہ کھڑا پایا جہاں سے آزادی کی راہ نکلتی تھی۔ مگر مسلمانوں کی مخالفت کا جذبہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ آخر اس جذبے نے ۱۸۵۷ء کے طوفان کی صورت اختیار کی۔ جب انگریزوں نے اس طوفان پر قابو پالیا تو ہر طرف سکون ہو چکا تھا۔ ۱۸۵۸ء میں مدراس، بمبئی، اور کلکتے میں مغربی طرز کی جامعات کا قیام عمل میں آیا۔ انگریزی تعلیم نے ہندوستانیوں کی بہت سی صلاحیتوں کو بیدار کر دیا۔ انھیں اپنی پستی اور زبوں حالی کا احساس ہوا، اور وہ قدیم نظام معاشرت کے بندھنوں سے آزاد ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ یہیں سے سیاسی اور قومی بیداری کا بھی آغاز ہوتا ہے۔ ہندوستان کی سیاسی اور قومی حیات کی تعمیر میں یہاں کے اخباروں کا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔ سیاسی دور کے اخباروں میں سیاسی اور معاشرتی مسایل کے علاوہ ادبی مسایل پر بھی بحثیں ہوتی تھیں اور دراصل ان اخباروں کے اوراق ہی ہمارے ادبی تجدد کا پس منظر ہیں۔

---

[1] ۔ تہذیب الاخلاق، ۱۲۹۷ھ۔

[2] ۔ مرحوم، دہلی کالج۔

۱۸۳۵ء میں دفاتر میں فارسی کی بجائے، اردو رائج کی گئی۔ اردو کا سب سے پہلا اخبار "اردو اخبار" ہے، جو ۱۸۳۶ء میں جاری کیا گیا۔ آزاد کے والد اس کے ایڈیٹر تھے۔ ۱۸۳۷ء میں "سید الاخبار" سر سید کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے جاری کیا۔ سر سید بھی اس میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ اردو اسلوب میں سادہ نگاری کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ اردو کی غزلیں بھی اخباروں میں چھپتی تھیں اور یہ اخبار مغربی علوم و فنون کی اشاعت میں بھی حصہ لیتے تھے۔ "قرایدالناظرین" ان سب میں پیش پیش تھا۔ اس کے ایڈیٹر ماسٹر پیارے لال تھے۔ ۱۸۵۰ء میں پنجاب کا پہلا سیاسی اخبار "کوہ نور" جاری ہوا۔ ۱۸۲۶ء سے ۱۸۵۷ء تک کے اخباروں کے اس دور میں ہندوستانیوں کی مخالفت کے جذبات نے انتہائی شدت اختیار کر لی تھی۔ حکومت پر کھلے بندوں تنقیدیں ہوتیں اور کمپنی کے مظالم کے خلاف پُرجوش احتجاج کیا جاتا۔ آخر اس سیاسی بے چینی نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی صورت اختیار کی اور ۱۸۵۸ء سے ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ملکۂ وکٹوریہ کا شاہی اعلان شایع ہوا، اور ہندوستانیوں نے سیاسی، اور قومی ارتقا کا راستہ ڈھونڈا، اور اخباروں نے بھی اپنی طرز بدل دی۔ ۱۸۵۸ء میں منشی نول کشور آں جہانی نے، جو ابھی تک "کوہ نور" میں کام کرتے تھے، لکھنؤ میں "اودھ اخبار" جاری کیا۔ "فسانۂ آزاد" اس کے ضمیمے کے طور پر شایع ہوتا تھا۔ ۷ ارمے ۱۸۷۴ء اردو ادب کی تاریخ میں ایک یادگار دن ہے۔ جب "کوہ نور" میں خبر شایع ہوئی کہ انجمن پنجاب کا ایک جلسہ کرنل ہالرائیڈ کی صدارت میں ہوا، جس میں محمد حسین آزاد نے اصلاحِ شاعری سے متعلق تقریر کی، اور اپنی نئی طرز کی سب سے پہلی نظم "شبِ قدر" سنائی۔ اس جلسے میں یہ بھی طے ہوا کہ ہر مہینے جلسے ہوا کریں اور شعرا مقررہ موضوع پر نظمیں پڑھیں۔ ۲۳ ر فروری ۱۸۷۷ء کا اخبار آریہ سماج کے قایم ہونے کی خبر دیتا ہے۔ اور اسی اخبار نے ۴ ر جون ۱۸۷۷ء سکھ شبھا کے ایک جلسے کی رویداد شایع کی۔ اہلِ پنجاب کا یہ پہلا سیاسی اجتماع تھا جس میں سر سریندر ناتھ بنرجی نے جو "انڈین اسوسیشن کلکتہ" کے بانی تھے، ایک پُرجوش تقریر کی، اور سول سروس کی عمر کے خلاف

لہ ملخص از "اردو اخبار" پنڈت دتاتریہ کیفی۔

جو اکیس[۲۱] سے انیس[۱۹] سال کردی گئی تھی، احتجاج کیا۔ ۱۳ر جون ۱۸۷۹ء کی اشاعت میں ایک مضمون چھپا، جس کا عنوان تھا "ہند میں سب کچھ ہے، لیکن صنعت و حرفت ذرا نہیں۔" ایک نظم بھی چھپی تھی جس کا شعر ہے :-

"دل ساکنانِ ہند سے کیوں کر خفا نہ ہو — افسوس یاں تو صنعت و حرفت ذرا نہ ہو"

ہندوستانیوں پر جب پہلی مرتبہ انکم ٹیکس لگایا گیا تو مخالفت کا ایک شور اٹھا، اور ہر اخبار نے اس پر لے دے کی اور آخر اس کو ختم ہی کر کے چھوڑا۔ اخبار اب سیاسی معاملات پر آزادی سے تنقید کرنے لگے۔ ۱۸۷۷ء کے "اکمل الاخبار" میں جو دہلی سے شایع ہوتا تھا بجٹ پر اس طرح تنقید کی گئی :-

"بے شک جو لوگ گورنمنٹ کے خیر خواہ، اور رعایا کے طالبِ فلاح ہیں، ہرگز اس بجیٹ کو پسند نہیں کریں گے کیوں کہ ایسا نظام کس کام کا کہ بے جنگ و جدل کے سال بھر میں خزانۂ شاہی پر اختلال، اور پے در پے انکم ٹیکس دیتے دیتے رعایا شکستہ بال کا برا حال ہے۔"

۱۸۸۳ء کے اخبارِ عام میں ایک نظم درج ہے :-

"اے ساکنانِ خطۂ ہندوستاں بڑھو — آگے نکل گئے ہیں بہت کارواں بڑھو
تا نام ایشیا کا جہاں میں بلند ہو — کاندھے پہ رکھ کے قوم کا اونچا نشاں بڑھو
بیٹھے ہو پاؤں توڑ کے کیوں کنجِ غم میں تم — دیکھو ذرا نشیب و فرازِ جہاں بڑھو
ہم لوگ تم ہیں، کہ جرس کارواں میں ہے — چلا رہا ہے طوطیِ ہندوستاں بڑھو"

یہ معلوم نہ ہو سکا کہ "یہ طوطیِ ہندوستاں" کون تھا۔

یکم دسمبر ۱۸۸۰ء کے "اودھ اخبار" میں آزاد کی "آبِ حیات" پر مفصل تبصرہ درج ہے :-

"نیرنگِ خیال کے خیالات ابھی پیشِ نظر تھے کہ پروفیسر آزاد نے ایک اور طلسم باندھ کر انجمن آراستہ کی ، بیچ میں آزاد آبِ حیات کا پیالہ لیے کھڑے ہیں۔ دور چل رہے ہیں۔ ایک جلسہ برخاست ہوتا ہے، اور دوسرا جمتا ہے۔ اردو کے شعرائے باکمال اپنا اپنا کمال دکھاتے ہیں، اور "آبِ حیات" کا جام پی کر رخصت ہوتے ہیں۔"

غرض اس دور کے اخبارات نے اپنے ماحول کے سیاسی، معاشرتی، اور ادبی رجحانات کی پوری ترجمانی کی جس کا ملک کی ذہنی بیداری، اور رائے عامّہ پر بڑا اثر پڑا۔

۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے "اودھ پنچ" کے اجرا نے اُردو ادب میں ایک نئے دور کا دروازہ کھولا، یعنے مزاحِ حسنہ، اور مطائبات کو رواج دیا، اور واقعاتِ حاضرہ اور معاشری و سیاسی مسایل پر ظریفانہ انداز میں تنقیدیں کیں۔ اودھ پنچ کی ادبی اہمیت اس سے بھی زیادہ ہے۔ اس لیے کہ اس میں اس دور کے ادبی مسایل پر دلچسپ بحثیں ہوتی تھیں۔ فسانۂ آزاد، حالی، داغ، اور گلزارِ نسیم پر "اودھ پنچ" کے صفحات میں بڑے حملے کیے گئے۔ "اودھ پنچ" اصل میں علی گڈھ تحریک کا ردِعمل تھا، مغربی تمدن اور تعلیم کی مخالفت اس کا نصب العین تھا۔ اس کے لکھنے والوں میں قدامت پرستی، اور رجعت پسندی کا عنصر نمایاں تھا۔ اکبر بھی اسی بزم کے ایک رُکن تھے۔ "اودھ پنچ" کو اردو ادب میں ایک مستقل حیثیت حاصل ہے۔ اور بہ قول ایک ادیب کے "کہ جو کام سروینٹیز نے اسپین میں، اور مولیر نے فرانس میں کیا، وہی کام منشی سجاد حسین کا اخبار ہندوستان میں کر رہا تھا۔"

ہمارے تجدّدِ ادبی کی بنیادوں کا آغاز سر سید کی اصلاحی کوششوں سے ہوا جس طرح راجہ رام موہن رائے کی ذات میں ہندوؤں نے ایک مصلح اور ایک رہنما کو پالیا تھا، پچاس سال بعد سر سید کی ذات میں مسلمانوں نے رہنمائی کی خصوصیات کو کچھ زیادہ بڑھ چڑھ کر پایا۔ بنگالی بیدار ہو چکے تھے۔ پارسی بھی ترقی کی راہ پر گامزن تھے، مگر مسلمانوں کا جذبۂ منافرت نئی تعلیم سے کسی طرح کم نہ ہوتا تھا، اور سر سید ہی کے الفاظ میں اس وقت مسلمانوں کی یہ حالت تھی:۔

"مفلسی[1] نے مسلمانوں کا گھر پسند کیا ہے۔ بے دولت کا اطلاق اگر ہو سکتا ہے تو مسلمانوں ہی پر ہو سکتا ہے چند آدمی اگر بادولت ہیں تو قوم کی بھلائی کی کچھ پروا نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ

"مرا ہست بط را ز طوفاں چہ باک"

قوم کی قوم بے علم و ہنر ہوتی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے سلف کی اس ناموری کو جو علوم و فنون میں انھوں نے حاصل کی تھی، بالکل ڈبو دیا ہے۔"

---

[1] ۔ تہذیب الاخلاق، ۱۲۹۶ھ۔

سرسید کے یہ الفاظ ان کے دل کی گہرائیوں کی آواز ہیں۔ انھوں نے یہ صدا بلند کرکے اس درجہ مخالف ماحول میں قوم کی بھلائی کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ مخالفت کا ایک طوفان اُٹھا۔ مولویوں کے گروہ سے کفر کے فتوے صادر ہوئے، مگر سرسید کے عزمِ مستحکم میں ذرا سی بھی کمزوری پیدا نہ ہوسکی۔ انھوں نے خندہ پیشانی سے ہر چیز کو سنا، اور ہمیشہ یہی کہتے رہے۔

"سخن ہائے دگر را ہم شنیدن آرزو دارم"

سرسید کی تعلیم و تربیت مشرقی اصولوں اور مشرقی تمدن کی گود میں ہوئی تھی، مگر زمانے نے بتایا کہ مخالف دھارے کے بہاؤ میں قوم کی کشتی ڈگمگا رہی ہے۔ ساحل تک پہنچنے کے لیے کسی امدادِ غیبی کی امید پر بیٹھے رہنا، اور ہاتھ پیر نہ ہلانا کچھ دانش مندی نہیں، تو انھوں نے کشتی کا رُخ پھیر دیا، اور قوم کو صحیح و سلامت ساحل تک لے آئے۔

راجہ رام موہن رائے، کشیب چندر سین، ودیا ساگر، رانا ڈے، اور دادا بھائی نوروزجی نے قوم کے لیے جو کچھ کیا، وہ اتنا حیرت انگیز نہیں۔ اس لیے کہ سارے مصلحانِ قوم نے مغربی تعلیم میں پرورش پائی تھی، اور مغربی تمدن سے آشنا تھے، اور انگریزی ادب اور زبان پر انھیں پورا عبور حاصل تھا۔ مگر ہندوستان کے مصلحین میں سرسید ہی کو یہ امتیاز حاصل رہے گا کہ مشرقی تعلیم کی گود میں پرورش پانے کے باوجود انھوں نے نہ صرف قوم کی تعلیم کو آگے بڑھا دیا، بلکہ اس دور کی سیاسی، معاشرتی، اور ادبی ترقیاں بھی ان ہی کے دامن سے لپٹی نظر آتی ہیں۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد انگریز مسلمانوں سے بدگمان ہوگئے تھے، اور غدر کا سارا الزام مسلمانوں ہی کے سر رکھتے تھے۔ ۱۸۵۸ء میں سرسید نے ایک رسالہ "اسبابِ بغاوتِ ہند" لکھا، جس میں انھوں نے اس بدگمانی کو دُور کرنے کی کوشش کی، اور بتایا کہ مذہبی وجوہات کے علاوہ سیاسی وجوہات بھی تھیں، جن سے یہ ہنگامہ برپا ہوا۔ اور یہ کہ اس کا الزام بہت کچھ حکومت پر بھی عاید ہوسکتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:۔

"حکومت[1] نے رعایا کے حالات اور عادات و خیالات، اور اوضاع و اطوارِ طبیعت،

---

[1] "اسبابِ بغاوتِ ہند" صفحہ (۱۳)۔

اور طبینت اور لیاقت کے دریافت کرنے میں توجہ نہیں کی۔ بلاشبہ ہماری گورنمنٹ کو معلوم نہیں تھا کہ ہماری رعیت پر دن کیسے گذرتا ہے، اور رات کس مصیبت سے آتی ہے، اور وہ دن بہ دن کس مصیبت میں پڑتے جاتے ہیں۔"

۱۸۶۱ء سے ۱۸۷۵ء تک سر سید کی کوششوں کا مرکز اصلاحِ معاشرت و مذہب رہا ہے۔ قوم میں تنگ دلی، اور تعصب کی برائیاں پیدا ہوگئی تھیں، سر سید نے ان برائیوں کو دور کرکے قوم کو نئی تعلیم اور نئے خیالات قبول کرنے کے لیے تیار کر دیا۔ مگر اس کے لیے انھیں بڑی کوششیں کرنی پڑیں۔

۱۸۶۳ء میں سر سید نے غازی پور میں "سائنٹفک سوسائٹی" کی بنیاد رکھی جس کا مقصد مولانا حالی نے "حیاتِ جاوید" میں اس طرح بیان کیا ہے:۔

سائنٹفک سوسائٹی اس غرض سے قایم کی گئی تھی کہ لٹریری، اور علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کراکر مغربی لٹریچر، اور مغربی علوم کا مذاق اہلِ وطن میں پیدا کیا جائے۔ علمی مضامین پر لکچر دیے جائیں۔ رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر، اور گورنمنٹ کے اصولِ حکمرانی رعایا پر ایک ایسے اخبار کے ذریعے سے ظاہر کیے جائیں جو اردو، اور انگریزی میں شایع ہوا کرے۔ ہندو، مسلمان، اور انگریز تینوں قوموں کے ممبر اس میں شریک کیے جائیں، اور اس طرح قومی مغایرت، اور مذہبی تعصبات، اور جو جھجک ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کی طرف سے ہے اس کو آہستہ آہستہ کم کیا جائے۔"

۱۸۶۴ء میں جب سر سید علی گڈھ منتقل ہوگئے تو یہ سوسائٹی بھی وہیں منتقل ہوگئی۔ ۳۰ مارچ ۱۸۶۶ء سے "انسٹیٹیوٹ گزٹ" جاری ہوا۔ یہ اخبار پہلے ہفتہ وار تھا، پھر ہفتے میں دو بار نکلنے لگا۔ ایڈیٹر خود سر سید تھے۔ مولانا حالی نے اس کے متعلق یہ رائے دی تھی:۔

"اوّل اوّل سر سید زیادہ تر اس میں پولیٹیکل معاملات پر مضامین اور نوٹ لکھتے تھے، اس لیے اس کی ابتدائی جلدوں کو ان کے پولیٹیکل ورکس کا ایک مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔"

اس اخبار کی بڑی خصوصیت یہ تھی، اس کا ایک کالم انگریزی میں اور ایک اردو میں ہوتا تھا، اور بعض مضامین اردو میں الگ، اور انگریزی میں الگ چھاپے جاتے تھے۔ اس لیے اس سے انگریز،

اور ہندوستانی یکساں فایدہ اٹھا سکتے تھے۔ اس کا خاص مقصد گورنمنٹ اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے حالات و معاملات، اور خیالات سے آگاہ کرنا، اور ہندوستانیوں کو انگریزی طرزِ حکومت سے آشنا کرنا، اور ان میں پولیٹیکل خیالات اور قابلیت اور مذاق پیدا کرنا تھا۔ اس کی ابتدائی جلدوں کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزی خیالات کو ہندوستانی لباس میں، اور ہندوستانی خیالات کو انگریزی لباس میں ظاہر کر کے دونوں قوموں کو ملانا چاہتا ہے۔ اگرچہ یہ اخبار ملک کی سوشل اصلاح کا ہمیشہ ایک عمدہ آلہ رہا ہے، اور اول اول کئی سال تک جس قدر زمانۂ حال کی نئی اصلاحیں اس کی بہ دولت ہندوستانیوں کو حاصل ہوتی رہی ہیں، ان کے لحاظ سے یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ کم سے کم شمالی ہندوستان میں عام خیالات کی تبدیلی، اور معلومات کی ترقی اس پرچے کے اجرا سے شروع ہوئی ہے، مگر اس کے ساتھ پولیٹیکل معاملات میں جو وقعت اور امتیاز اس پرچے نے گورنمنٹ اور حکام کی نظر میں حاصل کیا، وہ آج تک کسی اخبار کو نصیب نہ ہوا۔

ایک خاص وصف جو اس اخبار کے ساتھ مخصوص تھا، اور جو اس کو ہندوستان کے عام انگریزی اور دیسی اخباروں سے ممتاز کرتا تھا، یہ تھا کہ اس نے اپنے طرزِ تحریر میں برخلاف اپنے تمام ہم عصروں کے کبھی کسی فرقے، یا کسی شخص کی دل آزاری نہیں کی۔

یہ عجیب بات ہے کہ سرسید نے سائینٹفک سوسائٹی کو جس طرح ضروری سمجھ کر شروع کیا تھا جیساکہ مولانا حالی نے لکھا ہے:۔

"انھوں نے اس بات کو انگریزی تعلیم کے پھیلانے سے بھی زیادہ ضروری اور مقدم سمجھا۔"

بیس سال بعد اسی شدت سے اس کی مخالفت بھی کی ہے، جب یونیورسٹی کالج لاہور (جہاں مشرقی طرح کی تعلیم ہوتی تھی) کے یونیورسٹی بن جانے کی تحریک اٹھائی گئی تو سرسید نے "تہذیب الاخلاق" میں اس کی بڑی پُرجوش الفاظ میں مخالفت کی۔ لکھتے ہیں:۔۔۔

"ہم صاف، صاف کہنا چاہتے ہیں کہ ہم کو علوم مشرقی کے پھندے میں پھنسانا ہندوستانیوں کے ساتھ نیکی نہیں ہے بلکہ دھوکے میں ڈالنا ہے۔ ہم لارڈ میکالے کو دعا دیتے ہیں کہ خدا اس کو بہشت نصیب کرے کہ اس نے اس دھوکے کی ٹٹی کو اٹھا دیا تھا، کیا وہ ٹٹی ہمارے آنکھوں کے سامنے پھر لگائی جاتی ہے۔ بہ ذریعہ ترجموں کے علوم مغربی کے ہندوستان میں

پھیلانے کا قصد ایک ہنسی کی بات ہے۔

جو شخص اپنی قومی ہم دردی، اور دور اندیشیٔ عقل سے غور کرے گا، وہ یقینی جانے گا کہ ہندوستان کی ترقی، کیا علمی، کیا اخلاقی، صرف مغربی علوم میں اعلےٰ درجے کی تعلیم حاصل کرنے پر منحصر ہے۔ اگر ہم اصلی ترقی چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی مادری زبان کو تک بھول جائیں، تمام مشرقی علوم کو نسیاً منسیاً کر دیں۔"

فورٹ ولیم کالج کی کوششیں، اور دہلی کالج سب ناکام ثابت ہوئے۔ پھر سائینٹفک سوسائٹی علی گڈھ میں قایم ہوئی، وہ بھی ناکام ثابت ہوئی۔ جب لاہور سے اپنی زبان کے ذریعۂ تعلیم کی اہمیت پر زور دیا گیا تو سرسید نے یہ جواب دیا:-

"مگر جن ملکوں نے ایسا کیا ہے، اُن میں، اور ہندوستان میں بہت بڑا فرق ہے۔ ان ملکوں میں ایک ہی قوم، اور ایک ہی زبانِ حکومت ہے۔ مگر ہندوستان میں نہ ہندوستانی حکومت کرتے ہیں، نہ یہاں کی زبان حکمران ہے۔ پھر ان ملکوں پر ہندوستان کا قیاس ایک بہت بڑی غلطی ہے۔"

سرسید کے ان خیالات کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ اس وقت ملک میں ابھی ایسے حالات پیدا نہیں ہوئے تھے کہ مغربی تعلیم کی اشاعت دیسی زبان کے ذریعے کی جاتی۔ جو لوگ مغربی تعلیم کے نام ہی سے بھاگتے تھے وہ اسے اپنی زبان میں بھی پڑھنا نہ چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سرسید نے اس زور سے اس تحریک کی جس کو بیس سال پہلے انھوں نے خود اُٹھایا تھا، مخالفت کی۔

سرسید نے ۱۸۶۹ء میں یورپ کا سفر کیا، تو وہاں کی تہذیب اور معاشرت کو دیکھ کر ان کے دل میں اپنے ملک کی پستی، اور زبون حالی کا احساس اور شدید ہو گیا۔ اور جب انھوں نے کیمبرج، اور آکسفورڈ کی سیر کی تو وہاں کے علم نواز ماحول سے وہ ایسے متاثر ہوئے کہ اپنے ملک میں ان ہی کی طرح کی ایک درس گاہ قایم کرنے کے منصوبے سوچنے لگے۔ اور جب وہ ہندوستان واپس ہوئے تو سب سے پہلے انھوں نے "تہذیب الاخلاق" جاری کیا، تاکہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے موافق ماحول تیار کر لیں۔

حیاتِ قومی کی تعمیر کے لیے ادبی اصلاح بھی ضروری تھی۔ سرسید نے ۱۸۷۰ء سے اس کام کا

آغاز کیا، اور "تہذیب الاخلاق" کا اجرا دراصل ادبِ اردو کے نشاۃ ثانیہ کی بنیاد تھی جس پر یہ ساری عمارت کھڑی نظر آتی ہے۔ اٹھارھویں صدی کی ابتدا میں جو کام اسٹیل اور ایڈیسن کے ٹیٹلر، اور اسپکٹیٹر نے انگلستان میں کیا وہی سرسید کے "تہذیب الاخلاق" نے ہندوستان میں انجام دیا۔ قدیم ادب نے معاشرے پر جمود اور سکون، رجعت پسندی اور قنوطیت کا جو رنگ چڑھا دیا تھا سرسید نے اس کی مخالفت کا آغاز "تہذیب الاخلاق" ہی سے کیا۔ لکھتے ہیں:—

"وہ لٹریچر ایسے مبالغہ آمیز جھوٹ سے مخلوط ہے کہ پڑھنے والا یہ بھی تو نہیں جانتا کہ اصل واقعہ اس میں کیا ہے۔"

سرسید کا ساتھ دینے اور ان کے کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے اس وقت تک مسلمانوں کے بہترین دل و دماغ ان کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ مولوی ذکاء اللہ، محسن الملک، مولوی چراغ علی، نذیر احمد، حالی، شبلی، یہ سب اسی آفتاب سے اکتسابِ نور کر کے اپنے ماحول کو روشن کر رہے تھے۔ قدیم ادب کی عمارت کو ڈھانے میں مولوی ذکاء اللہ کا بھی حصہ ہے۔ ان کا ایک مضمون "شائستگی اہلِ ہند اور انشا پرداز" جو "تہذیب الاخلاق" میں چھپا تھا، اس کوشش کا بہترین مظاہرہ ہے۔ لکھتے ہیں:—

"ہماری سوسائٹی میں آزادیِ خیال کا فقدان رہا ہے اس لیے ہمارے ملک کے علم و ادب میں اس عالم کے واقعات کا ایسا ذکر نہیں جیسا کہ عالمِ خیالات کا ہے۔ ہمارا سارا علم و ادب تصوراتِ مصنوعی، اور خیالاتِ اختراعی سے بھرا ہوا ہے، جن کا مصداق خارج میں کبھی نہ ہوا ہوگا۔ ہمارے ادب میں روزمرّہ کے واقعات کا کہیں پتہ نہیں۔ ہمارے ملک کی کتبِ قصص سب سے زیادہ ارزاں تصنیفات میں سے ہیں۔ غرض اس ملک کی اصلاح اور فلاح ایسے انشا پردازوں کی جماعت پیدا ہونے پر منحصر ہے جن کے کلام میں فصاحت اور جن کے بیان میں تاثیر اور بلاغت ہو، اور جو یہ سمجھتے ہوں کہ ہمارے زمانے میں ہمارے ملک میں کیا، کیا ہو رہا ہے۔ وہ انسان کے روزمرّہ کے حالات پر پورا علم رکھتے ہوں اور جو دنیا کے علوم کو عوام تک پہنچا سکتے ہوں۔ تمام یورپ کی تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ تمام شائستگی

---

[1] حیاتِ سرسید، از لارڈ گراہم۔

اور تہذیب اور تعلیم، اور دولت کے اسباب جو وہاں مہیا ہوئے ہیں وہ ایسے ہی انشا پردازوں کی بدولت ہوئے ہیں۔ پس جو انشا پرداز دصاف مذکور کے ساتھ موصوف ہوگا وہ ایک یادگارِ ہند ہوگا جس کے اہلِ ہند ہمیشہ ممنون رہیں گے۔"

یہی آواز تھی جس پر حالی نے اپنی پتوار اُٹھائی، اور بسم اللہ کہہ کر اپنی کشتی کو مخالف دھارے کے رُخ پر ڈال دیا۔ اگرچہ جدید طرز کی شاعری کی ابتدا ۱۸۷۴ء میں آزاد کے ہاتھوں پڑ چکی تھی، مگر اس تحریک کو آگے بڑھانے اور بلندی تک پہنچانے میں حالی ہی کا حصہ زیادہ ہے۔ سرسید کی شخصیت اور قوم کی بھلائی کے لیے ان کی کوششوں سے سب سے زیادہ اگر کوئی متاثر ہوا ہے تو وہ حالی ہیں۔ "حالی کی طبیعت اور سرسید کی طبیعت میں موج اور سیل کی مناسبت تھی"۔ سرسید جس ادبی انقلاب کے آرزومند تھے، وہ آرزو حالی نے مسدسِ "مدوجزرِ اسلام" لکھ کر پوری کردی۔ یہ انقلاب غزل گوئی کا ردِ عمل تھا جس کو لکھنؤ کے خدایانِ سخن کسی طرح برداشت نہ کر سکتے تھے۔ نظیر کی طرح حالی کو بھی شاعری کے زمرے سے نکال دینے کا فتوےٰ صادر ہوا۔ مگر اب زمانہ بدل چکا تھا۔

اُردو ادب کا نشاۃِ جدید، مرحوم مہدی حسن کی زبان میں ان ہی اُردو لٹریچر کے "عناصرِ خمسہ" کی کوششوں سے عبارت ہے۔ سرسید نے زمین تیار کی، آزاد، حالی، نذیر احمد اور شبلی نے اس پر عمارت کھڑی کی۔ ان اولین معماروں میں آزاد ہی ایک ایسے ہیں جو سرسید کے اثر سے دور رہے، مگر جدید شاعری کی بنیاد ڈالنے کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔ آزاد ہی وہ ادیب اور شاعر ہیں جن کو سب سے پہلے اُردو شاعری کے تنزل کا احساس ہوا، اور آزاد ہی نے قدیم رسمی اور تقلیدی شاعری کے خلاف سب سے پہلے صدائے احتجاج بلند کی، اور شعر کے اصلی نصب العین کو عوام کے روبرو پیش کیا۔

کرنل ہال رائیڈ کی سرپرستی میں انجمن پنجاب کے مشاعرے آزاد ہی کی کوششوں سے کامیاب ہوئے۔ کسی نئے خیال کے پیدا کرنے والے، اور کسی نئی تحریک کے بانی کو دنیا جس وقعت کی نظر سے دیکھتی ہے، آزاد بھی پوری طرح اس کے مستحق ہیں۔ آزاد کی پرورش شاعری کے قدیم دبستان میں

لہ۔ جدید اُردو شاعری۔

ہوئی تھی، مگر جس دلیری سے انھوں نے قدیم دبستان کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا، وہ ان کی حق پرستی اور سیرت کی بلندی پر دال ہے۔ اُردو ادب میں آزاد کی شہرت شاعری سے زیادہ ایک صاحبِ طرز نثر نگار کی حیثیت سے ہے۔ مگر ان کی شاعری فطرت پرستی، حقایق کی تلاش، اور حیاتِ انسانی کے حسین اور شگفتہ پھولوں کے خاکہ کشی کی ایک مسلسل کوشش نظر آتی ہے۔ اور یہی جدید شاعری کا سب سے پہلا رجحان ہے۔ آزاد نے حالی کی طرح اپنی شاعری کو براہ راست ذریعہ نہیں بنایا، بالکہ شاعری کا ایک نصب العین مقرر کر دیا جو جدید تو تھا، مگر وقت کے مطالبات کا ساتھ نہ دے سکتا تھا، اور کسی طرح قوم کی بے حسی کو جھنجوڑ نہ سکتا تھا۔ یہ حالی ہی کے زندہ کُن کلام کا فیض تھا کہ قوم میں ہندوستان کے اس سرے سے اس سرے تک خیالات کا تلاطم برپا ہو گیا۔ حالی کی مثال ترکی شاعر نامق کمال کی ہے جس نے اپنی قوم کا گذشتہ عروج، اور دورِ تنزل دکھا کر زندہ رہنے اور بیدار ہونے پر کمر بستہ کر دیا تھا۔ حالی کا مسدس ایک ایسی درد بھری داستان تھی جس کو جو سنا دل تھام کر رہ جاتا۔ رونے کی تسکین کے ساتھ اس کتاب میں مسلمانوں کے فخر و غرور کا سامان بھی تھا۔ دورِ تنزل کے احساس کے ساتھ ساتھ ترقی کا راستہ بھی بتلا یا گیا تھا۔ ایسی پُرجوش، ایسی عبرت انگیز اور سبق آموز اور دلوں کو اُبھارنے والی نظم ہماری زبان میں نہیں۔ "مد و جزر" اس کا بہت ہی صحیح نام ہے۔ شعر کی نسبت یہ جو کہا گیا ہے کہ اسے حقیقت یعنے زندگی، اور واقعاتِ زندگی سے وابستہ ہونا چاہیئے۔ وہ اس پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ حالی کا یہی نغمہ تھا جس نے ساری قوم پر سحر سا کر دیا اور یہی لَے تھی جس نے قدیم شاعری کو نظروں سے گرا دیا۔ اب شاعری حقیقت نگاری تھی جو سادہ زبان میں عوام تک پہنچ رہی تھی۔ "مناجاتِ بیوہ" اور "چپ کی داد"، "سماج کی مظلوم مخلوق" عورتوں پر لکھی گئی ہیں۔ اور ان کے ذریعے سے حالی نے اپنے ماحول کی بڑی دیانت سے ترجمانی کی ہے۔

یہ حالی ہی کی شاعری کا اثر تھا کہ نذیر احمد، اور شبلی جیسے ادیبوں نے حالی ہی کی طرز میں اپنے اخیر حصۂ عمر میں شاعری کی طرف توجہ کی، اور قدیم دبستان کے اصنامِ خیالی کو ڈھانے میں حالی کا ساتھ دیا۔ نذیر احمد کی شعری کوششوں کا اُردو ادب میں کوئی مستقل درجہ

لہ۔ مولوی عبدالحق، تقریب مسدس حالی، حالی ایڈیشن۔

نہیں ہے۔ ہاں شبلی کی نظمیں ایسی ہیں جنھیں اُردو شاعری میں ایک مستقل حیثیت حاصل ہے۔ شبلی بھی علی گڑھ کی تحریک سے متاثر تھے، اور سر سید کی اصلاحوں اور کوششوں میں حالی کے ساتھ یہ بھی شامل تھے۔ اس لیے شعر و سخن کی اصلاح میں یہ بھی ان کے ہم نوا ہو گئے۔

اس[1] دور کی دو اور شخصیتوں کا ذکر ضروری ہے جو حالی سے متاثر ہو کر شاعری میں جدید راہیں نکالنا چاہتے تھے۔ ان میں ایک شرر مرحوم ہیں جنھوں نے اُردو میں نظم غیر مقفیٰ کو رواج دینا چاہا تھا اور ناول فلپانا کو نظم مقفیٰ میں پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر یہ کام نامکمل رہا، اور یہ طرز اُردو میں چل نہ سکا۔ شرر کی یہ کوشش اُردو میں پہلی اور آخری کوشش ثابت ہوئی۔

دوسری شخصیت کیفی مرحوم کی ہے۔ یہ قدیم دبستان کے شاعر تھے مگر آخیر حصۂ عمر میں اس شعری انقلاب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ کیفی نے اُردو میں ڈرامائی طرز کو رواج دینے کی کوشش کی مگر یہ طرز بھی ان ہی کے ساتھ ختم ہو گیا۔

جدید شاعری کا یہ دور قدیم ادب کو ڈھانے اور جدید شاعری کی عمارت کھڑی کرنے ہی پر ختم ہو گیا۔ اس عمارت کی گلکاریاں اور اس کی تزئین و آرائش آنے والے دور نے کی۔

سید اشفاق حسین ایم۔ اے

[1] ۔ جدید اُردو شاعری۔

قصورِ معرفت

میری ہی نامرادیوں کی انتہا نہ تھی
میرے ہی دردِ دل کی جہاں میں دوا نہ تھی

پیسا گیا میں رنگ تمنا کا دیکھ کر
تھا براخوں بدستِ تاسّف حنا نہ تھی

دکھلاتا منہ میں اپنا زمانے کو کس طرح
اپنی ہی شکل دیکھنی مجھ کو روا نہ تھی

جلنے کو بزمِ دہر میں جا شمع کو ملی
مجھ دل جلے کی محفلِ ہستی میں جا نہ تھی

منزل کا کیا بتاتا انساں میرِ کارواں
رہرو میں جبکہ معرفتِ نقشِ پا نہ تھی

آئینۂ شہود تھا واں حسنِ بے حجاب
آئینہ بینیوں کی سکت یاں ذرا نہ تھی

حق بینیوں سے میں ہی شناسا نہیں ہوا
آنکھیں نہیں دیکھنے کی، نظر آشنا نہ تھی

شکوہ فلک کا ہیچ، گلہ بخت کا فضول
اپنا قصور تھا، یہ کسی کی خطا نہ تھی

غفلت نے کھو دیا تھا مجھے دوجہان سے
مجھ کو تو این و آں کی خبر بھی ذرا نہ تھی

جو خود شناس ہوگا بنے گا خدا شناس
تھا خود نما میں میری خودی حق نما نہ تھی

ابتک جو تھا تصورِ نافہم کچھ نہ تھا
وہ کیفیت! دوئی کا جو پردہ اٹھا نہ تھی

سید علی نواز تصور رضوی امانت خانی حیدرآبادی

ہندوستان میں حکومت خوداختیاری کا قیام

ہندوستان میں برطانوی نظم ونسق کی اصلاح اوراس کے ارتقا میں شروع ہی سے دو اصول کی زبردست کار فرمائی پائی جاتی ہے۔ ایک تو خود انگریز مدبروں کی وہ کوششیں جو اس خصوص میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ اور دوسرے ہندوستانی رائے عامہ جو رفتہ رفتہ حکومت پر اثر انداز ہوتی گئی اس کا طریقہ یہ ہوتا رہا کہ جب کبھی رائج الوقت اصولِ حکومت کے خلاف بہت زیادہ چرچا ہوتا تو فوراً حکومتِ برطانیہ اس جانب توجہ کرتی، اور ایک جدید قانون کے نفاذ کے ذریعے اس کو رفع کیا جاتا چنانچہ کمپنی کے عہد کے اکثر وبیشتر قوانین واصلاحات خود انگریز مدبرین مثل منرو۔ مٹکاف۔ بینٹنگ۔ برک۔ فاکس اور شریڈن وغیرہ کی کوششوں کے نتایج ہیں، اور اُس وقت ہندوستانی رائے عامہ کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ لیکن شورشِ عظیم ۱۸۵۷ء کے بعد سے حالات نے پلٹا کھایا، اور معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوگیا۔ اہلِ ہند نے غدر کے بعد سے اس امر کو اچھی طرح محسوس کرلیا کہ ان کا خاموش رہنا مفید نہیں بلکہ بالکل بے نتیجہ ہے۔ انھیں اس امر کا اچھی طرح علم ہوچکا تھا کہ اگر انھیں حکومت میں شرکت کرنی اور اپنے معاملات کو خود سنبھالنا مقصود ہے تو پھر خاموش رہنا کچھ معنے نہیں رکھتا، بلکہ حرکت کرنی لازمی ہے اور یہ سبق بھی انھیں انگریزی تعلیم، اور مغربی سیاسی تخیل کے مطالعے سے ملا۔ اور انگریزوں نے ہی انھیں بتلایا کہ ان کو اگر واقعی اس امر کا احساس ہے کہ حکومت میں ان کی شرکت ضروری ہے تو پھر انھیں باقاعدہ متحدہ طور پر احتجاج کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ہیوم۔ بیلنٹ۔ ولیم ویڈوبرن، اور بریڈلا وغیرہ قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے نہ صرف یہ بتلایا کہ ہندوستانیوں کو خود میدان میں آنا چاہیئے، بلکہ اکثر وبیشتر مواقع پر عملی طور سے ساتھ دیا۔ ہمیں یہاں نہ تو ان حضرات کی کارگزاری سے بحث ہے، اور نہ یہ بتلانا

مقصود ہے کہ ہندوستانی رائے عامہ کس طرح تقویت حاصل کرتی گئی اور اس کا ارتقا کیوں کر عمل میں آیا،
اس کا خود وقت پر ذکر آجائے گا، لیکن یہاں یہ جان لینا ضروری ہے کہ برطانوی حکومت نے حکومت ہند کی
اصلاح، اور اصولی تبدیلی کا طرز ہی یہ اختیار کیا کہ جب کبھی رائے عامہ حکومت کے خلاف زور پکڑتی تو
فوراً حکومت کی جانب سے نہایت ہی حزم و احتیاط کے ساتھ ایک قدم آگے اُٹھایا جاتا اور کچھ
رعایتیں کی جاتیں چنانچہ تاج کی حکومت میں ہندوستانی نظم ونسق کے اصلاح کی داستان ہی یہ ہے کہ
ہر ایک قانون جس سے حکومتِ ہند کی اصلاح مطلوب ہے اس امر کا نتیجہ ہے کہ ہندوستانی رائے عامہ
اور احتجاج نے ایسی شدید صورت اختیار کی کہ حکومت برطانیہ اس کے نافذ کرنے پر مجبور ہو گئی۔
ہندوستان میں نمایندہ اور انتخابی اصول کے ترویج کا اصل محرک یہی ہندوستانی رائے عامہ ہے۔
حکومتِ برطانیہ نے باوجود اپنے شہنشاہی مقاصد کی مغائرت کے ہندوستانی رائے عامہ کا لحاظ
کرتے ہوئے اپنا یہ اصول بنالیا کہ رفتہ، رفتہ اختیارات کو جہاں تک ہوسکے تاخیر کے ساتھ ہندوستانیوں کے
حوالے کیا جائے۔ اس اصول کا قانون ہند ۱۹۱۹ء کی تمہید میں علانیہ اظہار کیا گیا، اور اہلِ ہند کو
بادلِ ناخواستہ یہ باور کرنے کی کوشش کی گئی کہ برطانوی حکومت اس امر کی خواہش مند ہے کہ
اہلِ ہند جوں، جوں حکومت کرنے کے اہل ہوتے جائیں گے وہ بھی اختیارات کو رفتہ رفتہ یعنے بالاقساط
ان کے تفویض کرتی جائے گی۔ اس اصول کی حقیقت اور واجبیت سے آیندہ بحث کی جائے گی،
لیکن اس طریقِ کار سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستان میں انگریزی نظم ونسق نے اصلاح کا
یہ خاص پہلو اختیار کرلیا کہ ہر احتجاجی دور کے بعد تھوڑی بہت رعایت اور صلاحیت کی گنجایش پیدا
کرے۔ ہمیں یہاں اس اصول پر خاص طور سے غور کرنے کی ضرورت اس لیے بھی داعی ہوئی ہے کہ
اس کی ابتدا کا اصل زمانہ وہی ہے جس وقت کے حالات ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ قبل ازیں اس امر کا
اظہار بھی ضروری ہے کہ ۱۸۵۸ء میں شاہی اعلان کے ذریعے حکومتِ برطانیہ نے ایک جدید
اصول کا اظہار کیا تھا، لیکن عملی حیثیت سے اس جانب مطلق توجہ نہیں کی گئی، بلکہ بالکل اس کے
برخلاف حکومت کو قوی اور مستحکم بنانے کی خاطر قانون مجالس ۱۸۶۱ء کی رو سے گورنر جنرل کو
ایسے خصوصی اختیارات سے مسلح کیا گیا کہ اس کے مضر نتایج نے لٹن کے رجعت پسندانہ عہد میں
اپنا پورا، پورا اثر دکھایا جس کے باعث ہندوستانی سیاسی فضا نہایت مکدر ہو چلی تھی لیکن

حُسنِ اتفاق سے انگلستان میں لبرل فریق کے برسرِ اقتدار آنے کے باعث گلاڈسٹن کی وزارت کے قایم ہوتے ہی لٹن کو بادلِ ناخواستہ مستعفی ہونا پڑا، اور رپن کا وجود اپنے فریق کے مفاد اور سیاسی حالات کے مدِنظر ہندوستان میں ضروری ہو گیا[1]۔ لٹن نے اس امر کی بے حد کوشش کی کہ اس کو کچھ عرصے کے لیے خدمت پر برقرار رہنے دیا جائے، اور حکومتِ انگلستان کی اس قدر جلد بازانہ کارروائیوں کے خلاف اس نے نئے گورنر جنرل کی آمد کو اس کی صحت کے لیے اس قدر گرم موسم جس کو کہ وہ " نو بوچند نیزا کی بھٹی سے زیادہ گرم" سے موسوم کرتا ہے سخت مُضر خیال کیا اور ایک تار کے ذریعے حکومت کو اس جلد بازی کے خلاف توجہ دلائی۔ ہارٹنگسٹن وزیرِ ہند نے اس تار کو کابینہ کے سامنے پیش کیا، لیکن کارکنانِ وزارت اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ " لٹن کو جہاں تک ہو سکے ضرر رسانی کا کم سے کم موقع دیا جائے"[2] اور رپن کو ہدایت کی گئی کہ وہ مقررہ تاریخ پر روانہ ہو جائے۔

۱۸۸۰ء میں رپن کی آمد سے حکومتِ ہند کی رجعت پسندانہ حکمتِ عملی کا خاتمہ ہو گیا اور اس کی جگہ رپن کی ہمدردانہ حکومت کا آغاز ہوا۔ تاریخِ ہند میں عہدِ رپن کو خاص اہمیت حاصل ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہاں سے تاریخِ ہند میں ایک نئے باب کی ابتدا ہوتی ہے[3]۔ چنانچہ عبداللہ یوسف علی کا بیان ہے کہ:۔ " برطانوی ہند کی تاریخ میں رپن کی پالیسی ایک امتیازی نشان ہے کیوں کہ اس کی پالیسی نے ہندوستان کے نظام میں ایک بالکل نئی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی۔ برطانیہ کے کسی اور منتظم کی حکومت تمدنی پہلو سے اس قدر اہمیت نہیں رکھتی جس قدر رپن کی حکومت رکھتی ہے"[4] لیکن رپن کے عہد کو صرف تمدنی حیثیت سے ہی امتیاز حاصل نہیں، بلکہ سیاسی حیثیت سے بھی وہی درجہ حاصل ہے۔ اور اسی عہد سے حکومت کی جدید حکمتِ عملی جو تالیف اور سیاسی تربیت پر مبنی ہے

---

[1] ۔ ہندوستان زیرِ تاجِ برطانیہ ۔ از ب ۔ د ۔ باسو صفحہ ۲۰۹ ۔

[2] ۔ سوانح عمری رپن از ل ۔ اولف صفحہ ۵ ۔

[3] ۔ انڈیا اینڈ ہوم میموایرز ۔ صفحہ ۱۷۵ ۔

[4] ۔ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ ۔ مصنفہ عبداللہ یوسف علی صفحہ ۳۰۲ ۔

شروع ہوتی ہے جس کا اظہار ۱۸۸۰ء میں صرف زبانی حیثیت سے کیا گیا تھا۔ لیکن ۱۸۸۲ء کی یادداشت جو، رپن نے وزیرِ ہند کے نام لکھی تھی اس سے نہ صرف حکومت کی حکمتِ عملی کا ہی، بلکہ خود رپن کے حقیقی جذبات، اور اہلِ ہند سے اس کی گہری دلچسپی، اور خلوص کا زبردست اظہار ہوتا ہے جس کو عملی جامہ پہنانے میں اس نے ممکنہ کوشش کی۔ چنانچہ اس کی وہ یادگار یادداشت حسبِ ذیل عبارت پر مشتمل ہے:۔

"ہر وہ شخص جو اس ملک کے موجودہ حالات پر سرسری بھی نظر رکھتا ہے، بلا شبہ اس امر کو تسلیم کرے گا کہ ہم ایک عبوری دور سے گزر رہے ہیں۔ عام اشاعتِ تعلیم، آزاد مطابع کا روز افزوں اثر من مانی نظم ونسق کی جگہ، آئینی حکومت کا قیام، ریلوں، اور تارِ برقی کی ترقی، یورپ سے رسل ورسایل کے آسان ذرایع، اور یوروپین تخیلات، ان سب باتوں کا باشندگانِ ملک پر گہرا اثر پڑ رہا ہے۔ نئے، نئے خیالات، اور احساسات پیدا ہو رہے ہیں، اور رائے عامہ کی قوت میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جا رہا ہے، اور ایک نئی تحریک کا آغاز ہو رہا ہے، جو ہر سال مزید تیز رفتاری، اور قوت کے ساتھ ترقی کرتی جا رہی ہے۔ اس صورتِ حال میں حکومت کے، اور بالخصوص ایک مطلق العنان حکومت کے کام میں غیر معمولی دشواریاں پیدا ہوتی چلی جائیں گی۔ بہت تیزی سے قدم بڑھانا مضرت رساں ہے، لیکن پیچھے رہنا اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ترقی کی نو زائیدہ اسپرٹ (ہندوستانی قومی تحریک) سے جو ابھی سطحی ہے، کیا کارروائی کی جائے، تاکہ اس طور پر اس کو صحیح راستے پر ڈالا جائے کہ اس سے وہ تمام منافع حاصل ہوں، جو اس کی ترقی سے انجامِ کار ملک کو حاصل ہو سکتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس اسپرٹ کو نادرست بے التفاتی، یا احمقانہ مزاحمت کے ذریعے مہلک سیاسی خطرہ بننے نہ دیا جائے۔ ان امور کے مدِ نظر ان کارروائیوں کو بہ ظاہر بہت معمولی ہوتی ہیں، بڑی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے، جن کے ذریعے ان جذبات اور خواہشات کی راہیں فراہم کرنا مقصود ہوتا ہے، جن کی پیدائش کا باعث وہ تعلیم، تہذیب، اور مادی ترقی ہے جو خود ہم نے اس ملک میں پیدا کی ہے۔ ایسی تدابیر سے نہ صرف عوام میں تدریجی، اور بے ضرر طور پر سیاسی تربیت بجائے خود

عام حکمتِ عملی کا ایک عظیم تر مقصد ہے، عام ہو گی، بلکہ جوں جوں یہ سیاسی تربیت عام ہوتی جائے گی، ترقی کی مزید راہیں پیدا ہوتی جائیں گی۔ پچاس سالہ آزادیٔ مطابع، اور تیس سالہ عام اشاعتِ تعلیم کے بعد ہر سمجھ دار شخص کو اس بات کی توقع رکھنا چاہیئے کہ یورپ کے خیالات کی روانی کے ساتھ ساتھ، قدیم رسم و رواج، عادات و اطوار اور تعصبات مٹتے جا رہے ہیں جس طرح کہ ریلوے کی توسیع کی سبب سے ذات پات کے بندھن ٹوٹتے جا رہے ہیں، اس طرح دیگر اثرات کے تحت ملک کے ہونہار اور تعلیم یافتہ افراد کی خواہشات اور نصب العین میں تبدیلیاں پیدا ہوتی جا رہی ہیں جس سے کوئی دانش مند اور محتاط حکومت بے التفاتی نہیں برت سکتی۔ انھیں تبدیلیوں سے حکومت کو اپنے نظم و نسق میں بہ تدریج ان سے مطابقت پیدا کرنی پڑتی ہے، ورنہ خود اپنے ہی پیدا کردہ وہ عوامل (جن کو صحیح راستے پر لگانے اور ان پر قابو حاصل کرنے میں وہ ناکام رہی) اس کے نظم و نسق کے شیرازے کو منتشر کر دیں گے۔

اگر بہ فرضِ محال ملک میں رعایا کے رجحانات اور خواہشات کے مطابق نظم و نسق کو ترتیب دینے کی ضرورت ابھی شدید نہ بھی ہو تو ہندوستان میں انگریزی حکومت کا یہ ایک قابلِ قدر مطمح نظر ہونا چاہیئے کہ ان لوگوں کو جن پر وہ حکومت کرتی ہے رفتارِ زمانہ کے ساتھ، ساتھ خود ان کو اپنے معاملات کے انصرام میں حصہ لینے کی تربیت دے۔ بسر دست ہندوستان کے سیاسی مقاصد کے لیے مذکورۂ بالا نصب العین سے اعلیٰ تر کوئی اور مقصد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ حکومتِ ہند کے سامنے اس نصب العین کو پیش کرنے کا فخر کسی لبرل مدبر کو نہیں بلکہ ایک قدامت پرست سیاست داں کو حاصل ہے۔ لیکن لبرل اصول کے ہر بہی خواہ کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ وہ دستور کی اس حکمتِ عملی کو اپنے ہاتھ سے بے نمو نہ ہونے دے اور نہ ان لوگوں کی بے التفاتی، اور دشمنی کے باعث بے اثر ہونے دے جو نہ تو اس حکمتِ عملی کا مفہوم سمجھ سکتے ہیں، اور نہ اس کی دانش مندی کی قدر کر سکتے ہیں۔

حکومتِ ہند کے سامنے اب تک بلاشبہ دو مسلک رہے ہیں، ان میں سے پہلا مسلک تو

ان لوگوں کا ہے جنھوں نے ملک میں آزادیِ مطابع قایم کیا، تعلیم کی اشاعت کی، اہلِ ملک کو گوناگوں طریقوں سے حکومت کے مختلف شعبوں میں شرکت کا زیادہ سے زیادہ موقع دیا اور حکومتِ خود اختیاری کی حمایت کی۔

دوسرا مسلک ان لوگوں کا ہے جنھیں آزادیِ مطابع سے نفرت، تعلیم کی ترقی سے خوف، اور اور جو باشندگانِ ہند کی خود ان کے معاملات کے انصرام میں شرکت کو، خواہ وہ کتنی ہی محدود ہی کیوں نہ ہو، حسد اور خوف کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ ہمیں اب انھیں دو مسالک میں سے کسی ایک کو پسند کرنا ہے۔ ایک کے معنے ترقی کے ہیں، دوسرے کا مفہوم استبداد۔ لٹن نے آخر الذکر مسلک کو اختیار کیا، اور میں (رپن) اول الذکر کو، اور میں نے اپنے دعوے کی بنیاد دونوں مسلکوں کے مقابلے پر رکھی ہے۔[1]"

رپن نے اپنی مندرجۂ بالا حکمتِ عملی کو صرف کاغذی حد تک ہی محدود رہنے نہیں دیا، بلکہ حقیقی معنوں میں وہ اس کے روبہ عمل لانے کی انتہائی کوشش کرتا رہا، اور حکومت میں ہندوستانیوں کی شرکت اور ان کے وقار کو بڑھانے کی ممکنہ کوشش کی۔ چنانچہ بنگال کے مشہور لیڈر سر سریندر ناتھ بنرجی کا خود بیان ہے کہ: "رپن کا ہندوستان کی گورنر جنرلی پر تقرر اہلِ ہند کے لیے باعثِ صد اطمینان ہوا۔"[2] اور ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ: "کسی اور گورنر جنرل نے اس مبارک مقصد (اہلِ ہند کی حکومت میں شرکت) کی ترقی میں اس سے زیادہ کوشش نہیں کی۔"[3] چنانچہ رپن کے عہد کے ابتدائی کاموں میں بھی لبرل اصول (رپن) کی کارفرمائی پائی جاتی ہے۔ صرف پریس ایکٹ کی تنسیخ، اور تعلیمی تجاویز سے ہی اس کے عہد کے خصوصیات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ۱۸۸۰ء سے قبل حکومتِ ہند، اور حکومتِ انگلستان کی پالیسی ایک ہی رہی تھی۔ چنانچہ تاریخِ ہند کا وہ انتہائی رجعت پسندانہ دور شمار کیا جاتا ہے جس کا اندازہ خود رپن کے سوانح نگار لوسین وولف کے

---

[1] وزیر ہند کی مراسلت ۱۸۹۲ء۔

[2] سوانح عمری رپن صفحہ ۹۲ تا ۹۵۔

[3] اے نیشن ان میکنگ صفحہ ۶۳۔

[4] " " " " ۶۶۔

اس بیان سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ: "قانونِ مطابع کی تنسیخ اگرچہ فی نفسہٖ اہم نہ تھی، لیکن اس نے لٹن اور رپن کی روایات کے بنیادی اختلافات کی کسوٹی کی اہمیت اختیار کرلی۔"[1] اور اسی طرح انگلستان میں بھی ڈزرائیلی کی حکومت نے جس اصول کی تائید کی تھی گلاڈسٹن کی حکومت نے اس کی قطعی مخالفت کی، اور پریس ایکٹ کی تنسیخ کے بارے میں ہارٹنگٹن وزیرِ ہند نے رپن کو لکھا کہ دارالعوام کی برسرِ اقتدار جماعت اور سب سے زیادہ گلاڈسٹن قانون (پریس ایکٹ کی) تنسیخ، یا ترمیم کے لیے انتہا خواہش مند ہیں۔" چنانچہ جنوری سنہ ۱۸۸۱ء ایک مراسلہ ہندوستان بھیجا گیا جس میں تجویز کی گئی کہ قانون کی تنسیخ پر غور کیا جائے، اور اگر ضرورت ہو تو قانون تعزیرات کے کسی دفعہ میں ترمیم کرلی جائے، تاکہ اشتعال انگیز تحریکات کا عام قانون کے ذریعے ہی سدِ باب کیا جاسکے۔[2] ان امور سے نہ صرف حکومتِ برطانیہ و حکومتِ ہند کی حکمتِ عملی کی ضروری تبدیلی ہو جاتی ہے، بلکہ اصل شئے جو اس کی تہ میں کارفرما ہے یعنے ہندوستانی رائے عامہ اور اس کا اثر جو اس وقت کی سیاسی فضا پر مترتب ہو رہا تھا، اس کا بھی بہ خوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اور ہندوستانیوں کی یہ خوش نصیبی تھی کہ حقیقت میں انھیں رپن جیسا ایک ہمدرد شخص بھی مل گیا جس نے حکومت کی اس جدید حکمتِ عملی کو کما حقہٗ آگے بڑھایا وہ کسی وقتی رعایت سے کام لینا نہیں چاہتا تھا، بلکہ حقیقی معنوں میں اصلاحات اور اہلِ ہند کی سیاسی تربیت کے مواقع فراہم کرنے کا خواہاں تھا؛ اس کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ انتظامی اختیارات کام میں لاتے ہوئے خود ایکٹ (پریس) کے الفاظ کے مطابق ہندوستان کے تمام علاقوں کو اس کے اثر سے آزاد کر دے۔ لیکن وہ ایسا کرنے کا سخت مخالف تھا۔ جو بات اس کے نزدیک اہم تر تھی وہ اس قانون (کتابِ نوامیس) کے اوراق سے خارج کرا دینا تھا۔"[3] اس طرح اس کی تعلیمی حکمتِ عملی بھی عملی حیثیت سے مفہوم رکھتی تھی، چنانچہ اس نے جس اصول کی تائید کی، اور اس کے زمانے میں تعلیمی کمیشن نے جو تحقیقات کی اس کے عہد کی ایک شاندار یادگار رہے۔

---

[1] سوانح عمری رپن صفحہ ۱۰۸۔

[2] ؍؍ ؍؍ ۱۱۱۔

[3] ؍؍ ؍؍ ؍؍ ۔

رپن کے پیشِ نظر ان جزوی اصلاحات کے سوا سب سے اہم امر جو تھا وہ ۱۸۵۸ء کے اعلان کردہ اصول کا عملی طور پر جاری کرنا تھا۔ اور رپن کو اس خطرے کا اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا جو اس پر گذشتہ بیس[1] سال سے عمل پیرا نہ ہونے کی بنا پر پیدا ہوگیا تھا۔ اب تک حکومتِ ہند نے ہندوستانیوں کو صرف چند سیول خدمات کا ہی موقع دیا تھا، اور حکومت کی حکمتِ عملی کی تشکیل میں ہندوستانیوں کا مطلق دخل نہ تھا جس کی وجہ سے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کا ایک طبقہ ایسا پیدا ہوگیا جو اس امر کو شدت سے محسوس کر رہا تھا کہ ہندوستانیوں کو نہ صرف اعلےٰ خدمات پر ہی مامور کیا جائے بلکہ حکومت کی حکمتِ عملی کی تشکیل میں بھی انھیں شریک ہونے کا موقع دیا جائے۔ رپن نے بہت پہلے ہی اس کا اندازہ لگا لیا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی ۱۸۸۲ء کی یادداشت میں جس کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں صریح تذکرہ کر دیا کہ ہندوستان میں ایک نئی اسپرٹ پیدا ہو رہی ہے۔ اس کو صحیح راستے پر لگانا، اور اس کی تربیت کرنا بے حد ضروری ہے، ورنہ سخت خطرناک حادثات کا سامنا کرنا ہوگا، ایسا طرزِ عمل ملکۂ معظمہ کے منشاء کے بھی خلاف ہوگا۔

اسی اصول کے مدِ نظر اس نے پہلے مرکزی، اور صوبہ جاتی مقننات میں ہندوستانی انتخابی عنصر کے داخلے کے امکانات پر غور کیا لیکن اس خیال کو اس نے فی الوقت زیادہ ناقابلِ عمل سمجھ کر، اور اپنی حکومتِ خود اختیاری کی تجویز کو جس میں کہ ہندوستانیوں کی حقیقی سیاسی تربیت کی بہت زیادہ گنجائش تھی موزوں تصور کیا[2]۔ مقامی کمیٹیاں جو امورِ عامہ کے چھوٹے چھوٹے اغراض کی تکمیل کیا کرتی تھیں، مثل ابتدائی تعلیم، اصول حفظانِ صحت کی دیکھ بھال وغیرہ ملک کے مختلف حصوں میں پائی جاتی تھیں۔ اور بعض بلدیات میں معمولی انتخابی عنصر بھی موجود تھا، اور انھیں ادارات کی حوصلہ افزائی اور اصلاح اس مقصد کے پیشِ نظر کہ ان کے ذریعے سیاسی تربیت دی جائے رپن نے اپنا فی الحال نصب العین قرار دیا[2]۔ اور اس سلسلے میں ۱۲ جولائی ۱۸۸۲ء ہارٹنگٹن وزیرِ ہند کو ایک خط لکھا کہ:-

"جب سے میں ہندوستان آیا ہوں یہاں میں نے ابتدا ہی سے اس مسئلے کی جانب اپنی توجہ کو

---

[1] سوانح عمری رپن صفحہ ۵۹۔

[2] انڈیا ہوم پبلک ابسٹرکٹ منسلکہ صفحہ ۱۳۲۔

خاص طور پر مرکوز پایا ہے۔ اور ۱۸۸۰ء کے دورہ کے دوران میں یہ مسئلہ کئی اعتبار سے میرے پیشِ نظر رہا، اور اس سال کے ختم سے تو میری توجہ کا خاص مرکز بنا ہوا ہے۔ . . . . اب میں اس کے متعلق نہ صرف مواد جمع کر رہا ہوں بلکہ اس کے بارے میں صوبہ جاتی حکومتوں سے بھی استصواب کر رہا ہوں۔[1]"

اس کے بعد ہی اس نے ۵؍ اکتوبر ۱۸۸۲ء گلاڈسٹن کو ایک خط لکھا کہ:-

"ہندوستان میں دفتری حکومت ہے، جو بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنی نوعیت کی اس قسم کی حکومتوں میں سب سے بہتر ہے، لیکن پھر بھی اس میں نقائص اور خطرات پائے جاتے ہیں جو اس قسم کے اداروں سے اکثر و بیشتر وابستہ ہوتے ہیں۔ انھیں میں سے ایک نقص وہ رشک و حسد بھی ہے جو غیر سرکاری عنصر کے حکومت کے نظم و نسق میں شرکت سے متعلق ہے، خواہ وہ شرکت کتنی ہی محدود اور مختصر ہی کیوں نہ ہو۔[2]"

رپن ابھی اس فکر میں ہی تھا کہ حکومتِ خود اختیاری کو ہندوستان میں انتخابی اصول پر جاری کیا جائے کہ اتفاق سے مرکزی اور صوبہ جاتی حکومتوں کے پنج سالہ معاہدوں کی نظرِ ثانی کا وقت آگیا، اور رپن کو خود بخود موقع ہاتھ آگیا کہ اپنی مقامی حکومت خود اختیاری کی تجویز کو بروئے کار لائے۔ میو کی مالی عدم مرکزیت کی تجویز کے تحت مرکزی اور صوبہ جاتی حکومتوں کے مابین آمدنی اور خرچ کی باہمی تقسیم کے معاہدے ہوا کرتے تھے اور یہ معمول ہو گیا تھا کہ جب ایسے معاہدات پنج سالہ نظرِ ثانی کے لیے آتے تو صوبہ جاتی حکومتوں کا دائرۂ عمل وسیع تو کیا جاتا۔ ۱۸۸۱ء میں حسبِ معمول جب معاہدات کی نظرِ ثانی کا وقت آیا تو حکومتِ ہند نے اعلان کیا کہ حسبِ قرارداد ۱۸۸۱ء اب وقت آگیا ہے کہ ایسے معاہدوں میں حکومتِ خود اختیاری کے مسئلے کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ صوبہ جاتی حکومتوں کے سامنے یہ تجویز پیش کی گئی کہ انھیں بعض معاملات میں فرائض اور مالیات کا بار اسی طرح مجالسِ عامہ (میونسپلیٹیوں وغیرہ) کی طرف سے منتقل کر دینا چاہیے جس طرح حکومتِ ہند نے اپنے اختیارات صوبوں کی حکومتوں کے سپرد کر رکھے تھے۔ صوبہ جاتی حکومتوں کو یہ رپورٹ پیش کرنے کی ہدایت کی گئی کہ کونسے ابواب آمدنی و محاصل مقامی مجالس کے تفویض کیے جا سکتے ہیں، اور اس کے ساتھ ہی ساتھ

---

[1] سوانح عمری رپن صفحہ ۹۶۔

[2] " " " "

ان مجالس میں منتخبہ عنصر کا بھی خیال رکھا جائے[1]"۔ اور حکومت کی اس مصرحہ بالا حکمتِ عملی کو صوبہ جاتی حکومتوں نے پوری اطاعت گذاری، اور بعضوں نے تو تہہِ دل سے خوش آمدید کہا۔ جب کہ حکومت خود اس مسئلے پر غور کر رہی تھی، اور مقامی حکومتوں سے بھی استصواب کیا جا رہا تھا، اس وقت اہلِ ملک بالکل خاموش نہیں بیٹھے رہے، انھوں نے بھی اس کے متعلق اپنے تجاویز اور اظہارِ خوشنودی میں کوتاہی نہیں کی بلکہ اس کی شاندار حکمتِ عملی کا اعلان ان افراد کے لیے جو اپنے ملک کی ترقی کے لیے کوشاں تھے ایک دعوتِ عام تھی کہ وہ اس حکمتِ عملی کو جامۂ عمل پہنانے میں حکومت کی مساعدت کریں[2]۔ چنانچہ انڈین ایسوسی ایشن نے فوراً اپنا کام شروع کر دیا۔ ایک گشتی جاری کی گئی اور اطراف و اکناف کے دیہات سے محصول ادا کرنے والوں کو یکجا جمع کرنے کے لیے نمایندے بھیجے گئے تاکہ حکومت کو اس امر پر آمادہ کیا جائے کہ وہ ان مجالس مقامی کو عمومی اور انتخابی اصولوں پر جاری کرے۔ حتیٰ کہ بنرجی خود مختلف مقامات پر گئے اور جلسوں اور تقاریر کے ذریعے حکومتِ خود اختیاری کے مسئلے پر ملک کی رائے کا اندازہ کیا اور جہاں کہیں نمایندوں کا جانا ناممکن تھا وہاں سے تحریری آراء طلب کی گئیں اور اس طرح اس تجویز کے بارے میں ملک کی رائے اور منشاء کا یقین کر لینے کے بعد ۱۸ فروری ۱۸۸۱ء ٹاؤن ہال کلکتہ میں ایک جلسۂ عام منعقد کیا گیا جس میں بنرجی نے ایک قرارداد پیش کی جس کے اہم نکات حسبِ ذیل ہیں:۔

(الف) مقامی مجالس کی تشکیل عمومی و انتخابی اصول پر مبنی ہو۔

(ب) ان کے اختیارات میں توسیع کی جائے۔

(ج) مجالس کے صدرنشین کا انتخاب خود مجالس کے ذریعے عمل میں آئے[3]۔

لیکن یہ امر خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے کہ حکومت نے بھی اس تجویز پر عمل کرنے کے لیے اپنی قراردادوں میں وہی اصول کا اظہار کیا جس کے کہ ہندوستانی متمنی تھے اور حکومت کے اس طرزِ عمل سے ہندوستانیوں کو اندازہ ہو گیا کہ ان کی رائے عامہ کا حکومت پر کتنا اثر پڑ رہا تھا، اور حکومت کس قدر ان کے

---

[1] انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ۔ مصنفہ عبداللہ یوسف علی صفحہ ۳۰۷۔

[2] اے نیشن ان میکنگ صفحہ ۶۴۔

[3] سوانح عمری ربن صفحہ ۶۴ و ۶۵۔

حسب منشا رہونی چلی جا رہی تھی چنانچہ خود بنرجی نے کہا ہے کہ یہاں سرکاری اور عام رائے کے مکمل اتحادِ خیال کی ایک نمایاں مثال ملتی ہے'۔ اور یہ بھی واضح رہے کہ اس کے بعد بہت جلد ہی رپن نے جامعۂ کلکتہ کے چانسلر کی حیثیت سے اعلان کیا کہ وہ دن دور نہیں جب کہ ہندوستان میں بھی رائے عامہ حکومت کی ناقابلِ مزاحمت اور ناقابلِ انکار رہنما ہو جائے گی۔[1]

مندرجۂ بالا اصول کے تحت مئی ۱۸۸۲ء کی قرارداد کی بنا پر موثر پیرایئے میں حکومتِ خود اختیاری کا نشو و نما ہونا شروع ہوا، اور رپن کے حسب منشا کہ اس کے ذریعے صرف نظم و نسق کی اصلاح ہی مراد نہ تھی بلکہ اس کی اصلی غایت عمومی اور سیاسی تربیت تھی۔ لہٰذا قرارداد کی رو سے حسب ذیل تجاویز پیش کی گئیں۔

سب سے پہلے صوبہ جاتی حکومتوں پر یہ فرض عاید کیا گیا کہ وہ نہ صرف شہروں اور قصبات ہی میں بلکہ تمام ملک میں مقامی مجالس کا ایک جال کچھ فرایض کی وابستگی اور کچھ معینہ رقم کے اختیارات کے ساتھ پھیلا دیں۔[2] اس وقت تک دیہی علاقوں میں مقامی مجالس کا کوئی وجود ہی نہ تھا، بلکہ مقامی سڑکوں، مدارس اور شفا خانوں کے لیے جو رقم مختص ہوتی اس کا انتظام افسرِ ضلع مقامی مشورتی جماعت کی رائے کے ساتھ کرتا لیکن قرارداد کے ذریعے ان مشورتی جماعتوں کا خاتمہ ہو گیا، اور حکومتِ خود اختیاری کے اداروں کا دیہی علاقوں میں قیام عمل میں آیا، اور اس تجربے کو کامیاب بنانے کے لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ ان مجالس کے اراکین میں مقامی معاملات سے دلچسپی اور مقامی امور کے متعلق معلومات فراہم کیے جائیں، اسی لیے یہ اہتمام کیا گیا کہ ان مجالس کے زیرِ انتظام جو علاقہ ہو وہ زیادہ وسیع نہ ہونے پائے۔ کمترین انتظامی اکائی تعلقہ یا تحصیل کو ہی کسی مجلس مقامی کے زیرِ انتظام رقبے کی بیش ترین وسعت قرار دیا گیا۔ اور بعض صوبہ جات میں یہ توقع کی گئی کہ یہ مجالس آزادانہ طور پر اپنے اختیارات کا استعمال کر سکیں گی۔ امورِ عامہ مثلاً دورانِ سال کے شرح لوکل فنڈ کا تعین کرنا، اضلاع کے ممات میں رقمی منظوریاں اور دیگر مفادِ عامہ کے امور[3] کا ان "موفقی مجالس ضلع" میں طے پانا قرار پایا جن میں ہر مقامی مجلس سے

---

[1] ۔ سوانح عمری رپن صفحہ ۶۶۔

[2] ۔ ہندوستان کے دستوری دستاویزات از بنرجی، جلد اوّل صفحہ ۶۴۴۔ قرارداد کا دسواں فقرہ۔

[3] ۔ " " " " ۶۶۴۔

نمایندے بھیجے جاتے ــــ البتہ دیگر صوبہ جات میں مقامی مجالس پر مجلس ضلع کا اثر ضروری سمجھا گیا ــــ قرارداد کے ذریعے یہ بھی طے پایا کہ کسی حالت میں بھی سرکاری اراکین کی تعداد کل تہائی کی ایک تہائی سے زاید نہ ہونے پائے[1] اور اس طرح دیہی اور شہری ہر دو قسم کے مجالس میں غیر سرکاری اراکین کو غلبہ حاصل ہوگیا۔

گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل نے "انتخابی اصول کے ترویج کی سفارش اس حد تک کی کہ جس قدر مقامی حالات اس امر کی اجازت دے سکیں"[2] اسی لیے انتخاب کے مختلف اصولوں کو پیش کیا گیا کہ "ہر ایک صوبہ اپنے حالات کے مدنظر نہایت ہی موزوں اصول کو اختیار کرسکے۔ چنانچہ معمولی رائے دہی، اجتماعی حلقہ واری، علاقہ واری، شہر واری قابلیت (محدود، یا وسیع) کی بناء پر رائے دہی کا فرقہ واری، یا پیشہ واری طریق انتخاب، اور اسی قسم کے دوسرے تمام طریقوں کو اختیار کیا جاسکتا تھا"[3] بہرحال جو بھی صوبے کے حالات کے لحاظ سے مناسب ہو اس قرارداد سے گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کی اس خواہش کا خاص طور پر اظہار ہوتا ہے کہ "جہاں تک ہوسکے غیر سرکاری اراکین ہی ان مجالس کے صدر نشین ہوا کریں اور بہ راہِ راست ان کی رہ نمائی اور تنظیم کریں ...... لیکن گورنر جنرل کو اس امر کا یقین تھا کہ مقامی مجالس کی بہتری کے لیے اس قسم کے کسی اصول کی پابندی نہیں ہونی چاہیئے کیوں کہ جب تک عاملہ کے اعلیٰ افسر مجالس ضلع وبلدیات کے صدر رہوں گے لازمی طور پر ان مجالس کو بہت ہی کم موقع حاصل رہے گا کہ اراکین مقامی معاملات کے انتظامات کے سلسلے میں کوئی موثر تربیت حاصل کرسکیں، یا غیر سرکاری اراکین کی کم از کم دلچسپی کا باعث بن سکیں۔ غیر سرکاری اراکین کو کم از کم اس کا یقین دلانے کی ضرورت ہے کہ حقیقی اختیارات انھیں کے ہاتھ میں رکھے گئے ہیں، اور انھیں حقیقی ذمہ داری قبول کرنا ہے ـــ اور یہ اندیشہ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو "افسر ضلع کے صدر مجلس ہونے میں ہے کہ اگر اراکین مجلس زیادہ آزاد خیال اور کارگذار واقع ہوں تو غیر محسوس طور پر صدر اور مجلس کے درمیان تصادم کا خطرہ پیدا ہوتا چلا جائے گا"[4] اور دوسری وجہ گورنر جنرل کے خیال میں یہ تھی کہ

۱۔ پیرا (۱۲) قرارداد صفحہ ۶۴۵۔
۲۔ " (۱۳) " " ۔
۳۔ " (۱۴) " ۶۴۶۔
۴۔ " (۱۸) " ۶۴۸ و ۶۴۹۔

"ہندوستانی تعلیم یافتہ جماعت کی قابلیت کا صحیح اندازہ کرنے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ ان کو عملی کام کا موقع دیا جائے اور ان کے لیے ایسے مواقع فراہم کیے جائیں کہ جن سے ہمیں (انگریزوں کو) سطحی اور ٹھوس معلومات اور زبانی جمع و خرچ، اور عملی کارگزاری کا فرق معلوم ہوسکے۔" [1]

آخرالامر قرارداد کی رو سے مقامی مجالس کی نگرانی کے لیے یہ قرار دیا گیا کہ "نگرانی اندرونی طور پر نہیں بلکہ خارجی طور پر ہو۔" [2] اس کے اصول کے متعلق خود رپن، ٹام ہیوز، کو ایک خط میں لکھتا ہے کہ اگر بورڈس سے خود ہندوستانیوں کا اپنے معاملات کے انصرام کی تربیت کا کام لیا جانا مقصود ہے تو بورڈس کو بڑے صاحب (افسران عاملہ و دیگر انگریزوں کی) ہمیشہ کی موجودگی سے نجات ملنی چاہیے، انھیں رفتہ رفتہ آزادیٔ عمل دی جائے۔ بیرونی طور پر جماعتِ عاملہ ان کی نگرانی کرتی رہے اور راہِ راست سے متجاوز ہونے پر مزاحمت بھی کی جائے۔" مزید برآں رپن کا خیال ہے کہ "تاوقتیکہ انھیں کسی قدر آزادیٔ عمل نہ دی جائے قابل افراد ان میں شریک نہ ہوں گے، لہذا بورڈس میں ناقابلِ اعتماد افراد کا جمگھٹا ہو جائے گا، بااب کی طرح بورڈس محض ڈھکوسلا ہی رہیں گے اسی لیے میرا خیال ہے کہ افسرانِ ضلع کی حیثیت بورڈ سے باہر ہی زیادہ باوقار، اور کہیں زیادہ غیر جانب دار رہے گی، چہ جائے کہ وہ خود بہ حیثیت صدر بورڈ کی کارروائیوں پر اثر انداز ہوں یا بحث مباحثوں میں شریک ہوں ___ اگرچہ میں (رپن) مندرجۂ بالا اسباب کی بنا پر افسرانِ عاملہ کو مقامی مجالس سے جس قدر ہوسکے دور ہی رکھنا چاہتا ہوں، لیکن قرارداد کی رو سے حکومت کے پاس اقتدار اور نگرانی کے پورے پورے اختیارات محفوظ ہیں جن سے وہ مجالسِ مقامی کو اپنے فرائض کی کماحقہٗ انجام دہی پر مجبور کرسکتی ہے، اور ہر قسم کی ضرر رسانی سے انھیں باز رکھا جاسکتا ہے۔" [3]

اگرچہ رپن کا مقصد حکومتِ خود اختیاری کے اداروں سے ہندوستانیوں کو صرف عملی طور پر سیاسی تربیت دینا، اور مقامی معاملات کے انتظامات میں دلچسپی پیدا کرنا تھا۔

---

[1] سوانح عمری رپن صفحہ ۱۰۲۔

[2] پیرا (۱۷) قرارداد صفحہ ۶۴۷ و ۶۴۸۔

[3] سوانح عمری رپن صفحہ ۹۹۔

لیکن اس کے مخالفین نے اس چیز کو دوسری طرز پر پیش کرنے کی کوشش کی چنانچہ اس کے پیش رو لٹن نے پارلیمنٹ میں اس کی پالیسی پر اس طرح نکتہ چینی کی کہ "دراصل رفتہ رفتہ حکومت کے تمام سیاسی اختیارات کو یوروپین افراد کے ہاتھ سے نکال کر ہندوستانیوں کے حوالے کر دینا ہے"۔[1] لیکن رپن ہندوستانی حالات، اور احساسات کا اچھی طرح علم رکھتا تھا، اس نے اس امر کی چنداں پروا نہیں کی، بلکہ اس نے اپنے حقیقی منشا کو صاف طور پر واضح کر دیا کہ اس قسم کے اصولوں سے "مقصود یہ نہیں ہے کہ یوروپین جمہوری طرز پر لوگوں کی نمایندگی کی جائے، بلکہ قوم کے بہترین ذہن اور نہایت بارسوخ، اور ذی اثر افراد کو بہ تدریج اس امر کی تعلیم دی جائے کہ وہ اپنے مقامی معاملات میں نہایت دلچسپی اور سرگرمی سے حصہ لیں" اور اس سے "میرا مقصد ہندوستان میں انگریزی طریقے کو جاری کرنا نہیں، بلکہ میں ملک ہی کے قدیم طریقے کو از سرِ نو جاری کرنے کا خواہش مند ہوں، اس قدیم طریقے کو جس کو بڑی حد تک ہم (انگریزوں) ہی نے تباہ کیا ہے، لیکن اس کے آثار ملک کے اکثر حصوں میں کم و بیش اب بھی موجود ہیں۔ اور انھیں مابقی آثار پر میں اپنی حکومت خود اختیاری کی شاندار عمارت کی بنیاد رکھنا چاہتا ہوں"۔[2] اس اعتبار سے بھی ہندوستان کے لیے یہ کوئی نئی چیز نہ تھی، لیکن اس کو جدید اصولوں پر رائج کرنا، اور عمومی طرز پر چلانا البتہ نئی بات ضرور تھی۔

رپن نے مندرجہ بالا اصولوں کی بنا پر جب صوبہ جاتی حکومتوں سے اس کے متعلق استصواب کیا تو پنجاب کے لفٹننٹ گورنر چارلس ایچیسن، یو۔پی کے لفٹنٹ گورنر الفریڈ لیال، اور مدراس کے گورنر گرانٹ ڈف نے اس تجویز کی نہ صرف تائید کی بلکہ اس کی معقولیت کو بھی تسلیم کیا۔ برما، اور صوبۂ متوسط نے بھی تائید کی۔[3] لیکن صرف بمبئی کے گورنر فرگیوسن (جو قدامت پرست فریق سے تھا) اس نے اس کی مخالفت کی لیکن بعد میں مرکزی حکومت کے زیرِ اثر اس نے بھی موافقت ظاہر کی تو

---

[1] سوانح عمری رپن صفحہ ۱۰۲۔

[2] فقرہ ۱۷ قرارداد صفحہ ۶۴۷ و ۶۴۸۔

[3] سوانح عمری رپن صفحہ ۱۰۰۔

[4] " " " ۱۰۴۔

انگلستان کی حکومت کو بھی اس کی تائید کرنے میں کوئی امر مانع نہیں رہا، اب رہا یہ اندیشہ کہ اس کے جاری کرنے سے حکامِ ضلع کے اختیارات میں کمی واقع ہوگی، اس کا معقول جواب یوں دیا گیا کہ "حکامِ ضلع کا کام یہ نہیں ہے کہ کسانوں کو یہ بتلائیں کہ وہ کونسی فصل بوئیں، اور کیا کھاد استعمال کریں"۔ بلکہ برخلاف اس کے اس تجویز کی کامیابی، اور معقولیت کا اظہار ہندوستان کی مادّی و اخلاقی ترقی کی دہ سالہ رپورٹ سے ہوتا ہے کہ "حکومتِ خود اختیاری کی توسیع نہ صرف اعلیٰ افسرانِ عاملہ کی توجہ کو روز افزوں معمولی امور کی نگرانی سے ہٹا کر اہم تر امور کی جانب منعطف کرنے کا باعث ہوئی بلکہ وہ عوام کی (سیاسی) تربیت کا وسیلہ بھی بن گئی"۔[1]

رپن کے ہندوستان چھوڑنے سے بہت پہلے ہی ۱۸۸۳ء و ۱۸۸۴ء ہی میں ہندوستان کے مختلف صوبہ جات میں قوانین حکومتِ خود اختیاری منظور کر لیے گئے تھے، تاکہ حکومت کی اس جدید حکمتِ عملی کا عملی طور پر آغاز ہو جائے، اور اس طرح ہند میں پہلی دفعہ باضابطہ ہندوستانی انتخابی نمایندہ اداروں کا قیام عمل میں آیا، اور رپن کے ہمدردانہ اصولِ حکومت کی تکمیل ہوئی، اور اس کے اس منصفانہ طرزِ عمل کی بنا پر اس کو اب تک ہندوستان کا بہی خواہ، اور ہندوستانی نمایندہ اداروں کا بانی سمجھا جاتا ہے۔

یہاں اس امر کا جان لینا بھی ضروری ہے کہ رپن کے عہد میں جب کہ حکومتِ خود اختیاری کے انتخابی اداروں کا قیام تمام ملک میں عمل میں آچکا تھا، ہندوستان میں ایک سکون اور عملی تجربات کا دور ہونا چاہیے تھا، لیکن، ایسا نہیں ہوا اسی عہد کی یہ بھی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ اہلِ ہند کو اتفاق سے اس امر کا موقع مل گیا کہ وہ بہ یک وقت حکومتِ ہند، حکومتِ برطانیہ اور انگریز قوم کے ہندوستان اور ہندوستانیوں سے متعلق جذبات اور خیالات کا صحیح صحیح اندازہ کر سکیں، چنانچہ البرٹ بل ہندوستانیوں کے نزدیک انگریزوں کے امتحان، و آزمائش کا ذریعہ بن گئی، اور اس کی کارگزاری ہندوستانی قوتِ محرکہ کو اس قدر ہیجان میں لائی کہ حکومتِ خود اختیاری کی پُرامن تجاویز کے باعث اہلِ ہند میں سکون و اطمینان پیدا ہونے کی بجائے البرٹ بل کی وجہ سے ان میں سیاسی بیداری کی ایک برقی رَو دوڑ گئی ——— اور وہ تمام نسلی اختلافات جو لٹن کے زمانے میں زور پکڑ رہے تھے پھر سے تازہ ہو گئے، اور جو چیز ہندوستانیوں میں صدیوں میں پیدا ہو سکتی تھی چند ہی سال کے

---

[1] سوانح عمری رپن صفحہ ۱۰۶ تا ۱۰۷۔

اندر اندر پیدا ہوگئی یہی وجہ ہے کہ ریّن کے آخری اور بعد کے عہد میں ہم اس قدر سرگرمی اور جوش پاتے ہیں جو ہندوستانی قومی تحریک کے نشو ونما ، اور ہندوستانی سیاسی مرکزی ادارے کے قیام کا ضامن ہے ، اور ایک جدید سیاسی فضا کے پیدا کرنے کا باعث ۔

خواجہ عیسیٰ احمد ام ، اے

"خدابندہ"
سے
تاناشاہ کی آخری گفتگو

(خدابندہ، گول کنڈے کے آخری تاجدار سلطان ابوالحسن تاناشاہ کا اکلوتا فرزند اور قطب شاہی خاندان کی آخری نشانی تھا۔ گول کنڈے کی فتح، اور سلطان ابوالحسن کے معزول، اور قید ہونے کے بعد شاہ زادے کو شہنشاہ اورنگ زیب اپنے ہمراہ دہلی لے گئے۔ تاریخیں اس امر کے بیان سے قاصر ہیں کہ اس کے بعد شاہ زادے کا کیا حال رہا، البتہ اتنا ذکر ملتا ہے کہ ایک مرتبہ دربارِ شاہی میں شاہ زادہ آیا تھا! اس کے آتے ہی تمام قدیم نمک خوارانِ قطب شاہی جو، اب عالم گیری دربار کے متوسل تھے، کھڑے ہوئے، اور غیر ارادی طور پر اس کی تعظیم بجالائے جس سے سارے دربار پر ایک حیرت سی طاری ہوگئی۔ "ادارت")

جو دنیا تھی ہماری، اب وہی دنیا ستائے گی
کلی بھی خار بن کر تیرا نازک دل دکھائے گی

غرض، سو سو طرح سے زندگانی آزمائے گی
فقط تقدیر، تیرے حال پر آنسو بہائے گی

ستم تو نے نہیں دیکھا، جفا تو نے نہیں دیکھی
ابھی بچہ ہے دنیا کی ہوا تو نے نہیں دیکھی

ان آنکھوں سے وطن والوں کا غم دیکھا نہیں جاتا
ستم ناآشناؤں پر ستم دیکھا نہیں جاتا

فلک کے کاکلوں کا پیچ و خم دیکھا نہیں جاتا
غلامی چھین لے ہم سے بھرم دیکھا نہیں جاتا

دیا تھا جس نے سکھ ہم کو اسے بیتا سناؤں گا
میں اپنی بے گناہی اپنے خالق کو دکھاؤں گا

مرے دل کی تمنا، ماہ پارے، جا رہا ہوں میں — نہ گھبرا، زندگانی کے سہارے جا رہا ہوں میں
خدا حافظ، مری آنکھوں کے تارے، جا رہا ہوں میں — خدا رکھے تجھے خوش، غم کے مارے جا رہا ہوں میں

جہنم سے اٹھا کر خلد میں آباد کرتی ہے
مجھے رنجِ اسیری سے اجل آزاد کرتی ہے

خزاں کے جور سے بوئے وفاداری نہ کھو دینا — ہجومِ یاس میں احساسِ غم خواری نہ کھو دینا
طلسمِ خواب کے دھوکے میں بیداری نہ کھو دینا — کہ، تو خوددار کا بیٹا ہے، خودداری نہ کھو دینا

مجھے ڈر ہے، نہ گھبرا جائے تو نازوں کا پالا ہے
خدا رکھے، تجھے تو "گول کنڈے" کا اُجالا ہے

جگا تقدیر کو پھر دولتِ بیدار پیدا کر — بہ اندازِ دگر، ہنگامۂ بازار پیدا کر
ارادے میں بلندی، ہاتھ میں تلوار پیدا کر — جو ممکن ہو تو خارستان میں گلزار پیدا کر

تجھے میری قسم شرمندۂ احساں نہ بن جانا
"خدا بندہ" خدارا بندۂ سلطاں نہ بن جانا

میکش

علم ہندسہ کی ابتدا[1]

یوں تو ابتدائی زمانے سے ہی انسانوں کو مشاہدہ اور غور و فکر کی عادت تھی، لیکن تمدن اور بالخصوص سائنس کا ارتقاء ہم کو صرف تاریخی زمانے میں ہی ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ علوم ریاضی میں بابلی، مصری، چینی، ہندوستانی، ایرانی، یونانی اور عرب قوموں نے قابلِ قدر کارنامے چھوڑے ہیں جن کا پتہ قدیم کتبوں، تصنیفوں اور تاریخوں سے چلتا ہے۔ اس موقع پر ہم علم ہندسہ کی تشکیل اور اس کے ارتقاء پر نظر ڈالیں گے۔

اہلِ بابل کو اگرچہ حساب (عددوں) اور علمِ ہیئت میں بہت کچھ معلومات حاصل ہوئیں، لیکن علم ہندسہ میں انھوں نے بہت کم انکشافات کیے۔ انھیں یہ معلوم تھا کہ ایک دایرے کے محیط کو اس کے نصف قطر کے مساوی وتروں کے ذریعے چھ مساوی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پیش گوئیوں میں وہ مثلثوں اور چار ضلعی شکلوں کو استعمال کرتے تھے۔ π کی قیمت عبرانیوں کی مانند وہ ۳ لیتے تھے۔ ہندسی ثبوتوں کا ان کے پاس نام و نشان بھی نہیں پایا جاتا۔ وہ مربع، مستطیل، قایم الزاویہ مثلث اور منحرف کا رقبہ نکالنے کے قاعدوں سے واقف تھے۔

تمام قدیم یونانی مصنفین کو اس بات کا اعتراف ہے کہ علومِ ریاضی کی تشکیل بڑی حد تک مصر میں ہوئی۔ بہ قول ارسطو کے مصر میں مقتدایانِ دین کو کافی فرصت تھی کہ وہ ان علوم کا مطالعہ کرتے۔ برٹش میوزیم میں جو مصری تحریریں پائی جاتی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ۳۴۰۰ ق م سے

---

[1] یہ مضمون مصنفین کی کتاب "نظری علمِ ہندسہ" سے اخذ کیا گیا ہے۔

پہلے بھی مصری حساب اور ہندسہ میں کافی ترقی کر چکے تھے۔ ہندسی عمل اور رقبوں کے دریافت کرنے کے طریقوں میں بہ زیادہ ماہر تھے۔ π کی قیمت $(\frac{16}{9})^2$ یا ۳٫۱۶۰۴۰۰۰ لی تھی۔ فیثاغورث کے مسئلے کی خاص صورت سے یعنے اس بات سے کہ مثلث قائمۃ الزاویہ ہوتا ہے جب کہ اس کے ضلعوں کے طول ۳، ۴، ۵ ہوں اہلِ مصر ۲۰۰۰ ق م سے پہلے ہی واقف تھے، لیکن ان کے علم ہندسہ میں بہ حیثیت سائنس کے دو بڑے نقائص تھے! اول تو یہ کہ انھوں نے علم ہندسہ کی منطقی اصول پر اس طرح ترتیب نہیں دی تھی کہ چند تعریفوں اور مفروضوں کی بنا پر پورے علم کی تشکیل کی جائے۔ ان کے اکثر قاعدے بالخصوص ہندسہ مجسمات میں ثابت ہی نہیں کیے گئے تھے بلکہ صرف مشاہدوں اور قیاس کی بنا پر مان لیے گئے تھے۔ ان کا دوسرا بڑا نقص یہ تھا کہ متعدد خاص صورتوں کو وہ ایک عام مسئلے کے تحت نہیں لا سکے، بلکہ ہر خاص صورت کے لیے علٰحدہ بحث کرنے کی ضرورت سمجھتے تھے۔ حساب اور ہندسہ میں ان کی معلومات کا اندازہ اہرام مصر کے جیسے عظیم الشان میناروں سے کیا جا سکتا ہے جو تقریباً ۳ ہزار برس قبل مسیح بنائے گئے تھے۔ مصر میں علم ہندسہ کے اس قدر جلد ترقی پانے کی ایک وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اکثر دریائے نیل کو طغیانی آتی تھی اور اس میں مختلف لوگوں کی زمینات بہہ جاتی تھیں، ان کو نئے سرے سے تقسیم کرنے کے لیے اس بات کے جاننے کی ضرورت تھی کہ مختلف لوگوں کی زمینوں کا رقبہ کس قدر تھا۔ اسی عملی ضرورت کے تحت علم ہندسہ کا ارتقا ہوا لیکن ان کی ساری معلومات صرف اس حد تک محدود تھیں جس حد تک ان کو عملی کاروبار میں ضرورت تھی۔

ساتویں صدی قبل مسیح کے قریب یونانیوں اور مصریوں کے درمیان تجارتی تعلقات کافی حد تک بڑھ چکے تھے، اور چونکہ علوم و فنون میں اس وقت اہلِ مصر یونانیوں سے کہیں زیادہ ماہر تھے اس لیے ہر وہ شخص جو ان علوم و فنون کو اچھی طرح سیکھنا چاہتا تھا مصر کے علما کی خدمت میں حاضر ہو جاتا بعینہٖ اسی طرح جیسے ایشیا اور افریقہ کے مختلف مقامات سے آج کل لوگ علوم و فنون سیکھنے کی خاطر یورپ اور امریکہ جایا کرتے ہیں۔

علم ہندسہ بھی یونانیوں نے اہلِ مصر سے سیکھا لیکن جیسا ہمیں معلوم ہے اس علم کو خود انھوں نے بعد میں اس قدر ترقی دی کہ اس کو معراج کمال پر پہنچا دیا۔

یونان کو علم ہندسہ سے روشناس کرانے کا سہرا حکیم طالیس (۶۴۰ تا ۵۵۰ ق م) کے

سیرہے۔ طالیس کو ایک زمانے تک مصر میں رہنے کا موقع ملا اور اس نے سائنس اور علوم ریاضی کی تحصیل میں اپنی تمام عمر گذار دی۔ کہا جاتا ہے کہ علم ہندسہ میں اس نے بہت سے اہم مسئلوں کا انکشاف کیا جن کی مدد سے وہ کنارۂ سمندر سے جہازوں کے فاصلے دریافت کرسکتا تھا۔ اس طرح طالیس نے خطوں کے نظری ہندسہ کی ایجاد کی۔ اس سے قبل مصریوں کی معلومات صرف سطحوں اور ہندسۂ مجسمات کے ابتدائی حصوں تک موقوف تھیں اور یہ معلومات بھی انھیں زیادہ تر تجربہ اور مشاہدے سے حاصل حاصل ہوئی تھیں، ان میں استدلال کا کچھ دخل نہیں تھا۔

طالیس کے بعد جس شخص نے علم ہندسہ میں معتد بہ اضافہ کیا وہ حکیم فیثاغورث تھا، جس کا زمانہ ۵۸۴ھ سے ۴۹۵ ق، م تک ہے اور جس نے مصر میں ایک عرصے تک قیام کرنے اور طالیس کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کے بعد سسلی میں اپنا ایک اسکول قایم کیا۔ اس میں ریاضی کو سائنس کے درجے تک پہنچا کر اس میں نظری استدلال کو داخل کیا گیا۔ فیثاغورث کا سب سے مشہور کارنامہ وہ مسئلہ ہے جس میں کسی مثلث قائمۃ الزاویہ کے وتر پر کے مربع کو بقیہ دو ضلعوں پر کے مربعوں کے مجموعے کے برابر ثابت کیا جاتا ہے جیساکہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے اس کی خاص صورت جب کہ مثلث کے ضلعوں کے طول ۳، ۴، ۵ ہوں خود اہل مصر کو بھی معلوم تھی۔ لیکن عام مسئلے کا انکشاف فیثاغورث نے ہی کیا، اگرچہ ابھی تک یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ فیثاغورث نے اس مسئلے کا ثبوت کس طرح دیا تھا۔ قدیم کتابوں میں جو ثبوت مروج ہے وہ اقلیدس کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے۔ اقلیدس نے فیثاغورث کے مسئلے کو اور زیادہ عام شکل میں بیان کیا ہے اور اس عام مسئلے سے ریاضیات طبعیات میں بہت فایدہ اٹھایا جاتا ہے۔

فیثاغورث کے شاگردوں نے یہ بھی ثابت کیا کہ کسی مثلث کے تین زاویوں کا مجموعہ دو قائمہ زاویوں کے برابر ہوتا ہے۔ انھوں نے منتظم کثیر ضلعی شکلوں اور مجسمات پر بھی کافی بحث کی۔ بہ قول فیثاغورث کے ان کا اعتقاد تھا کہ کرہ تمام مجسمات میں اور دایرہ تمام مستوی شکلوں میں سب سے زیادہ خوب صورت ہیں۔ فیثاغورث کے ایک شاگرد ارقیطاس (۴۲۸ء تا ۳۴۷ ق م) نے ہی سب سے پہلے علم ہندسہ کا استعمال علم حرکت میں کیا اور اس موضوع پر باضابطہ بحث کی۔ اس نے کسی دیئے ہوئے مکعب کے دو گنے حجم والے مکعب کو بنانے کا ایک بہت ہی

ایجھا عملی طریقہ بھی دریافت کیا تھا، لیکن عمل صرف پٹری، پرکار کی مدد سے نہیں کیا جاسکتا۔

فیثا غورث کے اسکول کے بعد ایتھنز میں ۴۸۰ ق م میں ایک اور اسکول قایم ہوا جس نے علم ہندسہ میں دایرے کی خاصیتوں سے زیادہ بحث کی۔ ان کے سارے انکشافات ذیل کے تین مشہور مسئلوں کو حل کرنے کی بے انتہا کوششوں کے دوران میں ہوئے:۔

۱۔ ایک قوس یا زاویے کو تین مساوی حصوں میں تقسیم کرنا۔

۲۔ "مکعب کو دوگنا کرنا" یعنے ایک ایسا مکعب بنانا جس کا حجم دوچند ہو۔

۳۔ "دایرے کی تربیع" یعنے ایک ایسی مربع یا کوئی مستقیم الاضلاع شکل معلوم کرنا جس کا رقبہ دایرئے کے رقبے کے بالکل مساوی ہو۔

زمانہ قدیم سے اب تک ریاضیات کے کسی اور مسئلے کے متعلق اس قدر تحقیقات نہیں ہوئیں جتنی کہ ان تین مسئلوں کے حل کرنے میں صرف کردیں۔ اب باضابطہ طور پر ثابت ہوچکا ہے کہ محض پٹری اور پرکار کی مدد سے ان مسئلوں کا حل کرنا قطعی ناممکن ہے۔

مسایل ۲، ۳ (دوگنا کرنا اور تربیع) کی تحقیقات کے ضمن میں ہپوکراٹیس ۴۳۰ ق م کے قریب دایروں کے ہندسے میں بہت کچھ اضافہ کیا۔ اور اس علم میں منطقی طرز استدلال کو رایج کرنے میں بھی اس نے بہت مدد دی۔ اس کے علاوہ متشابہ شکلوں اور تناسب کے نظریوں پر بھی اس نے کافی بحث کی۔ ہندسی شکلوں کے بیان کرنے کے لیے فیثاغورث کے اسکول کی متابعت میں اس نے حروف کا استعمال رایج کیا۔

افلاطون، ایتھنز میں ۴۲۹ ق م میں پیدا ہوا، اور ۳۴۸ ق م میں وفات پائی۔ یہ سقراط کا شاگرد اور دوست تھا، لیکن ریاضی سے دلچسپی اس کو مصر اور سسلی میں ہوئی۔ سفر سے ۳۸۹ ق م میں ایتھنز واپس ہوکر اس نے اپنی اکاڈمی کی بنیاد ڈالی اور بقیہ عمر تعلیم اور تصنیف میں صرف کردی۔ اس کا اعتقاد تھا کہ دنیا کا راز علم حساب اور علم ہندسہ میں مضمر ہے، اور یہ کہ خالقِ عالم کا دائمی مشغلہ بھی علم ہندسہ ہی ہے۔ اسی لیے افلاطون کے نزدیک فلسفے کی تعلیم سے پہلے علم ہندسہ سے واقفیت نہایت ضروری ہے۔ یہ بتلانے کے لیے کہ ریاضی کی کس قدر زیادہ اہمیت ہے اور غور و تفکر کے لیے یہ کس قدر ضروری ہے اس نے اپنی اکاڈمی کے

دروازے پر یہ کتبہ لگا دیا تھا کہ "جسے علم ہندسہ سے واقفیت نہیں ہے وہ یہاں داخل نہ ہو"
کوئی تعجب نہیں کہ اگر افلاطون کے اسکول سے کثیر تعداد میں ریاضی داں پیدا ہوئے ہوں۔

اگرچہ افلاطون نے کوئی اہم مسئلے نہیں دریافت کیے لیکن استدلال اور ثبوت دینے کے طریقوں میں اس نے بہت کچھ اصلاح کی اور بتایا کہ علم ہندسہ میں مفروضوں اور طریقوں کو صاف طور پر پہلے ہی بیان کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ نقطہ، خط، سطح وغیرہ کی جو تعریفیں اقلیدس میں دی گئی تھیں اور جو آج تک رایج ہیں افلاطون کی بیان کی ہوئی ہیں۔

افلاطون اور اس کے شاگردوں کا سب سے بڑا کارنامہ تحلیلی ثبوت کا طریقہ ہے اس طریقے کا استعمال یوں کیا جاتا ہے کہ جو چیز ثابت کرنی ہوتی ہے اس کو پہلے مان لیا جاتا ہے اور پھر اس کی بنا پر استدلال کرتے ہوئے ایک ایسے مسئلے تک پہنچتے ہیں جس کو پہلے ثابت کر دیا گیا ہو۔ اس کے برخلاف ثبوت کا ترکیبی طریقہ وہ ہے جس میں راست معطیات پر بحث کرتے ہوئے ہم مطلوبہ مسئلے تک پہنچتے ہیں۔ تحلیلی طریقے کو زیادہ تر عملی مسایل میں استعمال کیا جاتا ہے کسی مطلوبہ عمل کو دریافت کرنے کے لیے ہم مان لیتے ہیں کہ ایسا عمل کسی طرح کر لیا گیا اور پھر دیکھتے ہیں کہ اس سے کیا نتیجے حاصل ہوتے ہیں۔ ان نتیجوں کی بنا پر ہم مطلوبہ عمل معلوم کر لیتے ہیں اور اب الٹا عمل کرکے دیئے ہوئے نتیجے تک پہنچتے ہیں۔

اس زمانے کا سب سے زیادہ قابل ریاضی داں یوڈاکسس ہے جو ۴۰۸ق،م میں پیدا ہوا، اور ۳۵۵ق،م میں وفات پائی۔ اس نے ارقیطاس کی اور چند مہینوں تک افلاطون کی شاگردی کی اور علوم ریاضی کے طریقوں سے حقیقی واقفیت حاصل کی۔ اس نے مستوی علم ہندسہ میں کئی عام مسئلوں کا اضافہ کیا اور اکثر مورخین کی یہ رائے ہے کہ اقلیدس کے پانچویں مقالے کے تمام مسئلے جو تناسب سے متعلق ہیں اسی کے دریافت کیے ہوئے ہیں۔ ہندسۂ مجسمات میں بھی اس نے بہت سے مسئلوں کو حل کیا۔

اقلیدس: اقلیدس ۳۶۵ق،م میں پیدا ہوا تھا۔ عمر میں یہ افلاطون سے چھوٹا اور ارشمیدس سے بڑا تھا۔ ارشمیدس نے اپنی تصنیفات میں اس کا ذکر کیا ہے۔

۳۳۸ق،م میں فلپ شاہ مقدونیہ نے ایتھنز والوں کو شکست دی۔ اس کی وفات کے بعد

سکندرِ اعظم نے مصر کے ساحل پر شہر سکندریہ کی بنیاد ڈالی جو چند دنوں میں تہذیب و تمدن کا عظیم الشان مرکز بن گیا۔ بطلیموس نے جو سکندریہ کا حکمران تھا ایتھنز سے حکیم اقلیدس کو بلا بھیجا تاکہ وہ سکندریہ میں علومِ ریاضی کا اسکول قایم کرے۔

اقلیدس نے ۳۳۰ اور ۳۲۰ ق م کے درمیان اپنے مقالات تصنیف کیے۔ ان مقالات میں اقلیدس نے اپنے پیشرو علما کے دریافت کردہ مسئلوں کو باضابطہ طور پر منظم کیا اور ان کی ایسی ترتیب دی جو دو ہزار سے زیادہ برس تک بالکل مکمل سمجھی گئی۔ اس ترتیب و تنظیم کے علاوہ بعض مسئلوں کا ثبوت مثلاً فیثاغورث کے مسئلے کا ثبوت بھی اس نے مہیا کیا۔ گذشتہ صدی کے اواخر تک سائنس کی تعلیم کی ابتدا کرنے کے لیے اقلیدس کے مقالات موزوں ترین سمجھے جاتے تھے۔ جدید ریاضی میں اقلیدس کے طریقے کو چھوڑا نہیں گیا بلکہ اس کو زیادہ مکمل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہمیں یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ بعض مقامات پر مبتدیوں کو علم ہندسہ بغیر ثبوت کے صرف عملی طور پر پڑھایا جاتا ہے جس سے سائنس کے مطالعے کی اصلی غرض فوت ہو جاتی ہے۔ اگر فوری افادیت ہی کسی مضمون کے مطالعہ کرنے یا نہ کرنے کا معیار ہو تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ عملی ہندسے کا بھی کیا فایدہ ہے اور آیندہ زندگی میں طالب علم کو ایسا دایرہ بنانے کی کب ضرورت ہوتی ہے جو دو دیئے ہوئے خطوں کو مس کرے اور ایک دیئے ہوئے نقطے میں سے گذرے۔

غرض چند تعریفوں اور مفروضات کی بنا پر اقلیدس نے علم ہندسہ کی عظیم الشان عمارت کھڑی کی اور اس کو (۱۳) حصوں میں تقسیم کیا جن کو "مقالات" کہتے ہیں۔ ان میں سے پہلے چار مقالات میں مستوی شکلوں پر بحث کی گئی ہے۔ پانچویں مقالے میں تناسب کے نظریئے کو عام مقادیر پر استعمال کیا گیا ہے۔ چھٹے مقالے میں متشابہ شکلوں کا ذکر ہے۔ ساتویں، آٹھویں اور نویں مقالوں میں عددوں کا نظریہ بیان کیا گیا ہے۔ دسویں مقالے میں متبائن اور غیر منطق عددوں کی بحث ہے اور موجودہ علما کی نظروں میں یہ دسواں مقالہ اقلیدس کی بہترین تصنیف ہے۔ گیارھویں، بارھویں اور تیرھویں مقالوں میں مخروط، منشور، اسطوانہ وغیرہ اور منتظم مجسمات سے بحث کی گئی ہے۔

ہائپسی کلز اور ایک نامعلوم ریاضی داں نے اقلیدس کے تیرہ مقالوں پر دو اور مقالوں کا اضافہ کیا جس میں ہندسۂ مجسمات سے بحث کی گئی ہے۔

اقلیدس کے بعد حکیم ارشمیدس (۲۸۷ ق م تا ۲۱۲ ق م) نے جو زمانۂ قدیم کا سب سے بڑا ریاضی داں تھا، اور اپالونیس، بطلیموس وغیرہ نے مخروطیوں اور دوسرے منحنیوں کو دریافت کیا اور مستوی شکلوں اور مجسمات دونوں کے ہندسہ کو کافی ترقی دی۔ علم ہندسہ میں یونانیوں کے کارنامہ کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ڈے کارٹ کے زمانے یعنے سترھویں صدی عیسوی تک اس میں بہت کم اضافہ کیا گیا۔ البتہ عربوں نے یونانیوں کی تصنیفات کا ترجمہ کیا اور ان کی شرح وغیرہ کے ذریعے معلومات کے اس گراں قیمت ذخیرے کو تلف ہو جانے سے بچا لیا۔

خلیفہ المنصور اور خلیفہ المامون نے بازنطینی شہنشاہ کے پاس سے منجملہ دیگر یونانی کتابوں کے اقلیدس کے مقالوں کی نقلیں بھی حاصل کیں۔ خلیفہ ہارون الرشید کے عہدِ حکومت میں یحیٰی برمکی کے حکم سے حجاج بن یوسف نے یونانی سے عربی میں اقلیدس کے مقالوں کا ترجمہ کیا۔ یہ اقلیدس کے مقالوں کا سب سے پہلا عربی ترجمہ ہے۔ اس کے بعد جب مامون الرشید خلیفہ ہوا تو حجاج نے اپنی پہلی کتاب کے غیر اہم حصوں کو مختصر کر کے ضروری تصحیحات کے بعد اس کو مامون الرشید کی خدمت میں پیش کیا۔

اقلیدس کے مقالوں کا دوسرا عربی ترجمہ اسحٰق بن حنین نے کیا اور اسحٰق کے ایما سے اس ترجمہ کی نظر ثانی ثابت بن قرہ نے کی۔ اسحٰق کے ترجمہ کی نظر ثانی کے لیے ثابت بن قرہ نے اقلیدس کے مقالوں کے یونانی قلمی نسخوں سے استفادہ کیا۔

اس کے بعد تیرھویں صدی عیسوی میں اقلیدس کے مقالوں کو عربی میں دو کتابوں کی شکل میں ناصر الدین طوسی نے لکھا۔ پہلی کتاب زیادہ ضخیم ہے اور اس کا ایک مکمل نسخہ صرف فلارنس کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ دوسری کتاب مختصر ہے اور پندرہ مقالوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے قلمی نسخے انڈیا آفس، برٹش میوزیم اور یورپ کے کئی بڑے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ اس کتاب کے پہلے چھ مقالے ۱۸۲۴ء میں کلکتہ میں شایع کیے گئے۔ ناصر الدین کی یہ کتابیں یونانی کتابوں کا ترجمہ نہیں ہیں بلکہ اس کے پہلے کے عربی ترجموں کی مدد سے مکرر لکھے ہوئے مقالے ہیں۔

یورپی زبانوں میں اقلیدس کے مقالوں کا سب سے پہلا ترجمہ آدے لَھرڈ نامی ایک انگریز نے عربی سے لاطینی میں ۱۱۲۰ء میں کیا۔ اس کے بعد گیرارڈ (۱۱۱۴ تا ۱۱۸۴ء) نے عربی سے اقلیدس کے ۱۵ مقالوں کا ترجمہ لاطینی میں کیا۔ یہ ترجمہ آدے لَھرڈ کے ترجمہ پر مبنی نہیں ہے، بلکہ راست ثابت بن قرہ کی کتاب سے کیا گیا ہے۔ گیرارڈ نے اقلیدس کے مقالوں کے علاوہ اقلیدس اور دیگر یونانی ریاضی دانوں کی تصانیف کے عربی ترجموں کی مدد سے لاطینی ترجمے کئے اور ان ترجموں کے ذریعے یورپ میں ریاضی اور ہیئت کی اشاعت ہوئی۔

انگریزی زبان میں اقلیدس کے مقالوں کا سب سے پہلا ترجمہ ۱۵۷۰ء میں ہنری بائی لنگس لے نے کیا۔ یہ ترجمہ ۹۲۸ صفحوں پر مشتمل تھا۔ ۱۶۶۰ء تا ۱۷۳۰ء کے زمانے میں بیارو ہالی والس اور نیوٹن نے انگلستان میں یونانی ریاضیات کے مطالعہ کا ذوق پھیلایا۔ ۱۷۵۶ء میں رابرٹ سائمن نے لاطینی اور انگریزی میں اقلیدس کے مقالے شایع کئے اور اس تاریخ سے انیسویں صدی کے ختم تک اقلیدس کے مقالے درسی کتاب کے طور پر انگلستان میں استعمال ہوتے رہے۔

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی و خواجہ محی الدین ایم اے

تازیانہ

روایت ہے کسی اُلّو نے چاہا
کرے شاہیں سے پیدا دوستانہ

لگا کہنے کہ اُے شہکارِ قدرت!
ہے تیری گفتگو پیغمبرانہ

طبیعت تیغِ جوہردار تیری
تری صورت کمالوں کا خزانہ

سدا تیری جلو میں کامرانی
خطا ہوتا نہیں تیرا نشانہ

فلک پیمائیاں تیری مسلّم
تری ہمّت کا قائل ہے زمانہ

کہاں تک خوبیاں کوئی گِنائے
تری ہر اک ادا ہے دلبرانہ

مجھے تو کیا سمجھتا ہے بتا دے
ترا ذوقِ نظر ہے عارفانہ"

ابھی تک دل میں شاہیں کہہ رہا تھا
ہیں اس اُلّو کی چالیں شاطرانہ

کہا ہنس کر "زمانہ ساز ہے تو!
تری یہ چاپلوسی ابلہانہ

اثر دکھلا نہیں سکتی ہے مجھ پر سمجھتا ہوں تجھے دزدِ شبانہ
پڑی ہیں ہر طرف کیڑوں کی لاشیں ہے قبرستان تیرا آشیانہ
حقیقت ہیں سمجھتے ہیں حقیقت یہاں بے کار ہے حیلہ بہانہ
خوشامد سے کہیں رُکتا ہے ناداں! زبانِ اہلِ حق کا تازیانہ
غلط ڈالی یہ پھینکا جال تو نے بہت اونچا ہے میرا آشیانہ
کسی احمق پہ ڈال اپنی کمندیں!" یہ کہہ کر ہو گیا شاہیں روانہ

زمانہ روز دُہراتا رہے گا
جہاں میں بُوم و شاہیں کا فسانہ

سید سکندر علی وجد بی اے، ایچ سی ایس

تنقید و تبصرہ

ہندی اردو لغت تصنیف راجہ راجیشور راؤ صاحب اصغر والیٔ سمستان دوم کنندہ قیمت جلد ہے ۸ روپیہ
ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ، عابد روڈ حیدر آباد دکن۔

راجہ راجیشور راؤ صاحب کا نام علمی و ادبی دُنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ انھیں عربی، فارسی، اُردو اور سنسکرت زبانوں سے مسلسل ذوق رہا ہے اور وہ ان زبانوں کے تحقیقی مطالعہ میں عرصہ دراز سے مشغول ہیں۔ اور ان کی متعدد تصانیف چھپ کر مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ فارسیِ جدید کا لغت تو ایک سے زیادہ مرتبہ چھپ چکا ہے اور عام طور پر کالجوں اور مدرسوں کے طلبہ کے لیے جدید فارسی کے مطالعے میں بہت ہی مفید ثابت ہوا ہے۔ حال ہی میں ان کی ایک اور دلچسپ کتاب "نغمۂ عنادل" کے نام سے شایع ہوئی ہے جو چار سو سے زاید اُردو شاعروں کے کلام کا انتخاب ہے اور جس میں ادبی، علمی، تمدنی، اخلاقی، ملکی اور قومی، ہر قسم کے اشعار الگ الگ عنوانوں کے تحت چُن کر پیش کیے گئے ہیں۔ اب راجہ صاحب نے اپنی کئی سالہ کوشش کا ثمرۂ دلکش لغاتِ ہندی کی شکل میں پیش کیا ہے۔ یہ ایک عصری ضرورت تھی جس کی راجہ صاحب نے بڑی خوش اسلوبی سے تکمیل کی ہے۔ اُردو زبان میں سنسکرتی اور پراکرتی الفاظ کا جو ذخیرہ پہلے سے شامل ہے اور جو آئے دن شریک ہوتا جا رہا ہے، وہ آج تک اس طرح صحت اور احتیاط کے ساتھ کسی نے مدون نہیں کیا۔ تلفظ کی صحت کے لیے ہر لفظ پر بہت اہتمام سے اعراب لگائے گئے ہیں اور ہر لفظ کے معنے اور مفہوم کے بیان کرنے میں کافی تحقیق سے کام لیا گیا ہے۔ اُردو دانوں کے لیے یہ کتاب نہایت مفید ثابت ہوگی اور یقیناً قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھی جائے گی۔

خطبات صدارت | ناشر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، قیمت عہ، ملنے کا پتہ دفتر ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جس کو سر سید نے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے کے لیے قایم کیا تھا، اس زمانے سے برابر قایم اور کارگزار رہے اس نے عام طور پر ہندوستان اور خاص طور سے مسلمانانِ ہند کی تعلیمی ترقی کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ کبھی فراموش نہیں کی جا سکتیں گزشتہ سال اس نے اپنا جشن زریں (گولڈن جوبلی) منایا تھا اس موقع پر جو اجلاس ہوئے وہ حسب ذیل (۱۱) شعبوں پر مشتمل تھے: (۱) معاشیات و اصلاح معاشرت (۲) تعلیم نسواں (۳) ابتدائی تعلیم اور مدارس اردو (۴) اعلیٰ تعلیم (۵) اردو پریس (۶) اسلامی علوم و فنون (۷) مدارس اسلامیہ (۸) خواندگی و تعلیم بالغان (۹) زبان اردو (۱۰) صنعتی تعلیم (۱۱) ثانوی تعلیم۔ ہر شعبے کی صدارت کے لیے ملک کے مختلف ماہرین اور علما میں سے ایک موزوں شخصیت کا انتخاب کیا گیا تھا خطبات صدارت انھی شعبہ واری صدروں کے خطبوں کا مجموعہ ہے جس میں فکر و نظر کے لیے دعوتِ عام ہے مختلف صدروں نے اپنے دیرینہ تجربوں اور اعلیٰ قابلیتوں کے مدنظر جن بیش بہا خیالات کا اظہار کیا ہے اُن کو عام کرنے اور خاص و عام کو ان کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت تھی۔ کانفرنس کے فاضل معتمد نواب صدر یار جنگ بہادر نے ان سب خطبات کو ایک ساتھ شایع کر کے بہترین تعلیمی خیالات کو بہ یک وقت پیش فرمایا ہے ان کا مطالعہ ان تمام اصحاب کے لیے مفید ہوگا جن کو تعلیم اور اس کے گوناگوں ضمنی مسایل سے دلچسپی ہے۔

ہندوستان کا نیا دستور حکومت | مولفہ پنڈت کشن پرشاد صاحب کول۔ ناشر ہندستانی اکاڈیمی الہ آباد۔

اُردو زبان میں ہندوستان کے نئے دستور حکومت پر چند کتابیں شایع ہو چکی ہیں، لیکن یہ موضوع ابھی متعدد تالیفات کا مستحق ہے۔ پنڈت جی نے پیش نظر کتاب میں اختصار، مگر جامعیت کے ساتھ دستور جدید کے دونوں شعبوں صوبجاتی خود مختاری اور وفاقی حکومت پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کا طرز بیان اور انداز تفہیم بھی بہت صاف اور دلچسپ ہے۔ جدید دستور سے جو اہم مسائل مالیات، تجارتی تعلقات، پبلک سروس، وفاقی عدالت، ریلوے اور ریزرو بنک وغیرہ کے متعلق پیدا ہوتے ہیں ان کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ بہر حال کتاب لایق مطالعہ ہے اور اس کے پڑھنے سے نہ صرف دستور جدید کا خاکہ ذہن نشین ہو جاتا ہے بلکہ عہد بہ عہد کی تبدیلیاں اور ترقیاں بھی معلوم ہوتی ہیں۔

س م

باب ششم

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی خارجی حکمت عملی

سلطنت بہمنیہ کے بیرونی حالات کے تذکرے میں لکھا جا چکا ہے کہ یہ سلطنت کئی مخالف سلطنتوں سے گھری ہوئی تھی جو ہمیشہ اس تاک میں رہتی تھیں کہ اگر موقعہ ملے تو اس کا خاتمہ کر ڈالیں سلطنت بہمنیہ ہی کی کوئی خصوصیت نہیں بلکہ دنیا میں ہمیشہ یہی ہوتا آیا ہے کہ جہاں کوئی سلطنت کمزور ہوئی وہاں قریب کی سلطنتوں نے اس پر حملہ کر دیا اور فتح کر کے اس کے علاقے کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔

سلطنت بہمنیہ کے دو جانی دشمن سلطنتیں تلنگانہ اور بیجانگر تھیں جو ہمیشہ اس کو طرح طرح کی تکلیفیں دیا کرتی تھیں انھیں کی وجہ سے اس کو ہمیشہ بر سر پیکار رہنا پڑتا تھا۔ ان میں سے سلطنت تلنگانہ کا خاتمہ کر کے اس کا الحاق آپ نے اپنی سلطنت سے کر لیا اور سلطنت بیجانگر کو کئی جنگوں میں شکست دے کر اپنا باجگذار بنالیا اور اس کی طاقت کا خاتمہ کر دیا تھا لیکن پھر بھی وہ ہمیشہ اس تاک میں لگی رہتی تھی کہ جیسے ہی موقع ملے اس کو نیست و نابود کر دے اس لیے اس سے سلطنت بہمنیہ کو ہمیشہ خوف لگا رہتا تھا اس کے علاوہ مشرق میں رایان اڑیسہ تھے جو سلطنت بہمنیہ کا نام و نشان مٹانے پر آمادہ نظر آتے تھے لیکن ایک بڑی حد تک حکمت عملی سے آپ نے اُن کا بھی زور توڑ دیا تھا جس کی وجہ سے آپ کی سلطنت کے لیے ان کا وجود کوئی زیادہ خطرناک نہ تھا ان کے علاوہ اور کئی چھوٹی چھوٹی ہندو ریاستیں تھیں جن سے آپ کی سلطنت گھری ہوئی تھی ان میں سے بعض کا تو آپ نے خاتمہ کر کے اپنی سلطنت سے الحاق کر لیا اور باقی کو اپنا باجگذار بنالیا تھا۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی حکمت عملی

ان غیر مسلم ریاستوں کے علاوہ آپ کی سلطنت کے جانی دشمن شمال میں سلاطین مالوہ وخاندیس تھے۔ مغرب میں سلاطین گجرات تھے جو ہمیشہ دندان آز تیز کیے ہوئے رہتے تھے۔ یہ تینوں مسلمانوں کی حکومتیں تھیں۔ ان میں سے مالوہ اور گجرات کے حکمرانوں کے ساتھ آپ کی جنگیں ہوئی تھیں جن میں کئی مسلمان مارے گئے تھے، جن کا آپ کو بہت افسوس تھا۔ ایک مرتبہ تو آپ نے خود گجرات اور مالوہ پر فوج کشی کی لیکن بغیر جنگ کیے صلح کر کے اپنی فوجوں کے ساتھ واپس اپنے دارالسلطنت کو تشریف لائے۔ آپ کو خدا نے ایسا رحم دل بنایا تھا کہ آپ کبھی جنگ میں سبقت نہیں کرتے تھے، اور لڑ کر بندگان خدا کا خون بہانا گناہ خیال کرتے تھے۔ جب کبھی جنگ کے لیے تشریف لے جاتے تو کوشش یہ کرتے تھے کہ صلح ہو جائے۔ اگر صلح نہ ہوتی تو مجبوراً جنگ پر آمادہ ہوتے تھے۔ سنہ ۸۳۵ھ م سنہ ۱۴۳۱ء میں گجرات کے مقابلے میں آپ اپنی فوجوں کو تقریباً ایک سال تک روزانہ آراستہ کیا کرتے تھے لیکن لڑنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ یہاں تک کہ صلح ہوئی اور آپ اپنی سلطنت کو واپس تشریف لے گئے۔

آپ کے فوجی کارنامے عدیم المثال ہیں، آپ کا تدبر اور سیاست دانی ایسی تھی کہ آپ دوسری سلطنتوں کو سر اٹھانے نہ دیتے تھے جن کی کئی مثالیں گذشتہ ابواب میں ملتی ہیں۔ اور انھی کی بدولت آپ نے سلطنت بہمنیہ کو وہ استحکام بخشا کہ وہ آپ کے بعد بھی ایک زمانے تک قایم رہی۔ فیروز شاہ بہمنی کی وفات کے بعد آپ کی بجائے اگر کوئی دوسرا کم زور دل ودماغ کا بادشاہ ہوتا تو اس کے لیے ان حالات میں سلطنت کا سنبھالنا سخت مشکل تھا، مگر یہ تو صرف آپ ہی کی سیاست دانی تھی جس کی بدولت سلطنت بہمنیہ کا قیام ایک مدت تک دکن میں برقرار رہا۔

آپ ایک دوراندیش بادشاہ تھے۔ یہ جانتے تھے کہ اسی وقت سلطنت کو فروغ ہو سکتا ہے جب کہ دوسری سلطنتوں سے ربط واتحاد ہو۔ اس کے علاوہ آپ تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایک سمجھتے تھے اور آپ کا منشا یہ تھا کہ تمام اسلامی سلطنتوں کے آپس میں دوستانہ تعلقات قایم رہیں اور ایک کو دوسرے کے ساتھ جیسا کہ اخوت اسلامی کا مقصد ہے ہمدردی ہو تاکہ غیر مسلم ریاستیں مسلم ریاستوں پر حملہ کرنے کی جراءت نہ کر سکیں۔ اسی جذبۂ اخوتِ اسلامی کے تحت آپ نے مناسب خیال فرمایا کہ نصیر خاں فاروقی والی (اسیر وبرہان پور) خاندیس سے قرابت کا سلسلہ پیدا کیا جائے۔ فرشتے کا بیان ہے کہ آپ کو یہ خیال فتح مالوہ اور پایۂ تخت کے گلبرگہ سے بیدر میں منتقل

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی حکمت عملی

کرنے کے بعد پیدا ہوا۔ اور برہان مآثر کے مولف نے لکھا ہے کہ بیدر کو پایہ تخت بنانے کے سال کے آخر میں آپ کو یہ خیال پیدا ہوا۔ غرض دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ یہ رشتہ تبدیلیٔ پایہ تخت کے بعد یعنی ۸۲۶ھ م ۱۴۲۳ء[1] میں بیدر میں آنے کے بعد قایم ہوا تھا۔

برہان مآثر کے مولف نے اس حاکم خاندیس کا نام مبارک خاں فاروقی والیٔ اسیر و برہان پور لکھا ہے، اور فرشتے نے نصیر خاں فاروقی والیٔ اسیر و برہان پور بیان کیا ہے۔ برہانِ مآثر کی روایت غلط، اور فرشتے کی صحیح معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ مبارک خاں فاروقی کا دوران حکومت ۸۴۴ھ م ۱۴۴۱ء سے ۸۶۱ھ م ۱۴۵۷ء تک ہے اور یہ نصیر خاں کا پوتا ہے۔ خاندیس کے جو حالات فرشتے نے لکھے ہیں ان سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ آپ کا اور آپ کے ولی عہد علاء الدین کا ہم عصر حاکم خاندیس نصیر خاں فاروقی ہی تھا۔ اور اسی کی بیٹی زینب سے آپ نے سلطان علاء الدین کی شادی کی تھی جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

آپ نے اپنے ایک مقرب درباری مسمی عزیز خاں کے ذریعے اپنے ولی عہد علاء الدین کے واسطے نصیر خاں فاروقی کی لڑکی سے نسبت کرنی چاہی۔ نصیر خاں فاروقی کو شاہان گجرات سے خوف لگا ہوا تھا کہ کہیں خاندیس اُس کے ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ اس نے بھی اس پیغام کو بہ مصالح ملکی بہتر سمجھ کر فوراً منظور کر لیا۔ اس نے اپنے پایہ تخت میں جشن عروسی منعقد کروایا اور کئی روز تک دعوتوں کا سلسلہ جاری رکھا اور رقص و سرود کے جلسے منعقد کرواتا رہا، اور ۸۲۶ھ م ۱۴۲۳ء کے آخر میں شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ اپنی بیٹی کو بیدر روانہ کیا۔

آپ نے دلہن کو بیرون شہر بیدر ایک باغ میں اُتارا اور شہر میں آئینہ بندی کا حکم دے کر خوب آراستہ کرایا، اور دو مہینے تک شادی کے جشن رچائے گئے، جس میں بے دریغ روپیہ خیر خیرات، انعام و اکرام، رقص و سرود کے جلسوں اور دعوتوں میں صرف کیا گیا، اور نہایت تزک و احتشام شاہانہ کے ساتھ نجومیوں کی مقرر کردہ نیک ساعت میں شہزادے کا

لہ برہان مآثر آپ کے زمانے کے سکوں سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ تبدیلیٔ پایہ تخت اس سال ہوئی تھی جس کی تفصیل تبدیلی پایہ تخت کے بیان میں لکھی گئی ہے۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی حکمت عملی

عقد کیا گیا اور نہایت دھوم دھام کے ساتھ برات کو اندرون شہر لایا گیا۔

اس شادی کی وجہ سے سلطنت بہمنیہ اور سلطنت خاندیس میں اتحاد قایم ہوگیا۔ اور یہ اتحاد آپ کے زمانے میں نہایت مفید ثابت ہوا۔ گو بعد میں یہ زیادہ عرصے تک برقرار نہ رہ سکا۔

۸۳۳ھ م ۱۴۲۹ء اور ۸۳۴ھ م ۱۴۳۰ء میں سلطنت بہمنیہ کو سلطنت گجرات کے مقابلے میں شکست ہوئی، اس خبر کو سن کر آپ نے خود ۸۳۵ھ م ۱۴۳۱ء میں فوج جمع کرکے گجرات کی طرف روانہ ہوکر قلعہ بھول کا محاصرہ کیا۔ اس کو سن کر سلطان احمد گجراتی بھی بڑی عظمت وشان کے ساتھ حریف سے مقابلہ کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ آپ نے محاصرے سے ہاتھ اٹھایا اور دشمن کی طرف آگے بڑھے۔ دونوں فرمانروا ایک دوسرے کے مقابلے میں تقریباً ایک سال تک ٹھیرے رہے اور ان میں سے کسی نے بھی جنگ پر سبقت نہیں کی یہاں تک کہ دونوں طرف کے علما وفضلا درمیان میں آئے اور انھوں نے اپنے وعظ وپند سے دونوں کی آتش غضب کو ٹھنڈا کیا اور صلح کرادی، جس کی رو سے قلعہ بھول گجرات کے تحت رہا اور آپ کا علاقہ آپ کے قبضے میں۔ اس کے چند روز بعد دونوں بادشاہوں میں تحریری معاہدۂ صلح ہوکر جھگڑے اور دشمنی کا خاتمہ ہوا۔ جس کی رو سے یہ طے پایا کہ وہ ملک وملت کے دشمنوں کے دفع کرنے میں ایک دوسرے کے مددومعاون رہیں گے اور اسلام کے جھنڈے کو بلند کرنے میں اپنی طرف سے کبھی کوتاہی نہ کریں گے۔ دونوں مسلمان بادشاہوں نے شرایط صلح پر راضی ہوکر ایک دوسرے کو کئی تحفے اور ہدیے بھیجے اور تقریباً سو سال تک دونوں میں رابطۂ اتحاد ومحبت قایم رہا۔

ہوشنگ شاہ والی مالوہ کو ۸۳۲ھ م ۱۴۲۹ء کی جنگ میں شکست ہوئی تھی، وہ اس کا بدلہ لینے کے لیے پھر ۸۳۷ھ م ۱۴۳۳ء میں حملہ آور ہوا لیکن آپ میں اور ہوشنگ شاہ میں صلح ہوگئی جس کی رو سے اس کا علاقہ اسی کے تحت رہا اور دوستی اور موافقت کے عہدوپیمان ہوئے جو گجرات کے جیسے مستحکم ثابت نہ ہوئے کیوں کہ وہ ان کی اولاد کے زمانے میں

مخالفت و مخاصمت میں مبدّل ہو گئے۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی حکمتِ

اس حکمت عملی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت بہمنیہ کا رقبہ وسیع اور اس کا وجود مستحکم ہو گیا۔ اس کے بعد سے سلطنت کو ان بیرونی سلطنتوں کے حملوں کا خوف نہ رہا اور قرب و جوار کی سلطنتیں آپ کو حامیٔ دین سمجھنے لگیں۔ آپ نے اپنی اسی حکمتِ عملی کے تحت اسلامی ممالک سے نامی گرامی شعرا، علما، فضلا، اہلِ فنون و کمال، صوفیائے کرام اور مشائخ عظام کو اپنے دارالسلطنت میں طلب کیا اور انھیں نہایت فیاضی کے ساتھ انعام و اکرام سے سرفراز فرمایا۔

غرض کہ آپ کی حکمت عملی سلطنت بہمنیہ کے لیے آپ کے زمانے میں مفید ثابت ہوئی، اس کی وجہ سے آپ کو گجرات، مالوہ اور خاندیس کی طرف سے اطمینان ہو گیا اور آپ ملکی اصلاحات کر سکے، اور اندرونی فتنہ و فساد کی بیخ کنی کر کے ملک میں امن قائم کیا۔

باب ہفتم

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی سیرت

آپ میں درحقیقت وہ تمام خصلتیں مجتمع تھیں جو ایک پاک باز اور دین دار بادشاہ میں ہونی چاہئیں۔ علم و ہنر، تدبر، دانائی، فہم و فراست، عزم و ثبات، فیاضی، شجاعت اور بلند حوصلگی میں آپ سلاطین بہمنیہ میں ایک ممتاز بادشاہ تھے۔ شاہانہ شان و شوکت اور علم و ہنر کی سرپرستی نے آپ کی شہرت کو اور بھی چمکا دیا تھا۔ آپ کی قدردانی کی ندائے عالم نے دلوں میں وہ شوق اور حوصلے پیدا کر دیئے کہ زمانے کے تمام اہلِ کمال دربار میں کھنچ آئے اور بیدر علوم و فنون کا مرکز اور رشک فارس و عراق بن گیا۔ بہمن نامہ اور منہل الصافی شرح وافی کی تالیف آپ ہی کے زمانے میں ہوئی جس نے آپ کے نام کو زبان زدِ خاص و عام کر دیا۔ علمی درس گاہیں جس قدر تمام مملکت میں کھلیں ان کی ایک بڑی فہرست تیار ہو سکتی ہے۔ آپ کو ہر علم کا ذوق تھا۔ کلام، حدیث، فقہ، اصول تفسیر، ریاضی، علم معانی، بیان اور ادب کے فاضل تھے، جیسے خود قابل طباع اور فضیلت مآب تھے ویسے ہی آپ کے اراکین دولت تھے۔ خصوصاً میاں محمود نظام الملک درجۂ وزارت پر ممتاز تھا۔ مُلّا عبدالغنی صدر، نجم الدین مفتی، شیخ آذری ملک الشعراء، میر نور اللہ ملک المشائخ، قاضی احمد مقبول ملک العلماء، نظام الدین قاضی پر بیدر کو ناز تھا۔ باوجود ایسے عظیم القدر سلطان ہونے کے تکلف، غرور اور تعصب مزاج میں نام کو نہ تھا۔ خوش اخلاقی، ملنساری اور خاکساری میں

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی سیرت

بے نظیر تھے۔ ہر ایک سے نیاز مندانہ ملتے اور نرمی و ملاطفت سے پیش آتے تھے، دوست اور غیر دوست سے ہمدردی کیا کرتے تھے۔

آپ اپنے زمانے کے ہم عصر بادشاہوں سے بھی دوستانہ تعلق رکھتے تھے چنانچہ احمد شاہ والیٔ گجرات، ہوشنگ شاہ والیٔ مالوہ اور نصیر خاں فاروقی والیٔ خاندیس آپ کے خاص دوست تھے جنھیں اکثر تحفے تحایف بھیجا کرتے تھے۔ اور رائے کھیرلا اور والیٔ اڑیسہ سے بھی آپ کے دوستانہ تعلقات قایم تھے۔

آپ نہایت شجاع اور خوب صورت جوان تھے۔ چہرہ نہایت روشن اور پیشانی نہایت کشادہ تھی، اور جبینِ پُرتنویر سے نورِ ایمان ٹپکتا تھا۔ آپ نے صدقِ عقیدت اور خلوصِ ارادت سے حضرت سید محمد بندہ نواز گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کی بیعت کی۔ بہ صرف زرِ کثیر حضرتؒ کے لیے ایک خانقاہ تعمیر کرائی، اور ہمیشہ حاضرِ خدمت ہو کر اسرارِ معرفت کا سبق لیتے اور ہر محفل سماع میں شریک ہو کر نکاتِ تصوف سے محظوظ اور توجہ حضرتؒ سے بہرہ مند ہوتے تھے۔ آپ مذہبی عقاید اور خیالات میں مستحکم تھے۔ سُنّی المذہب اور صوفی المشرب تھے۔ صوم و صلواۃ کے بہت پابند اور خدا ترس تھے۔ ہر روز تلاوت قرآن شریف اور ورد وظایف کرتے تھے۔ ایک وقت کی نماز تو کیا، آپ نے کبھی تہجد اور اشراق تک قضا نہیں ہونے دی۔ ہر سال صدہا حجاج کو شاہی اخراجات سے حج کے لیے مکہ معظمہ روانہ کیا کرتے تھے۔ باوجود بادشاہ ہونے کے آپ کا لباس نہایت سادہ تھا، اور غذا آپ کی سوکھی جو کی روٹی[۱] اور سوکھا ساگ تھی۔ آپ کے رہنے کا مکان بھی نہایت معمولی اور سادہ تھا اور روزانہ قرآن شریف کا پاؤ پارہ لکھا کرتے تھے، اس سے جو آمدنی ہوتی اسی سے آپ کے تمام خانگی اخراجات پورے ہوتے تھے۔ سلطنت کی آمدنی سے ایک پیسہ بھی اپنے لیے خرچ کرنا حرام خیال فرماتے تھے۔ ہمیشہ حلال کی روزی سے گزر اوقات کیا کرتے تھے۔ ایک روز

لہ۔ تاریخ خورشید جاہی۔

ایک فقیر نے حاضر خدمت ہو کر طعام خاصہ طلب کیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ میرے شاہی مطبخ میں ہر روز مختلف قسم کے پکوان ہوا کرتے ہیں اور ہزار ہا لوگ کھایا کرتے ہیں، تم بھی وہاں جا کر جس قسم کے کھانے کی تمھیں خواہش ہو ملازمین سے مانگ کر کھا لو لیکن وہ اپنی استدعا پر مصر ہوا۔ اس پر آپ مجبوراً اندر گئے اور جو کی روٹی اور سوکھا سالن اس پر رکھ کر اس کو لا دیا۔ فقیر اس غذا کو دیکھ کر متعجب ہوا اور نہ کھا کر واپس جانے لگا۔ آپ نے اس کو بلا کر نہ کھانے کی وجہ دریافت کی، وہ جواب دیا کہ آپ نے جو کھانا بھجوایا تھا اُس کو تو کوئی نہیں کھا سکتا۔ اس پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ ابھی تک تمھارا نفس امارہ قابو میں نہیں آیا ہے۔ اس کے بعد آپ نے اس کو مطبخ شاہی میں روانہ کیا اور جس قسم کے کھانے کی اس نے خواہش کی اس کو مہیا کرا دیا۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی سیرت

آپ تاریخ دکن میں سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے نام سے مشہور ہیں اور دکن کا ہر شخص آج تک آپ کے ولیِ کامل ہونے کو تسلیم کرتا ہے۔ آپ کے ولی کہلانے کے واقعہ کو فرشتہ اس طرح بیان کرتا ہے کہ: سلطنت[1] کرتے ہوئے چند سال گذرے تھے کہ دارالسلطنت میں امساک باراں سے قحطِ عظیم واقع ہوا، اور نہریں اور باولیاں اکثر ممالک دکن کی خشک ہو گئیں جس کا یہ اثر ہوا کہ اکثر چوپائے اور صحرائی جانور مرنے لگے۔ آپ نے خزانے کا دروازہ کھول کر سپاہ میں روپیہ تقسیم کیا اور غلّہ کے شاہی ذخائر غرباء اور مساکین میں لُٹا دیئے۔ جب ایک سال اس طرح پر گذرا، اور دوسرے سال بھی آثارِ نزولِ فیوضِ آسمانی کا ظہور نہ ہوا تو آپ نے مضطرب ہو کر علماء، مشائخ اور زہاد کو ساتھ لے کر نمازِ استسقا ادا کی، لیکن جب اس پر بھی کوئی اثر مترتب نہ ہوا، اور لوگوں نے آپ کی سلطنت کو منحوس خیال کیا تو

---

[1] یہ واقعہ فرشتہ کے بیان کے مطابق دیورائے کی جنگ کے بعد ۸۲۷ھ م ۱۴۲۴ء میں پیش آیا تھا، اور ۸۲۸ھ م ۱۴۲۵ء میں قحط رفع ہوا تھا۔ اس واقعہ سے قبل یعنی ۸۲۶ھ میں پایہ تخت بیدر میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ لہذا یہ واقعہ بیدر ہی میں پیش آیا تھا۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی سیرت

آپ نہایت متاثر و محزون ہو کر بہ نفس نفیس صحرا کی طرف تشریف لے گئے اور تنہا ایک بلندی پر چڑھ کر چند رکعت نماز ادا کی اور نہایت عجز و انکسار سے جبینِ نیاز زمین پر ٹیک کے درگاہ قاضی الحاجات میں دعائے بارانِ رحمت کی اور اس قدر زاری کی کہ خدا کی قدرت سے اسی دم ایک ابرِ عظیم آسمان پر نمودار ہو کر برسنے لگا۔ آپ نے مراد پا کر عرض کیا کہ میں فیضِ سبحانی اور رحمت ربانی سے ہرگز نہ بھاگوں گا۔ برسے برسے اور خوب برسے۔ اور جو لوگ آپ کے ہمراہ آئے تھے شدتِ باراں سے کانپنے لگے اور سب جوش و خروش میں آ کر کہنے لگے کہ اے سلطان احمد شاہ بہمنی ولایت آپ کی ظاہر ہوئی۔ آپ سر سجدے سے اٹھا کر شہر کی طرف مراجعت فرمائیے تاکہ خلق آسودہ ہو۔ پس آپ عین بارش میں بھیگتے ہوئے شہر میں آئے، اور اسی دن نہیں بلکہ اسی گھڑی سے آپ سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے لقب سے ملقب اور مشہور ہوئے۔ آپ کے صاحبِ ولایت اور عالی مرتبہ ولی اور بزرگ تر خدا دوست اور مقبول بارگاہ ربِ قدیر ہونے کا اسی ایک کرامت سے اندازہ کر لینا چاہیئے۔ آپ ابتدا سے درویشانِ صاحب حال اور علماء و مشائخین باکمال کے معتقد اور ہمیشہ ان کی صحبت سے فیض کے طالب رہتے تھے۔ چنانچہ حضرت سید محمد گیسو دراز کے مرید ہو کر آپ کی علم باطنی سے فیض یاب ہوئے۔ آپ کو جو یہ جلیل القدر مراتب سلطانی اور ولایت ملی وہ حضرتؒ ہی کی دعا اور فیض و برکت سے حاصل ہوئی تھی۔

آپ آنحضرت رسول اللہ علیہ وسلم، حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہ اور حضرت حسنین علیہ السلام کے عشق و محبت کے بندے تھے۔ ترویج شرع سید المرسلین میں اپنی تمام ہمت صرف فرمائی اور اسلام کے پھیلانے میں اور جملہ لوازم و احکام شرعیہ کی بجا آوری میں سعیٔ تمام فرمایا کرتے تھے۔ دین مبین مصطفوی کے اوامر و نواہی میں احتیاط فرماتے اور امر معروف و نہی منکر میں قیام و اقدام کرتے تھے۔ خیرات آپ کی علانیہ اور خفیہ دونوں طرح پر جاری تھی۔ روزانہ کئی ہزار تنگہ جیب خاص سے خیرات کیا کرتے تھے۔ خیرات آپ کی بیدر اور ہندوستان تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ دور دراز ممالک جیسے عراق و فارس وغیرہ بھی

سلطان احمد شاہ بہمنی کی سیرت

اس سے فیض یاب ہو رہے تھے۔ سادات اور مشائخین کی بے حد عزت کرتے، حسنِ اعتقاد رکھتے اور انھیں انعام و اکرام اور خیرات سے مالا مال فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ مورخین[1] بیان کرتے ہیں کہ ۸۳۷ھ میں سرکش باغیوں کو سزا دے کر جب آپ نے مراجعت کی اور بیدر سے ایک منزل پر آ رہے تو ناصرالدین کربلائی کو جس کو شیخ آذری نے سفارش کرکے بھیجا تھا، پانچ ہزار تنگہ دیا اور تیس ہزار تنگہ کربلائی سیدوں کو تقسیم کرنے کے لیے اُس کے ہاتھ بھیجا۔ شیخ اسی دن روانہ ہو گیا۔ راستے میں ایک امیر شیر ملک نامی کے سامنے سے اُس کا گذر ہوا، چونکہ اُس زمانے کا دستور تھا کہ بڑے امرا کے سامنے جائیں تو ان کی تعظیم کریں، مگر یہ سید ویسے ہی گھوڑے پر چڑھا ہوا گستاخانہ سامنے سے گذر گیا۔ شیر ملک نے اپنے آدمیوں سے اُسے پکڑوا بلایا اور گھوڑے سے زبردستی اتروا دیا۔ یہ سید آپ کے پاس چلا گیا اور اس کی شکایت کی۔ آپ جب بیدر کو آئے تو دربار کے وقت شیر ملک بھی حاضر ہوا، آپ نے بہ لحاظ احترام سادات شیر ملک کو اس قصور میں ہاتھی کے پاؤں سے بندھوا کر مروا ڈالا، اور مورخین اور شعراء نے اس کو آپ کی بڑی دین داری کا کام لکھا ہے۔

آپ ہمیشہ بزرگانِ دین، اکابر سادات، مشائخ، صوفیا، صلحا و زہاد سے خاص تعلق عقیدت اور صحبت رکھتے تھے اور ان سے دعائیں لیتے تھے حضرت خواجہ بندہ نوازؒ، حضرت سید السادات سید حنیفؒ۔ حضرت عبدالصمدؒ عرف شاہ راجو اور شاہ خلیل اللہ کے مکان پر خود جاتے تھے، اور وہ جو نصیحت فرماتے اس پر عمل فرمایا کرتے تھے۔ ان کے کلمات نصیحت آمیز کو توجہ سے سنتے۔ صوفیائے کرام و مشائخ عظام، علما، و فضلا، صلحا، زہاد کے خاص وظیفے مقرر تھے۔ با وجود پابندئ شریعت آپ زاہد خشک بھی نہ تھے۔ آپ کی بے تکلفی کی مجلس میں نغمہ و سرود بھی ہوتا تھا، اور آپ کی مجلس ہمایوں میں ہمیشہ ندمائے حکمت شعار اور حکمائے فضیلت آثار حاضر رہتے اور محفل کو لطایف کلمات

---

[1] ۔ فرشتہ اور برہان مآثر۔

اور تعریف مکارم صفات سے آراستہ رکھتے تھے اور ان کی حکمت اور موعظت کی داستانیں سماعت فرمایا کرتے تھے۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی سیرت

آپ ہمیشہ علمائے اہلِ کمال اور شعراء کی قدر افزائی انعام و اکرام سے کیا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے شیخ آذری کو دو ابیات کے صلے میں جو اس نے بیدر کے قصر شاہی کے متعلق کہے تھے چالیس[1] ہزار تنگہ دے کر اُس کی خواہش کے مطابق وطن واپس جانے کی اجازت اور اخراجات سفر کے لیے مزید بیس ہزار تنگہ، خلعت خاص، اور پانچ ہندی غلام عنایت فرمایا۔ اور شرف الدین[2] مازندرانی کو ان اشعار کے خوش خط لکھنے کے صلے میں بارہ ہزار تنگہ سے سرفراز فرمایا۔ غرض کہ آپ فضلاء، وعلماء و شعراء و ندما کے ملجا و ماوا تھے۔

آپ میں عدل و انصاف کا جوہر موجود تھا۔ انصاف میں کسی کی طرف داری نہیں فرمایا کرتے تھے، خواہ وہ آپ کا عزیز ہو یا غیر۔ چنانچہ آپ نے اپنے ہمشیرہ زادہ شیر خاں کو قصاصاً معاملۂ خون میں قتل کرایا، اور جس کا اثر یہ تھا کہ تمام ملک میں خوش حالی پائی جاتی تھی۔ تجارت میں کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی۔ قریہ، قریہ مال و دولت سے آباد تھا۔ دارالخلافہ کی آبادی بہت تھی، اور ملک میں ہزارہا مسجدیں، پل، حمام اور مدارس موجود تھے۔ اور کئی نئے شہر، جیسے نعمت آباد وغیرہ آباد کرائے، اور وقتِ ضرورت بڑے بڑے صوبوں میں دورہ بھی کیا اور ملک کی حالت اپنی آنکھوں سے دیکھی۔

آپ کی ذات بردباری اور پرہیزگاری کے لباس سے آراستہ اور

---

[1] ۔ فرشتہ۔ لیکن برہان مآثر نے لکھا ہے کہ آپ نے بہ طور انعام اس کو سو ہزار تنگہ اور اخراجات سفر کے لیے بیس ہزار تنگہ عنایت فرمایا تھا۔

[2] ۔ برہان مآثر۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی سیرت

زیور زہد و صلاح سے پیراستہ تھی۔ علوم ظاہری و باطنی میں یگانۂ عصر اور انواع کمالاتِ صوری اور معنوی میں بایزیدِ دہر تھے۔ اس کے علاوہ آپ قواعد لشکرکشی و آئینِ فرمانروائی خوب جانتے تھے۔ ہر کام میں بھائی کی پیروی اور ادب کرتے تھے۔ سادات، علماء اور مشایخ کی تعظیم و تکریم کرتے اور فقیروں اور درویشوں سے بہت عقیدت رکھتے، اور ان کے ساتھ بہت سلوک کیا کرتے تھے۔ کل مہایم سلطنت کو بہ ذاتِ خود انجام دیتے۔ غریب رعایا کی فریاد سنتے اور انصاف فرماتے اور اپنی ہندو مسلم رعایا کو ایک نگہ سے دیکھتے تھے۔ دونوں میں تمیز نہیں کرتے تھے۔ آپ ہمیشہ رعیت نواز اور ظالم کش تھے جس طرح مسلم رعایا کے آرام و آسایش کا خیال رکھتے تھے اُسی طرح غیر مسلم کا بھی خیال فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ سلطان سوری کے مولف نے لکھا ہے کہ آپ کو بیدر میں ایک قطعۂ زمین کی سخت ضرورت تھی، اس زمین کا مالک ایک غیر مسلم لوہار تھا۔ عہدہ دارانِ سرکاری نے اس کو ہر طرح سے سمجھایا اور معقول معاوضہ دینے کا وعدہ کیا لیکن وہ راضی نہ ہوا۔ جب وہ سختی کرنے لگے تو لوہار آپ کی خدمتِ بابرکت میں حاضر ہو کر عرضِ حال کیا، آپ نے اپنے عہدہ داروں سے فرمایا کہ جب وہ زمین دینے سے ناراض ہے تو اس پر سختی نہ کی جائے اور زمین کو اسی کے قبضے میں رہنے دیا جائے۔ لوہار کو خلعت اور انعام و اکرام سے سرفراز فرمایا۔ آپ کے اس حکم اور مہربانی سے لوہار بہت خوش ہوا، اور آپ کو دعائیں دیتا ہوا گھر کو واپس گیا۔ آپ گاہے گاہے مثل ہارون رشید خلیفۂ بغداد کے بھیس بدل کر رعایا کے حالات دریافت کرنے کوچہ بہ کوچہ گشت لگایا کرتے تھے۔ کبھی مسجدوں اور مدرسوں میں جا کر وہاں کی حالت دیکھتے اور مثل اپنے بھائی کے ہفتے میں تین دن یعنے شنبہ، دوشنبہ اور چہار شنبہ، خود ہی طلباء کو درس دیا کرتے تھے۔ اور کبھی دفاتر میں جا کر ملک کے نظم و نسق کو ملاحظہ فرما کر اصلاحیں جاری فرماتے تھے، اور صد ہا رفاہ عام کے کام کرتے تھے، جس میں خزانے کا بڑا حصہ ہمیشہ صرف ہوتا تھا۔ غرض آپ نے اخلاقِ خجستہ سے خاص و عام کو مطیع و فرمانبردار اور عاداتِ حسنہ

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی سیرت

اور لطف و مروت سے ہر ایک کو اپنا والہ و شیدا بنا لیا تھا اور مملکت میں ایسا انتظام فرمایا تھا کہ کوئی بُرے فعل کا مرتکب ہونے کی تو کیا بلکہ خادم اپنے مخدوم سے بے وفائی، قرض خواہ قرضہ دہندہ سے وعدہ خلافی اور بے ایمانی تک کرنے کی جسرادت نہ کر سکتا تھا۔ آپ کے عہد میں وفاداری اور حق شناسی کا شعار عام تھا۔ چنانچہ فرشتہ بیان کرتا ہے کہ آپ کے زمانے میں بیدر کے ایک باشندے کے پاس ایک کتا تھا جو وفاداری اور حق شناسی کی وجہ سے مشہور تھا۔ اتفاقاً اس شخص کو ایک واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے اس کو روپیے کی ضرورت ہوئی اور اس نے اس کتے کو ایک دوسرے شخص کے پاس رہن رکھ کر روپیہ حاصل کیا۔ یہ شخص کتے کو ہمراہ لے کر قصبۂ گنجوٹی روانہ ہوا۔ اتفاق سے راستے میں اس کا دشمن ملا اور موقع پا کر اس کو تلوار سے زخمی کیا اور مردہ سمجھ کر بہ خوشی جانے لگا۔ کتے نے اس واقعہ کو دور سے دیکھا اور دشمن کے قریب آ کر اس کو پنجوں اور دانتوں سے زخمی کر کے ہلاک کر ڈالا اور پھر مرتہن کے پاس آیا اور اس کو زندہ پا کر سر اس کے پاؤں پر ملا اور غم و الم کے حرکات کا اظہار کرنے لگا۔ اس پر اس شخص نے سمجھا کہ اس کا دشمن مر گیا ہے۔ اس نے اس کتے کے ساتھ مہربانی کی اور قریب کے گاؤں میں جا کر اپنے علاج معالجے میں مصروف ہوا۔ جب اس کی حالت روز بہ روز بد سے بدتر ہونے لگی اور زیست کی امید باقی نہ رہی تو اس نے اپنے ہاتھ سے ایک خط لکھا کہ "اس کتے نے میرے ساتھ اس طرح کی وفاداری کی ہے اور میرے دشمن کو اس طرح ہلاک کیا، جو حق تمھارے ذمے تھا وہ ادا ہو گیا اور اب مجھے اپنے روپیے کا دعوےٰ نہیں ہے۔ میں نے کتے کو بے حد رضامندی کے ساتھ رخصت کیا ہے اس کو ہزار دوستوں سے بہتر سمجھو اور اس سے غافل نہ رہو۔" اس خط کو اس نے کتے کے گلے میں باندھ کر کتے کو اس کے مالک کے پاس روانہ کر دیا۔ مالک کتے کو دیکھ کر غصے اور غضب میں آیا اور اس کو یہ کہہ کر کہ تو نے مجھ کو لوگوں میں بے اعتبار اور وعدہ خلاف کر دیا، ایسے زور سے مارا کہ وہ زمین پر گرا اور مر گیا۔ مالک نے اس کی گردن میں کاغذ آویزاں دیکھا اور اُسے کھول کر پڑھا اور حقیقت حال

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی سیرت

معلوم کرکے افسوس کیا اور شہر سے باہر اسے دفن کر دیا۔ قرض کے روپیے اور اپنے پاس سے اُس میں شریک کرکے قبر پر گنبد بنوایا جو فرشتہ کے زمانے تک بیدر میں موجود تھا۔ محبوب الوطن تذکرۂ سلاطین دکن کے مولف نے بہ حوالۂ تاریخ محمود شاہی لکھا ہے کہ جب مخبروں نے اس کتے کی وفاداری اور موت کا قصہ آپ سے بیان کیا تو آپ کو بھی سخت افسوس اور کتے کی وفاداری پر تعجب ہوا، اور حکم دیا کہ اس کو بیرون شہر عظمت کے ساتھ دفن کرکے اس پر ایک عالیشان گنبد تعمیر کیا جائے تاکہ آپ کے زمانے کا یہ عجیب واقعہ دنیا میں یادگار رہے۔

آپ کے دورِ حکومت میں ہندوؤں سے جنگ و جدال اور ان کا کشت و خون نمایاں نظر آتا ہے، لیکن اس کو آپ کے دامن پر بد نما داغ نہیں کہا جا سکتا۔ لڑائی چھیڑ چھاڑ پہلے آپ کی طرف سے نہیں بلکہ ہندوؤں کے طرف سے ہوئی۔ بعد میں بھی ہندوؤں نے عداوت و دشمنی کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ جب کوئی موقع ملا انھوں نے سلطنت بہمنیہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی، یہ آپ کا اقبال اور آپ کی شجاعت اور آپ کا تدبر تھا کہ آپ اپنے دشمنوں کے ہر وار سے محفوظ رہے اور ان کو جرائم کی خاطر خواہ سزا دینے میں کامیاب ہوتے رہے۔ پھر بھی جب آپ کے دشمن زیر ہو گئے تو آپ نے مدت العمر کے لیے تلوار نیام میں کر لی۔ آپ کی زندگی کے آخری ایام اس بات کے زبردست شاہد ہیں۔

تلنگانہ اور بیجانگر آپ کے دشمن تھے، ان میں سے آپ نے تلنگانے کا خاتمہ کرکے اس کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اور بیجانگر کو انتہائی طور پر مغلوب کر لیا۔ مال اور خزانے کے اعتبار سے اس درجہ سلطنت کو ترقی ہوئی جس کی مثال آپ کے خاندان میں نہیں ملتی جس طرح آپ کو بیرونی دشمنوں کے مطیع و منقاد کرنے میں حیرتناک کامیابی ہوئی، اسی طرح اندرونی مفسدوں کی سرکوبی میں بھی آپ تعجب خیز طور پر کامیاب ہوئے۔

آپ کی حیرتناک جراءت و دلیری اگرچہ آپ کی زندگی کے ہر واقعہ سے

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی سیرت

ظاہر ہوتی ہے، لیکن ایک موقع ایسا ہے جو آپ کو بہت ہی بڑا دلیر اور غیر معمولی دل و دماغ کا بادشاہ ثابت کرتا ہے۔ یہ وہ موقع تھا جب کہ پانچ ہزار ہندوؤں نے آپس میں عہد کیا تھا کہ جب موقع پائیں گے آپ کو قتل کر ڈالیں گے، خواہ اس کے لیے کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

ایک روز آپ شکار کھیلنے گئے اور ہرن کے پیچھے کئی کوس تک نکل گئے۔ اس وقت آپ کے ساتھ صرف دو سو تیر انداز تھے، اسی حالت میں وہ سب ہندو گھوڑوں پر سوار آتے دکھائی دیئے۔ تھوڑے فاصلے پر ایک چار دیواری تھی جس کو کاشتکاروں نے اپنے مویشیوں کے لیے جنگل میں بنایا تھا، آپ نے اس طرف کا رُخ کیا۔ راستے میں نالہ مل گیا جس سے آپ کو کچھ دیر ہو گئی، اتنے میں ہندو آپہنچے۔ آپ کے رفیقوں نے ہمت نہ ہار کر نہایت دلیری سے مقابلہ کرنا شروع کیا، دو سو سلطانی سپاہی زخمی ہو گئے اور قریب تھا کہ آپ کو بھی ہندو صدمہ پہنچائیں۔ اتنے میں سو مغل تیر انداز اور آ گئے اور ہندوؤں سے لڑنے لگے۔ اس فرصت میں آپ نہایت شجاعت اور دلیری سے چار دیواری تک پہنچ گئے۔ مسلمان دیوار پر چڑھ گئے اور پانچ ہزار ہندوؤں سے باوجود اپنی مختصر تعداد کے مقابلہ کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں عبدالقادر جو اسلحہ داروں کا افسر تھا، دو تین ہزار باڈی گارڈ کے سواروں کو لے کر آ گیا اور دشمنوں کو مار کر بھگا دیا۔ اس موقع پر آپ کا سراسیمہ نہ ہونا اور نہایت جواں مردی سے مقابلہ کرنا آپ کے عزم واستقلال کا پایندہ ثبوت ہے۔ چار دیواری میں پہنچ کر نہایت عمدگی سے مورچہ بندی کر کے مقابلہ کرنا اس بات کی دلیل تھی کہ آپ کے اندر غیر معمولی عقل، سپہ سالاری اور مدبری کے اوصاف بھی تھے، ورنہ ایسے نازک وقت میں بڑے بڑے ہمت والے گھبرا جاتے ہیں اور پریشانی کے سبب بے سروپا تدبیریں کرنے لگتے ہیں۔

آپ کو متبحر عالم میر فضل اللہ شیرازی نے تیر اندازی، چوگان بازی اور سواری کی نہایت بہتر تعلیم دی تھی، اور تیر اندازی کا ایسا ذوق پیدا کر دیا تھا کہ آپ نے اپنے زمانے میں عراق، خراسان، ماوراءالنہر، روم اور عرب سے مشہور تین ہزار تیر انداز طلب کر کے ملازم رکھا، اور اس فن کی ایسی سرپرستی کی جو کسی بہمنی سلطان نے نہیں کی تھی۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی سیرت

بہر حال آپ کی یہ غیر معمولی قابلیت سلاطین بہمنیہ میں خاص طور سے قابل توجہ ہے اور ایسی نہیں ہے جس کو نظر انداز کیا جا سکے۔

آپ کے زمانے کے مشہور مصری مورخ محمد بن ابی بکر عمر المخدومی الدمامینی اپنی کتاب منہل الصافی[1] یہ شرح الوافی کے دیباچے میں بعد حمد و نعت آپ کی سیرت کے متعلق تحریر کرتے ہیں کہ "جب میں ممالک مصر سے گجرات کی طرف آیا تو کتاب مختصر النحوی المسمی الوافی کی جانب اکثر اشخاص کا شوق شغف کثرت سے پایا اور انھوں نے مجھے بتایا کہ اس فن نحو کے مشکل معانی کے حل کے متعلق کوئی شرح اُس وقت تک نہیں لکھی گئی تھی۔

بنا برآں رسالہ مذکور کی شرح لکھنے کی نسبت اکثر اشخاص نے مجھ سے خواہش ظاہر کی تھی۔ لیکن اُن کی خواہش کی تکمیل کے قبل ملک گجرات کو چھوڑنا پڑا۔

پھر میرا ارادہ حسن آباد (گلبرگہ) کی طرف سفر کرنے کا ہوا تاکہ اس کی مشہور خوبیوں کو معلوم کر سکوں، چنانچہ میں نے وہاں کے ایک گروہ کو اس شہر کی عظمت و شان کے اظہار کی جانب مائل و راغب پایا اور لوگ اس پر متفق تھے کہ اس ملک کا سلطان فضائل و بزرگی میں اپنے وقت کا امام اعظم نیز کاشف کرب و بلا اور سلاطین عرب و عجم کی پناہ گاہ ہے، خدائے تعالیٰ اس کے علم و سخاوت کی نہروں کو جاری رکھے اور اس کے مقاصد دینی و دنیوی بر لائے۔ اس کے افعال حمیدہ، اقوال پسندیدہ، اور مساعی جمیلہ میں حضرت عمرؓ کی حق پژوہی و معدلت نوازی کی جھلک نظر آتی ہے۔

رعایا خوش حال اور حالات پُر امن ہیں، اور ایسا کوئی نظر نہیں آتا جو اس سلطان اعظم کا جانی دشمن ہو، یا جو اس کی دولت سے متمتع نہ ہوا ہو۔ ہر ناظر و سامع نے اس کو امام عادل ہی دیکھا اور سُنا اور اس کو نہایت شجیع، قوی، عالی وقار اور کُشادہ دست پایا۔ فی الحقیقت وہ ایسی سپر ہے جو تمام دلیروں کو ضعیف کر دے۔ اس کی کثرت جود و سخا سے ابر شرمندہ

---

[1] یہ کتاب کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ یہ عربی عبارت کا لفظی ترجمہ نہیں ہے، بلکہ اس کا مفہوم اُردو میں بیان کیا گیا ہے۔

اور شیر اس کے دلیرانہ حملے سے عاجز ہے، وہ ایسا غازی ہے جس کے فتح و نصرت کے آثار عالم میں ہویدا ہیں، اور اس کے فضائل کے تذکروں کی دنیا میں دھوم ہے۔ سلطان ... ولی بہمنی کی سیرت

خدائے تعالیٰ اس کے جہاد و قتال میں نصرت عطا کرے، اور اس کو ایسے علوم حاصل ہوں جن کے موتیوں سے صدف گوش مالا مال ہو جائے، اور ایسی فکر صحیح و نکتہ رس ملے جس سے دقیق مسائل حل ہو جائیں، اور حرکات و سکنات کے لطایف کا مذاق صحیح حاصل ہو، نیز ایسی شہامت عطا ہو جس کے عجائبات علی الاعلان ظاہر ہوں اور شمشیر نطق اس کی تصدیق کرے، اور وہ شمشیر فی نفسہ زبان ہے جو فریضۂ جہاد و اعلاء کلمۃ الحق کی مصاحبت میں قایم ہو، اور سرکش کافروں کے ملک کو ویران اور بلاد اسلام کو آباد کرے، اور جس سے کلمۂ ایمان کی عزت اور بت پرستی کی ذلت ہو، اور اس کی سامعہ نوازی و لطیفہ سنجی سے قوت سامعہ و ناطقہ بہرہ اندوز ہو۔ اللہ تعالیٰ نعمت عدل کو اس پر ہمیشہ بحال رکھے اور اپنا احسان اس پر جس طرح ہے اسی طرح اس کو مخلوق کے ساتھ احسان کی توفیق عطا کرے، اور ہمیشہ اس کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر قایم رکھے جس طرح وہ اس کا اہل ہے اور اس کا ہر فعل منزہ و پاکیزہ ہے۔

نیز اس کے جسد و روح کو وہ سلطنت عظمیٰ سرفراز ہو جس سے خصائل شجاعت ظاہر ہونے لگیں اور اس کا آفتاب سعادت برج اسد میں نزول کرے تاکہ رعایا کے ساتھ اس کی رعایت سیاست بہ خوبی رہ سکے، اس کے فیصلوں سے توفیق رعایا کے نتائج اور اس کے کارناموں سے میزان عدل قایم ہو، اور ہدایت کے صحیح طریقوں کو پہچانے۔ فضل الٰہی ہمیشہ اس کے شامل حال ہو، اور عدل و انصاف و حقوق شناسی اس کا شعار رہے اور یہ دونوں اوصاف اس کے نام کے ساتھ شہرت کے لیے کافی ہیں۔ وہ ایک ایسا امام ہے جس کی سیرت عظمیٰ کے تذکرے شہرۂ آفاق ہونے کے علاوہ اس کے مناقب و مدحتیں مختلف زبانوں کے نظم و نثر میں منقسم ہو چکی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام مکارم اس کی ذات پر ختم ہیں، بلکہ وہ ہر فضیلت کے خاتم سے بھی

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی سیرت

افضل و اعظم ہے۔

جب کوئی سیاح دور سے اس کے دربار میں حاضر ہونے کا قصد کرتا اور اس کے آستانۂ عالی پر مقیم و خیمہ زن ہوتا ہے تو اس کی رسیاں شہاب ثاقب بن کر اس کو راضی کر لیتی ہیں، یعنے اس کے خصائل حسنہ کے بدولت وہ (سیاح) اپنے مقصود اصلی کو پہنچ کر اس شہریار اعظم کی عظمت و جلال کے مشاہدے سے متعجب ہو جاتا ہے انگشتری کو اس کی انگشتان سے زینت ہے جب کہ وہ اس میں مزین ہو۔ آنکھ اس کے دیدار سے منور ہوتی ہے، ہر دہن اس کے محامد میں رطب اللسان اور ہر قلم اس کا مداح و ثنا خواں ہے حتےٰ کہ لیل و نہار بہ حیثیت خادم اس کے مرتبۂ عالی کے اظہار میں سپر کناں ہیں۔

خدائے تعالیٰ اس کا موید ہو، اور اس کے مجد و بزرگی کو آسمان تک پہنچائے، بلکہ ثریا سے بھی بالاتر کر دے۔ اس کے فرمان کو بقائے دوام اور فرقد آسمان تک رسائی حاصل ہو۔

ہلال اس کے گھوڑے کی زین ہونے کا آرزومند ہے۔ اس کی خمیدگی حق ادائے خدمت کی روشن دلیل ہے۔ ہوا اس کے آسمان رفعت تک پہنچنے سے عاجز، اور ابر اس کی بارش کرم کی طرح برسنے سے قاصر ہے۔ رعد و برق اس کے دیرانہ حملۂ شدید سے لرزاں، اور نجوم (ستارگان) اس کے تیروں کی طرح شرر فشاں ہیں۔ شفق گویا اس کے دشمنوں کا بہایا ہوا خون ہے، اور چاند اس کے لشکر ستارگان کا سردار، اور صبح اس کے نیام کی کھینچی ہوئی تلوار ہے۔ الحاصل وہ سلاطین جہاں کا آخر سردار ہے، بلکہ ان میں بھی ایسا سردار اعظم ہے کہ اس کے مفاخر کے مقابلے میں دوسروں کے مفاخر معدوم ہو جاتے ہیں، یعنے وہ مولانا امیر المومنین امام المسلمین ابو الغازی شہاب الدنیا والدین سلطان احمد شاہ ہے، خدائے تعالیٰ اس کے سلک ممالک کو ملوکیت سے منتظم اور اس کے حدود اراضی کو اس کے قبض و تصرف میں ہمیشہ بحال و جاری رکھے۔

میں نے اس کے آستانۂ عالی پر حاضر ہو کر حسن ارادت و عقیدت کے ساتھ اس کتاب کی تالیف میں غیر معمولی قوت صرف کی ہے تاکہ مشتبہات دور ہو سکیں۔

اس کتاب کا نام منہل الصافی فی شرح وافی رکھا گیا ہے۔ اس میں اصل کتاب وافی کی عبارت سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی سیرت کے ساتھ میں نے اپنی ذاتی عبارت بھی بہ غرض توضیح مطالب شریک و شامل کر دی ہے۔
یعنے سطور لیالی میں نجوم مطالب و معانی ظاہر کیے ہیں، اس کے حسنِ تالیف اور اس کے محاسن بخوبی روشن ہو سکیں گے۔ متن کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جو حل کیے بغیر چھوڑ دیا گیا ہو! اس تالیف کو میں نے سلاطین جہاں کے سردار ممدوح کے پاس اس امید کے ساتھ پیش کیا ہے کہ غربت کے مصائب دور ہوں، کیوں کہ اس کے بذل و نوال کا مجھ جیسا غریب الدیار شخص ہی زیادہ حق دار ہے۔

خدائے تعالیٰ اس کو عزت قبولیت عطا فرمائے اور اس کے جبلی خیر و کرم سے میری شکستگی غربت دور ہو! اس کے بعد ناظر کتاب سے معذرت خواہ ہوں کہ اگر کوئی لغزش محسوس ہو تو اس فقیر کی بے بضاعتی اور غربت و مسافرت کے پے در پے مصائب کے ابتلا کے مدنظر درگذر فرمائے۔ شہریار ممدوح کی باریابی نے میری صبح کامیابی روشن کر دی ہے۔

باب ہشتم

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے آخری ایام

آپ نے سنہ ۸۳۰ھ م سنہ ۱۴۲۶ء میں بیدار نظام الملک طرفدار سپہ سالار دولت آباد کی جگہ ملک التجار خلف حسن بصری کو دو ہزاری منصب دار بنا کر مقرر فرمایا اور بندر ابھول[2] اور تمام بندرگاہوں اور ساحلوں کا انتظام بھی اسی کے تفویض کیا اور اس کی جگہ میاں محمود نظام الملک کو جو بہت عقلمند اور لائق اور شیخ فرید شکر بار کی اولاد سے تھا وکیل السلطنت مقرر فرمایا۔

آپ چونکہ بہت ضعیف ہو گئے تھے اور حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا بہت صدمہ ہوا تھا اس لیے ہر وقت غمگین رہنے لگے اور سنہ ۸۳۹ھ م سنہ ۱۴۳۵ء میں جملہ کاروبار سلطنت میاں محمود نظام الملک کے تفویض فرمائے۔ ایک روز دربار شاہی سجا ہوا تھا، اعیان سلطنت اور ارکین دولت سب حاضر تھے، دفعتاً آپ کے دل میں ایک خیال آیا، صاحب زادوں کو طلب کیا اور سب کی طرف مخاطب ہو کر بولے، جب مالک اپنے بندے کو اپنے پاس بلائے تو کیا کرنا چاہیئے؟ مجمع نے جواب دیا کہ سب کام چھوڑ کر اپنے مالک کا حکم بجا لانا چاہیئے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ جناب الٰہی مجھے طلب فرماتے ہیں، اور حضرت پیر و مرشد بندہ نواز گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کی یاد دل میں ٹیس اور کلیجہ میں درد پیدا کر رہی ہے۔ اب بس باغ عالم کی سیر سے دل سیر ہو گیا، فراق کی زیادہ تاب نہیں رہی، اور جام عمر لبریز ہو گیا ہے۔ یہ کہہ کر آپ نے ملک کے مختلف علاقوں پر فرزندوں کو

---

[1] برہان مآثر لیکن فرشتہ نے اس واقعہ کو سنہ ۸۳۳ھ م سنہ ۱۴۲۹ء میں ہونا لکھا ہے، اور میاں محمود نظام الملک کا ذکر نہیں کیا ہے۔

[2] یہ تین سدی پہلے ملکِ دکن کی نہایت مشہور اور بارونق بندرگاہ تھی۔

حاکم[1] مقرر فرمایا۔ ولایت رام نگر۔ مدھول۔ کلم۔ برار، اور ولایت ماہور کا شہزادہ محمود خاں کو حاکم کیا۔

---

[1] برہان مآثر، اور فرشتہ نے لکھا ہے کہ آپ نے ممالک محروسہ کو اپنے فرزندوں پر تقسیم فرمایا جو غلط معلوم ہوتا ہے کیوں کہ آپ خوب جانتے تھے کہ شرعاً مملکت شہزادوں پر تقسیم نہیں ہو سکتی اور مشہور بھی ہے کہ دو درویش در گلیمے بخسپند و دو بادشاہ در اقلیمے نگنجند پس آپ سے یہ توقع کرنی کہ آپ نے مملکت کو شاہزادوں پر تقسیم کیا ہوگا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ آپ کی غرض یہ تھی کہ آپ کے بعد تمام شاہزادوں میں اتفاق رہے اگر آپ مملکت کو تقسیم فرماتے تو بجائے اتفاق کے نفاق پیدا ہوتا اور ہر ایک مدعی سلطنت و وارث تخت و تاج بننے کے لیے کشت و خون کا بازار گرم کرتا میری تحقیق میں صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے مملکت کو شاہزادوں پر تقسیم نہیں فرمایا بلکہ ان کو غیروں کی طرح خدمات اور عہدوں پر مقرر فرما کر جاگیریں عنایت کی تھیں اور ان سے کہا تھا کہ ولی عہد کو میں نے اپنا قایم مقام بادشاہ مقرر کیا ہے اس لیے تم سب اس کی فرماں برداری کیا کرو۔ تمام نے باپ کی نصیحت کو تسلیم تو کیا لیکن بعد میں اس کی تعمیل نہ کی۔

فرشتہ کی روایت کے مطابق آپ نے ۸۳۳ھ م ۱۴۲۹ء میں ولایت رام نگر، مدھول، کلم اور برار شاہزادہ محمود خاں کے سپرد کیا۔ شاہزادہ داؤد خاں کو تلنگانہ دیا۔ شاہزادہ علاء الدین کو ولی عہد کیا۔ اور چھوٹے شاہزادہ محمد خاں کو بڑے بھائی کا شریک کیا۔ لیکن برہان مآثر کا بیان ہے کہ آپ نے ۸۳۸ھ م ۱۴۳۵ء میں شاہزادہ علاء الدین کو جو کہ خلف اکبر تھا ولی عہد بنا کر اپنی جگہ بادشاہی دی۔ ولایت ماہور شاہزادہ محمود خاں کو۔ اور رایچور اور چیول (جو شہر بمبئی کے جنوب میں پہلے بہت مشہور بندرگاہ تھی، اب معمولی ساحلی قصبہ ہے) شاہزادہ داؤد خاں کو دئے۔ فرشتہ کا قول غلط، اور برہان مآثر کا صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ آدمی وصیت اپنی آخری عمر میں کرتا ہے، نہ کہ جوانی میں، لہٰذا اس انتظام کے بعد آپ مہمات سلطنت سے سبک دوش ہو کر عبادت الٰہی میں رات دن مشغول ہو گئے۔ بہت ممکن ہے کہ آپ نے شاہزادہ محمود خاں کو ولایت ماہور کا طرف دار مقرر کر کے ولایت رام نگر، مدھول، کلم، اور برار کے علاقہ جات جاگیر میں دیا ہوگا۔ شاہزادہ داؤد خاں کو رایچور اور چیول کا جاگیردار بنا کر طرف دار تلنگانہ مقرر فرمایا ہوگا۔ اور شاہزادہ علاء الدین والاشان کو کہ خلف الصدق و ولی عہد تھا اپنی جگہ بادشاہی دی۔ اور شاہزادہ محمد خاں کو بڑے بھائی کے ساتھ شریک شاہی کیا ہوگا جس کی تائید گذشتہ واقعات سے بھی ہوتی ہے۔

شہزادہ داؤد خاں کو رایچور و چینول اور تلنگانے کا، اور شہزادہ علاءالدین والاشان کو کہ خلف اکبر تھا ولی عہد بنا کر اپنی جگہ بادشاہی دی۔ اور چھوٹے شاہزادہ محمد خاں کو بڑے بھائی کے ساتھ شریکِ شاہی کیا اور یہ قسم لی کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کی مخالفت نہ کریں۔ پھر ضروری وصیت اور سب کو اتفاق کی ہدایت کرکے دربار برخاست کیا اور گوشہ نشینی اختیار کرکے یادِ حق میں مشغول ہو گئے۔

اس کے چند روز بعد آپ ایک سخت مرض میں مبتلا ہوئے۔ اطبائے حاذق نے علاج میں انتہائی کوشش کی لیکن مرض، مرض الموت تھا اس لیے فایدہ نہ ہوا، اور حالت روز بہ روز خراب ہوتی گئی اور آپ نہایت ہی کم زور اور ناتوان ہو گئے۔ بیماری کے زمانے میں اکثر علما، فقرا آپ کی خدمت میں حاضر رہتے اور احادیث و آیاتِ قرآن سنایا کرتے تھے۔ آپ شاہزادوں کو نصیحتیں کرتے اور فرمایا کرتے کہ تم سب اتفاق سے رہو گے اور بڑے بھائی بادشاہ کی اطاعت کرو گے تو سلطنتِ بہمنیہ قایم رہے گی، نہیں تو سلطنت کا خاتمہ ہو جائے گا اور تم تمام بھائی خراب و پراگندہ ہوں گے، بقائے سلطنت کی صورت میں تمام آسودہ حال رہیں گے۔ تمہیں آپس میں جنگ و جدال نہ کرنا چاہیے کیوں کہ اس میں طرفین سے مسلمان اور ہندو مارے جائیں گے، اس لیے اس کا نتیجہ درست نہ ہوگا۔ شاہزادے باپ کی نصیحتوں کو سنتے اور نہایت خوشی و رضا سے تسلیم کرتے تھے۔

آخر عین حالتِ عبادت میں ماہِ رجب کی اٹھائیسویں تاریخ [۲۷] ۸۳۸ھ م ستائیس فروری ۱۴۳۵ء میں بہ وقتِ شب واصل بہ حق ہوئے۔ آپ کی تاریخِ وفات اور سنہ میں مورخین کا اختلاف ہے۔ مندرجۂ بالا تاریخ اور سنہ فرشتہ نے دی ہے۔ برہان مآثر کے مولف کا بیان ہے کہ آپ کی تاریخِ وفات کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے یعنی مورخوں نے ۲۵ سے ۲۸ رجب ۸۳۸ھ م ۱۸ سے ۲۷ فروری ۱۴۳۵ء تک آپ کی تاریخِ وفات لکھی ہے۔ ہفت اقلیم میں آپ کی تاریخِ وفات ۳ رجب ۸۳۸ھ لکھی ہے۔ اور تذکرۃ الملوک کا بیان ہے کہ آپ نے ۸۴۳ھ میں اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف رحلت کی۔ طبقاتِ اکبری میں لکھا ہے کہ آپ نے ۲۰ رجب ۸۳۸ھ میں انتقال فرمایا اور بہ وقتِ انتقال کلمۂ توحید آپ کی زبانِ مبارک پر جاری تھا۔ آپ کی گنبد میں تاریخ و سنہ وفات جو دیا ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا انتقال ۲۹ ذی الحجہ ۸۳۹ھ م ۱۵ جولائی ۱۴۳۶ء کو ہوا۔ گنبد میں جو تاریخ لکھی ہوئی ہے وہ قابلِ یقین و صحیح معلوم ہوتی ہے کیوں کہ یہ سلطان علاءالدین احمد شاہ دوم کے زمانے کی لکھی ہوئی ہے۔ لہٰذا تمام حسبِ بالا سنہ اور تاریخ غلط ہیں۔ بیدر میں مشہور یہ ہے کہ آپ کا وصال ۲۸ رجب[1] کی شب کو ہوا تھا لیکن

---

[1] ممکن ہے کہ گنبد میں ماہِ وفات نقاش نے بہ جائے رجب کے ذی الحجہ لکھ دیا ہوگا، یا فرشتے کی روایت عوام میں مشہور ہو گئی ہوگی۔

سنہ وفات کے متعلق بھی مشہور ہے کہ آپ کا انتقال ۸۳۹ھ کو ہوا ہے اس سے تمام ملک میں گھر گھر رنج و غم ہونے لگا خاص خاندانِ بہمنیہ میں قیامت بپا ہوئی، اور ارکانِ دولت و اربابِ مملکت حسرت و افسوس کرنے لگے، رحلت کے بعد آپ کی تجہیز و تکفین نہایت تکلف سے ہوئی اور جنازہ گنبد میں دفن کیا گیا جو بیدر سے ایک کوس کے فاصلے پر موضع اشٹور کے میدان میں واقع ہے محبوب الوطن کے مولف نے بہ حوالہ تحفۃ السلاطین لکھا ہے کہ جنازہ کے ساتھ خاص و عام کا ہجوم تھا، کوئی روتا تھا، کوئی سر پر خاک اڑاتا تھا غرض تمام آپ کے احسانات یاد کر کے ماتم کرتے تھے۔

محبوب الوطن تذکرۂ سلاطینِ دکن کے مولف نے تاریخ نظامی کے حوالے سے لکھا ہے کہ آپ کی وفات کے تیسرے روز بہ تقریب فاتحہ سوم تمام علما، مشایخ، فضلاء، حفاظ، شاہزادگان و ارکینِ دولت اور ملازمین حشم و خدم آپ کی گنبد میں جمع ہوئے۔ دن کے دس بجے تک قرآن خوانی ہوتی رہی ختم قرآن کے بعد حفاظ، علما و مشایخ وغیرہ نے فاتحہ پڑھی اور آپ کے لیے دعائے خیر کی اس وقت کی رسم کے موافق تمام حاضرین کو شربت پلایا گیا گلاب پاشی کی گئی اور ہر ایک کو پان کی گلوریاں اور پھولوں کے گلدستے دیئے گئے اور مٹھائی تقسیم کی گئی۔

آپ کی مدتِ سلطنت کے متعلق بھی مورخین میں اختلاف ہے فرشتہ نے لکھا ہے کہ آپ کی مدتِ سلطنت بارہ سال دو ماہ۔ برہان مآثر نے صرف بارہ سال طبقات اکبری نے بارہ سال نو ماہ بیس یوم اور ہفت اقلیم اور تذکرۃ الملوک نے بارہ سال نو ماہ چوبیس یوم بتائی ہے لیکن میری تحقیق میں آپ کی مدتِ سلطنت[۵] چودہ سال دو ماہ پچیس یوم ثابت ہوتی ہے۔

آپ کی صرف ایک بیوی تھی جس کے بطن سے فرشتہ کی روایت کے مطابق چار صاحب زادے علاء الدین، محمود خاں، داؤد خاں اور محمد خاں، اور تین صاحب زادیاں تھیں۔ ان صاحب زادیوں میں سے ایک میر نور اللہ بن شاہ خلیل اللہ سے منسوب تھی۔ دوسری شاہ حبیب اللہ بن شاہ خلیل اللہ سے، اور تیسری سید عبد المومن نبیرہ مخدوم جہانیاں سید جلال بخاری سے جنھیں سید اجل جلال خاں کا خطاب دیا گیا تھا۔ آپ نے شاہ حبیب اللہ کو قصبہ بیڑ اور سید عبد المومن مخاطب بہ سید اجل جلال خاں کو نلگنڈہ جاگیر دی تھی۔

برہان مآثر میں لکھا ہے کہ آپ کے سات صاحب زادے تھے جن میں سے تین بڑے تھے، جنھیں خطابات سے سرفراز کیا گیا تھا، بڑے صاحب زادے کا نام

۵۔ یہ مدتِ سلطنت گنبد میں لکھی ہوئی تاریخ وفات ۲۹ ذی الحجہ ۸۳۹ھ کے حساب سے نکالی گئی ہے۔

ظفر خاں[۱] تھا جنھیں خانِ خاناں کا خطاب دیا گیا تھا جس نے بادشاہ ہونے کے بعد اپنا لقب علاء الدین احمد شاہ دوم اختیار کیا لیکن فرشتہ سے اس کا پتہ نہیں چلتا ۔ صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے بڑے بیٹے کا نام علاء الدین تھا۔ دوسرے صاحب زادے کو محمود خاں[۲] کے خطاب سے سرفراز کیا گیا تھا۔ اور تیسرے کو محمد خاں[۳] کے خطاب سے مفتخر فرمایا۔ اسی موءلف نے جہاں شاہزادوں کو ممالکِ محروسہ کے مختلف حصوں میں جاگیریں اور عہدے دینے کا ذکر کیا ہے وہاں محمد خاں کا نام چھوڑ دیا ہے ۔ اور داؤد خاں کا نام لکھا ہے اگر پہلے کے تینؔ صاحب زادوں کے ناموں میں داؤد خاں کا نام بھی شامل کر لیا جائے تو آپ کے چارؔ صاحب زادے ہوتے ہیں جس سے فرشتہ کے بیان کی تائید ہوتی ہے ۔ اس موءلف نے جو ساتؔ صاحب زادوں کا ہونا بیان کیا ہے ان میں سے چارؔ تو حسب بالا صاحب زادے ہوئے اور باقی تینؔ کے ناموں کا پتہ نہیں چلتا ، البتہ اسی موءلف کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی تینؔ صاحب زادیاں بھی تھیں جو میر نور اللہ ۔ شاہ حبیب اللہ اور سید عبد المومن سے بیاہی گئی تھیں۔ اس طرح آپ کے چارؔ صاحب زادے اور تینؔ صاحب زادیاں ہوئیں اور آپ کی جملہ اولاد ساتؔ تھی ۔ موءلف موصوف نے بہ جائے آپ کے بیٹے اور بیٹیاں ساتؔ ہونا تحریر کرنے کے غلطی سے آپ کے ساتؔ بیٹے ہونا لکھ دیا ہوگا پس میری رائے میں فرشتہ کی روایت صحیح معلوم ہوتی ہے اور برہان مآثر کی غلط ۔

---

[۱] سلطان محمد تغلق نے آپ کے جدِ اعلےٰ حسن کو ظفر خاں کا خطاب دیا تھا اور اس نے بادشاہ ہونے کے بعد اپنا لقب علاء الدین حسن اختیار کیا تھا ۔ بہت ممکن ہے کہ آپ نے بھی اپنے جدِ اعلےٰ کے خطاب پر اپنے بڑے بیٹے کا نام رکھا ہوگا ۔ لیکن ظفر خاں نے بادشاہ ہونے کے بعد اپنا لقب علاء الدین احمد شاہ دوم اختیار کیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ نے بھی نام علاء الدین اور لقب ظفر خاں رکھا ہوگا اور اس نے بادشاہ ہونے کے بعد لقب ظفر خاں ترک کر کے نام کے ساتھ احمد شاہ دوم کا لقب اختیار کیا ہو ۔

فرشتہ اور برہان مآثر بہت بعد کی لکھی ہوئی تاریخیں ہیں ۔ فرشتہ نے علاء الدین نام و ظفر خاں لقب خیال کر کے لقب کو ترک کر دیا ہوگا اور صرف نام علاء الدین بھی اپنی تاریخ میں لکھا ہوگا ۔ اور برہان مآثر نے ظفر خاں نام اور علاء الدین لقب خیال کر کے آپ کے بیان میں لقب کو ترک کر کے صرف نام ظفر خاں ہی استعمال کیا ہوگا اور بادشاہ ہونے کے بعد اس نے جو لقب اور نام اختیار کیا تھا اس کو اس کے حالات میں استعمال کیا ہوگا بالغرض ان دونوں موءرخوں میں اس کے متعلق اختلاف ہے ۔

[۲،۳] میری رائے میں یہ دونوں خطابات نہیں بلکہ نام ہیں اور برہان مآثر کے موءلف نے بہ جائے نام کے ان کو خطاب لکھا ہے جو غلط ہے ۔

باب نہم

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے زمانے کے صوفیا، علما، شعراء اور سیاح

آپ سادات، صوفیائے کرام، مشائخین عظام، علماء، فضلاء اور فقراء کی عزت و تعظیم کرتے اور ان سے حسنِ عقیدت و صدق ارادت رکھتے تھے۔ سلاطینِ بہمنیہ شیخ سراج جنیدیؒ کے مرید ہوا کرتے تھے۔ لیکن آپ پہلے بہمنی سلطان ہیں جنھوں نے حضرت سید محمد بندہ نواز گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی۔ حضرت کے دکن تشریف لانے کی کیفیت فرشتہ نے اس طرح بیان کی ہے کہ ۸۱۵ھ میں مخبرانِ سعادت نشان نے فیروز آباد میں سلطان فیروز شاہ کے سمع مبارک میں پہنچایا کہ دہلی کی طرف سے ایک سیدِ عالی مقام عرش احترام حضرت سید محمد گیسو دراز بندہ نوازؒ دکن میں رونق افزا ہو کر حسن آباد گلبرگہ کے قریب پہنچے ہیں۔ سلطان فیروز شاہ چونکہ ہمیشہ سے عالم اور مقدس بزرگوں کی خدمت کا خواہاں رہتا تھا، اس بشارت سے نہایت شاد ہو کر فیروز آباد سے حسن آباد گلبرگہ میں آیا اور جمیع ارکانِ دولت اور اولاد کو استقبال کے لیے روانہ کیا اور بہ اعزاز و اکرام تمام اُن کو شہر میں لایا۔ لیکن بادشاہ حکیم سیاست تھا، جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو علمِ ظاہری میں اور خصوصاً معقولات سے خالی دیکھا تو حضرتؒ کی طرف اس نے زیادہ توجہ نہ کی۔ برخلاف اس کے آپ نے اعتقادِ تمام حضرت سے پیدا کیا اور صدقِ عقیدت اور خلوصِ ارادت سے حضرتؒ کے مرید ہوئے۔ بہ صرفِ زرِ کثیر حضرتؒ کے لیے ایک خانقاہ تعمیر کرائی اور ہمیشہ حاضرِ خدمت ہو کر اسرارِ معرفت کا سبق لیتے اور ہر محفلِ سماع میں شریک ہو کر نکاتِ تصوف سے محظوظ، اور توجہ حضرت سے بہرہ مند ہوتے تھے۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے زمانے کے صوفیاؤ علماؤ شعراء اور سیاح

حضرت سید محمد بندہ نواز رحمۃ اللہ علیہ جنیدِ وقت اور شبلیؑ دہر تھے، لوگوں کو برکات اور فیوض سے مالا مال فرماتے تھے۔ کُل ملکِ دکن روحانی طور پر حضرتؒ کا مسخر تھا ....

. . . .

. . . .

. . . . حضرتؒ نے آپ کی نسبت بھی بادشاہی کی پیشین گوئی کی تھی، اس کی مفصل کیفیت باب دوم میں بیان کی گئی ہے۔

آپ نے بادشاہ ہونے کے بعد حضرتؒ کے اعزاز کو اور بھی بڑھایا اور حسن آباد گلبرگہ میں حضرتؒ کو ایک معقول جاگیر دی جو اب تک حضرتؒ کی اولاد میں برابر چلی آرہی ہے۔ آپ کے بادشاہ ہونے کے چند مہینے بعد حضرتؒ کا انتقال ہوا آپ کو بہت صدمہ ہوا، اور ہر وقت غمگین رہا کرتے تھے۔ آپ نے حضرتؒ کے مزارِ مبارک پر بہ صرف زرِ کثیر ایک نہایت عالی شان گنبد تعمیر کرایا، اور حضرتؒ کی اولاد کے ساتھ بھی آپ کا اعتقاد برابر جاری رہا، اور آپ ہمیشہ انھیں نذر و نیاز سے ...... دیا کرتے تھے۔ غرض آپ کو یہ جلیل القدر مراتب سلطانی، اور ولایت حضرتؒ ہی کی دعا اور فیض و برکت سے حاصل ہوئے تھے۔

آپ مشائخین باکمال کے معتقد اور ہمیشہ ان کی صحبت سے فیض کے طالب رہتے تھے، چنانچہ آپ نے جب شاہ نعمت اللہ ولی کرمانی کی شہرت سُنی تو شیخ حبیب اللہ جنیدی اُن کے مرید اور میر شمس الدین قمی کو بہت سے تحفے تحائف دے کر اُن کے پاس بھیجا کہ وہ ان سے دکن تشریف لانے کی درخواست کریں۔ شاہ نعمت اللہ نے آپ کے فرستادہ آدمیوں کی تعظیم و تکریم کی اور اپنے مرید ملا قطب الدین کو تاج دوازدہ ترک دے کر دکن روانہ کیا جب وہ آپ کے سامنے آیا تو آپ نے کہا کہ یہ وہی شخص ہے جس کو میں نے فیروز شاہ سے لڑتے وقت خواب میں دیکھا تھا۔ اگر اس کے پاس تاج دوازدہ ترک ہے تو میرے خواب کی تعبیر یہی ہے۔ ملا قطب الدین نے آپ کے قریب پہنچ کر سلام کیا اور شاہ نعمت اللہ ولیؒ کی دعا کہی، اور کہا کہ شیخ نے فرمایا کہ:-

"فلاں تاریخ سے اس وقت تک میرے پاس تمہاری امانت موجود تھی، اس کو تم تک پہنچانے کا موقع نہیں ملا، اب شیخ حبیب اللہ کے آنے سے ایک صورت پیدا ہوئی اور مجھ پر واجب ہو گیا کہ تمہاری

امانت تم تک پہنچا دوں۔" آپ فرماتے ہیں کہ "یہ تقریر سُن کر مجھ پر ایک عجیب حالت طاری ہوئی اور بالکل متحیر ہو کر میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر یہ تاج سبز دوازدہ ترک ہے تو اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔" ملا قطب الدین نے قوتِ باطنی سے دریافت کیا اور کہا کہ "اے بادشاہ اپنے دل میں خطرہ نہ لا، یہ تاج سبز دوازدہ ترک ہی ہے، اور میں وہی شخص ہوں جس نے ولایت پناہ کے حکم سے فلاں تاریخ عالم خواب میں تجھ کو یہ تاج دیا تھا۔" میں نے کہا مناسب ہے، پھر ملا قطب الدین نے وہ تاج نکال کر دیا تو آپ نہایت خوش ہو کر بغل گیر ہوئے، اور تاج کو سر پر رکھا۔ شاہ نعمت اللہ ولیؒ نے آپ کو اپنے ہاتھ سے خط لکھا تھا جس میں آپ کو عظیم الشان شہاب الدین احمد شاہ ولی کے نام سے یاد کیا تھا۔ آپ نے حکم دیا کہ منبروں پر اور فرامین میں ولی کے نام سے پکارا اور لکھا جائے، پھر آپ نے خواجہ عماد الدین سمنانی اور سیف اللہ حسن آبادی کو شاہ صاحب کے پاس بھیجا اور اُن کے بیٹے کو بلایا، چونکہ ان کے ایک ہی بیٹے شاہ خلیل اللہ تھے اس لیے انھوں نے اپنے پوتے میر نور اللہ بن شاہ خلیل اللہ کو روانہ کیا۔ جب میر نور اللہ بندرِ چول میں پہنچے تو اُن کی پیشوائی کے لیے سید محمد صدر و میر ابو القاسم جرجانی گئے اور دارالخلافت سے نکل کر آپ نے مع جمیع اُمراء و فرزندان اُن کا استقبال کیا اور ملاقات کے مقام پر ایک مسجد اور گاؤں نعمت آباد[1] بسایا، اور میر نور اللہ کو ملک المشائخ[2] کا خطاب دے کر ان سے اپنی صاحب زادی کا عقد کیا۔ جب ۸۳۴ھ م ۱۴۳۱ء میں شاہ نعمت اللہ ولیؒ[3]

---

[1] بیدر میں مانجرا ندی کے کنارے پر واقع اور مشہور مقام ہے، یہاں آپ نے قلعے کی بنیاد ڈالی تھی، جو ابھی تک نامکمل ہے۔

[2] فرشتہ، اور برہان مآثر۔

[3] فرشتہ۔ برہان مآثر میں لکھا ہے کہ جب آپ کو شاہ نعمت اللہ ولیؒ کے انتقال کی خبر ملی تو آپ نے سخت افسوس کر کے ان کا عرس کیا۔ سادات، مشائخ اور علماء کے ساتھ خود بہ نفسِ نفیس لوازماتِ عرس کو انجام دیا، اس کے بعد مرزا نور اللہ کو تمام سادات اور مشائخین پر ترجیح دی۔ غرض آپ کو اور آپ کے جانشینوں کو حضرتؒ کی اولاد سے خاص عقیدت تھی۔

۱

سلطان احمد شاہ فوت ہوئے تو شاہ خلیل اللہ[1] اپنے باقی دونوں بیٹوں شاہ حبیب اللہ غازی اور شاہ محب اللہ کو ولی بہمنی کے زمانے کے لے کر دکن چلے آئے۔ آپ نے شاہ حبیب اللہ غازی سے اپنی دوسری صاحب زادی کا عقد کیا موفیائ، علماء، شعراء اور ستاج اور انھیں طبقۂ امراء میں داخل کر کے قصبہ بیڑ جاگیر دی، اور بیڑ میں خانقاہ بنادی اور شاہ محب اللہ کو شاہ زادہ علاء الدین[2] کی بیٹی منسوب کی۔

آپ کے گنبد میں شاہ خلیل اللہ بت شکن کا شجرۂ خلافت لکھا ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ شاہ صاحب کے مرید اور خلیفہ تھے۔ گنبد میں شجرۂ خلافت اس طرح پر لکھا ہوا ہے کہ "سلطان احمد شاہ ولی بہمنی مرید اور خلیفہ تھے سید شاہ خلیل اللہ کے جو خلیفہ تھے سید شاہ نورالدین نعمت اللہ ولیؒ کے جو خلیفہ تھے کمال الدین الکوفی کے جو خلیفہ تھے الفتوح السعیدی کے جو خلیفہ تھے ابو المدین المغربی کے جو خلیفہ تھے ابو برکات ابو سعید الاندلسی کے جو خلیفہ تھے ابو الفضل البغدادی کے جو خلیفہ تھے شیخ احمد الغزالی کے جو خلیفہ تھے ابو بکر النشاخ کے جو خلیفہ تھے الشیخ ابو القاسم کے جو خلیفہ تھے ابو علی الکاتب کے جو خلیفہ تھے ابو علی رود باری کے جو خلیفہ تھے خواجہ جنید بغدادی کے جو خلیفہ تھے سر سقطی کے جو خلیفہ تھے معروف کرخی کے جو خلیفہ تھے داؤد طائی کے جو خلیفہ تھے خواجہ حبیب عجمی کے جو خلیفہ تھے خواجہ حسن بصری کے جو خلیفہ تھے حضرت امیرالمومنین علی مرتضیٰ رضی اللہ بن ابی طالب کے جو خلیفہ تھے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے۔"

آپ سادات کی بے حد تعظیم و عزت کیا کرتے اور انھیں انعام و اکرام سے سرفراز فرما کر شاد کرتے تھے۔ سادات اگر آپ سے کسی کے بارے میں سفارش کرتے یا خود اپنی حاجت بیان کرتے تو

---

[1] آپ کے انتقال کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے۔ فرشتے کا بیان ہے کہ آپ بے حد انعام و اکرام سے فیض یاب ہو کر اپنے وطن کو گئے اور وہیں انتقال ہوا۔ قبر ماہان میں ہے۔ بعض مورخین لکھتے ہیں کہ آپ دکن سے اپنے وطن کو جانے کے لیے روانہ ہوئے لیکن راستے میں ہندوستان ہی میں فوت ہوئے، اور بیدر میں آپ کا چلّہ ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ آپ کا انتقال بیدر میں ہوا، اور آپ کا مزار بیدر میں واقع ہے جس پر جو گنبد بنایا گیا تھی جو آج تک بیدر میں سلاطین بہمنیہ کے گنبدوں سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر واقع ہے اور فنِ تعمیر کے لحاظ سے ہندوستان کے بہترین عمارتوں میں شمار ہوتی ہے۔

[2] علاء الدین نے بادشاہ ہونے کے بعد اپنی بیٹی کے لیے بیڑ میں ایک عالی شان محل تعمیر کروا دیا تھا جس کی لاگت تین لاکھ ہن بتائی جاتی ہے، یہ محل اب تک شاہ محب اللہ کی اولاد کے قبضے میں ہے۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے زمانے کے صوفیا، علما، شعرا اور سید

آپ اس کو کبھی رد نہیں فرماتے تھے۔ غرض آپ کو سادات سے ایک خاص محبت تھی اور ہمیشہ ان کا لحاظ رکھتے تھے چنانچہ فرشتہ، برہان مآثر اور طبقات اکبری میں مذکور ہے کہ آپ نے سید ناصر الدین کربلائی کو پانچ ہزار تنگے دیئے اور تیس ہزار تنگے کربلائی سیدوں کو تقسیم کرنے اور کربلا میں پانی کی نہر جاری کرنے کے لیے اس کے ساتھ بھیجے۔ راستے میں شیر ملک نامی امیر نے اس کی بے عزتی کی جب آپ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے بہ لحاظ احترامِ سادات اس کو ہاتھی کے پاؤں سے بندھوا کر مروا ڈالا[1]۔

آپ بزرگانِ دین سے دلی تعلق رکھتے تھے، چنانچہ آپ حضرت سید السادات سید محمد حنیفؒ کے بہت معتقد تھے، اور ان کے صاحب کشف و کرامات ہونے کو تسلیم کرتے تھے۔ سید صاحبؒ سیدِ صحیح النسب متوطنِ گیلان صوبۂ ترکستان تھے۔ طفلی سے ظلِ عاطفت میں اپنے مرشد حضرت خواجہ مسعود رحمۃ اللہ علیہ کے رہ کر کمالات حاصل کیے، اور مرشد کی وفات کے بعد بیدر میں آکر مقیم ہوئے۔ مشہور ہے کہ آپ کے زمانے میں جب تخت محل تیار ہو رہا تھا اس وقت یکایک شہتیر جو نہایت قیمتی تھا اور بڑی مشکل سے وہاں تک پہنچا تھا ناپ میں کم ہو گیا، لوگ اس کے لیے متردد تھے، اتفاق سے حضرت سید صاحبؒ کا گذر ادھر سے ہوا، واقعات کے معلوم ہونے پر حضرتؒ نے اپنی چادر اس شہتیر پر ڈالی اور تھوڑی دیر بعد جب حضرتؒ نے چادر اٹھائی تو خدا کی قدرت سے وہ شہتیر ناپ میں حسب ضرورت بڑھ چکا تھا۔ حضرتؒ کی اس کرامت سے آپ بہت متاثر ہوئے۔ آپ اکثر حضرتؒ کی ملاقات کو جایا کرتے اور حضرتؒ کی نصیحت کو نہایت رغبت کے کانوں سے سنتے تھے، اور حضرتؒ بھی اکثر اوقات آپ کے ہاں آیا کرتے تھے۔ حضرتؒ کا انتقال اسّی برس کی عمر میں ۵ رجب ۸۵۹ھ میں ہوا گنبد آپ کا بیدر سے ایک میل کے فاصلے پر واقع ہے جہاں پانی کا چشمہ بھی ہے۔

آپ کے زمانے میں حضرت عبدالصمد عرف شاہ راجوؒ مشہور بزرگ گذرے ہیں۔ حضرتؒ سے آپ کو خاص عقیدت تھی، حضرتؒ کا وطن گلبرگہ تھا، حضرتؒ کے والدِ بزرگوار اور برادرِ نامدار

---

[1] اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ میں نے آپ کی سیرت کے باب میں بیان کیا ہے۔

ان احمد شاہ
نی کے زمانے کے
علما، شعرا اور صناع

سرکار سلاطینِ بہمنیہ میں ملازم تھے۔ ان کے بعد حضرتؒ کو قضاتِ گلبرگہ ملی تھی سلطان فیروز شاہ بہمنی حضرتؒ کی بہت قدر کرتا تھا جس وقت حضرت خواجہ بندہ نواز حسینی رحمۃ اللہ علیہ رونق افروزِ گلبرگہ ہوئے تو حضرت خواجہ صاحبؒ کے حالات دریافت کرنے اور لیاقت وغیرہ کا اندازہ کرنے کے لیے سلطان نے حضرت عبدالصمدؒ کو اور خواجہ احمد دبیرؒ کو خواجہ صاحبؒ کے پاس بھیجا جب یہ لوگ خواجہ صاحبؒ کے پاس پہنچے تو پہلے ہی ملاقات میں خواجہ صاحبؒ کی صحبت کی برکت ان کے دلوں میں ایسی سرایت کر گئی کہ وہ خواجہ صاحبؒ کے گرویدہ ہو گئے، اور اپنے عہدوں سے فوراً دست بردار ہوئے، اور رات دن خواجہ صاحب کی صحبت میں رہنے لگے۔ حضرتؒ کو خواجہ صاحبؒ نے اپنی خلافت بھی عطا فرمائی تھی۔ حضرتؒ ان تیرہ[۱۳] خلفائے خواجہ صاحبؒ میں سے ہیں جن کو بعد میں خلافت ملی تھی۔ حضرتؒ مرشد کی رحلت کے بعد نہایت مضطرب و پریشان ہو گئے۔ چونکہ آپ کو حضرتؒ سے محبت تھی اس لیے آپ نے حضرتؒ کو بیدر میں اپنے پاس بلا لیا۔ حضرت بڑے عالم و فاضل، پابندِ شریعت، کشف و کرامات اور کمالاتِ ظاہری و باطنی میں یکتائے روزگار تھے۔ آپ اکثر حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور کلماتِ نصیحت آمیز کو جواہر تصوّر فرماتے اور ان سے اپنے کو زینت دیتے تھے۔ حضرتؒ آپ کے انتقال کے بعد بھی کئی سال تک زندہ رہے۔ آپ کے بعد آپ کے ولی عہد نے بھی آپ کے دستور کے بموجب سلسلۂ ملاقات جاری رکھا اور اسی کے عہد میں حضرتؒ کا انتقال ہوا۔ اور گنبد حضرتؒ کا فصیلِ بیدر کے قریب واقع ہے۔

آپ کے زمانے کے دیگر بزرگانِ[۱] دین میں حضرت شاہ ظہیر الدینؒ عرف خوزادے پاک ہمشیرہ زادہ سید السادات سید محمد حنیفؒ اور شاہ مبارک رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ کمٹھانہؒ وغیرہ بھی صاحبِ کشف و کرامات گذرے ہیں۔

آپ علم و فضل کے زیور سے آراستہ تھے اور ہمیشہ علماء اور فضلاء کی صحبت سے اپنے آپ کو مستفید اور انھیں انعام و اکرام سے مالا مال کیا کرتے تھے۔ آپ کی قدر دانی نے دلوں میں وہ شوق اور حوصلے پیدا کر دیئے کہ زمانے کے تمام اہلِ کمال شعرا اور علماء و فضلاء دور دراز سے بیدر میں

لہ۔ ان حضراتؒ کے مفصل حالات کسی تذکرہ یا تاریخ میں نہیں ملے۔ تاریخِ خورشید جاہی میں صرف صاحبِ کشف و کرامات ہونا لکھا ہے۔

کھنچ آئے، اور بیدر علوم و فنون کا مرکز بن گیا۔ اکثر علما، فضلا، نے تو آپ کا احسان و فضل دیکھ کر سلطان احمد شاہ بیدر کو اپنا اصلی وطن بنا لیا، اور بعض ایک مدت تک رہ کے نہایت کامیابی کے ساتھ آپ کے ولی بہمنی کے زمانے انعام و اکرام سے فیض یاب ہو کر اپنے اپنے وطن واپس ہوئے۔ چنانچہ محمد بن ابو بکر المخزومی الدمامینی جو صوفیائی علما شعرا ادبا ادیب کامل اور عالم، فاضل تھا پہلے عرب سے گجرات آیا۔ گجرات میں چند ماہ قیام کیا، اسی دوران قیام میں علمائے گجرات سے بحث و مباحثہ کیا، کوئی اس کا مقابلہ نہ کر سکا۔ یہاں اس نے نحو، ادب، اور عروض کی تعلیم طلبا، کو دینی شروع کی۔ اس کے پاس جوق جوق طلبا، پڑھنے آنے اور مستفید ہوا کرتے۔ جب اس نے گجرات میں آپ کی تعریف اور قدر دانی علما، و فضلا، سنی تو حسن آباد گلبرگہ آیا اور آپ سے ملا۔ آپ نے انعام و اکرام سے اس کی ایسی قدر افزائی کی کہ وہ خوش ہو گیا۔ اس نے کتاب وافی کی شرح منہل الصافی شرح وافی لکھی[1] اور اس کو آپ کے نام نامی و اسم گرامی سے معنون کیا، اور دیباچے[2] میں بعد حمد و ثنا کے آپ کی تعریف لکھی۔ آپ نے اس صلے میں اس کو اس قدر سرفراز کیا کہ اس نے دکن ہی کو اپنا وطن بنا لیا، اور گلبرگے ہی میں ۸۳۱ھ م ۱۴۲۸ء میں فوت ہوا۔ اس کا مقبرہ سلاطین بہمنیہ کے مقبروں کے قریب واقع ہے۔

آپ شعراء کی بھی قدر افزائی فرماتے اور انعام و اکرام سے سرفراز فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ کی قدر دانی کی ندائے عام عجم کے مشہور شاعر شیخ آذری[3] کو بھی عجم سے دکن کھینچ لائی۔ اس کے دکن آنے کے بعد آپ نے امید سے زیادہ اس کی قدر افزائی کی۔ اس نے آپ کی مدح، شہر اور اس کی عمارتوں کی تعریف میں بیش بہا قصیدے لکھے اور اس کے صلے میں معقول رقم بطور انعام حاصل کی اور خطاب ملک الشعراء سے سرفراز ہوا۔ آپ کے حکم سے اس نے بہمن نامہ لکھنا شروع کیا اور جب آپ کے حالات تک پہنچا تو اپنی تصنیف آپ کے ملاحظہ میں پیش کی اور اپنے وطن واپس جانے کی اجازت مانگی۔ آپ نے کہا کہ مجھے حضرت سید محمد گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے

---

[1] یہ کتاب قلمی ہے اس کے دو نسخے کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں موجود ہیں۔

[2] یہ کتاب عربی میں لکھی ہوئی ہے میں نے اس کے دیباچے کا اردو مفہوم آپ کی سیرت کے باب میں شامل کیا ہے۔

[3] فرشتہ اور برہان مآثر۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے زمانے کے صوفیا، علما، شعرا اور سیاح دکن میں

اس عالم سے تشریف لے جانے کا جو صدمہ ہے وہ تمہاری موجودگی سے بہت کم محسوس ہوتا ہے۔ برائے خدا مجھے اپنی جدائی کے رنج میں مبتلا نہ کرو۔ شیخ نے آپ کو اپنے پر اس قدر مہربان دیکھا تو مستقل قیام کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا، اور اپنے بیٹوں کو بھی وطن سے بیدر بلا لیا۔ اسی اثناء میں بیدر میں شاہی محل جس کو تخت محل کہا جاتا ہے تعمیر ہوا، اور شیخ آذری نے حسب ذیل دو شعر اس قصر کی تعریف میں کہے۔

حبذا قصر مشید[1] کہ ز فرطِ عظمت آسماں صدہٗ از پایہ ایں درگاہ است
آسماں ہم نتواں گفت کہ ترکِ ادب است قصر سلطانِ جہاں احمد بہمن شاہ است

ان کو ملّا شرف الدین مازندرانی[2] نے جلی خط میں لکھا اور تلنگانہ کے سنگ تراشوں نے جو اپنے کام میں بڑے ماہر تھے اس قطعے کو ایک بڑے پتھر پر کندہ کیا، اور پتھر محل کے دروازے پر نصب کر دیا۔ ایک روز آپ نے اس کو دیکھا اور شہزادہ علاء الدین سے دریافت فرمایا کہ یہ اشعار کس کے ہیں؟ شہزادے نے جواب دیا کہ یہ علامہ آذری کے ہیں، آپ نے ان کو بے حد پسند فرمایا۔ شہزادے نے اس موقع سے فایدہ اُٹھا کر عرض کیا کہ شیخ آذری اپنے وطن کے دیدار کا بے حد مشتاق ہے، اور عرض کرتا ہے کہ اگر آپ اُس کو اجازت دیں تو وہ اس کے شکریہ میں اپنے سابقہ حج اکبر کا ثواب آپ کو دے گا۔ آپ اس خبر سے بہت خوش ہوئے اور اس کو اپنے پاس بلایا، اور خزانچی کو حکم دیا کہ سو[3] ہزار تنکہ[4] عطا کیے جائیں۔ اس پر شیخ نے عرض کی کہ آپ کے عطیوں کو خود آپ ہی کے بار برداری کے جانور اُٹھا سکتے ہیں، آپ ہنسے اور حکم دیا کہ اس کو

---

[1] اس شعر کو برہان مآثر میں اس طرح لکھا ہے: قصرِ معظم کہ ز فرطِ عظمت؛ آسماں پایہ مہ از سدہ آلہ، باقی حصہ اُڑ گیا ہے۔ عمارت پر کے شعر کے دیکھنے سے فرشتے کی تائید ہوتی ہے۔

[2] ملا شرف الدین مازندرانی شاہ نعمت اللہ ولی کرمانی کا مرید، بڑا عالم و فاضل اور مشہور، بے نظیر خوش نویس تھا۔

[3] برہان مآثر، فرشتے نے لکھا ہے کہ آپ نے اس کو چالیس ہزار تنکہ دیا تھا۔

[4] تنگہ، بہمنوں کے زمانے کا چاندی کا سکہ تھا جو وزن میں ایک تولہ ہوتا تھا۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے زمانے کے صوفیا، علما، شعرا اور سیاح

اخراجاتِ سفر کے لیے اور پچیس ہزار تنگے دیے جائیں[1] اس کے علاوہ شیخ کو خلعتِ خاص اور پانچ ہندی غلام بھی عنایت فرمائے۔ اور ملا شرف الدین[2] مازندرانی کو خوش خط لکھنے کے صلے میں آپ نے بارہ ہزار تنگے عنایت کیے۔

شیخ نے آپ سے جاتے وقت وعدہ کیا کہ جب تک وہ زندہ رہے گا بہمن نامے کی تصنیف جاری رکھے گا چنانچہ اس نے اپنی زندگی بھر بہمن نامہ اپنے وطن میں بیٹھ کر لکھا اور جب کسی قدر تیار ہو جاتا تو وہ وہاں سے آپ کے ہاں بھیج دیا کرتا تھا۔ سلطان ہمایوں شاہ بہمنی کے عہد تک بہمن نامہ اسی شاعر کا لکھا ہوا ہے اور بعد کے حالات ملا نظیری[3] و سامعی[4] اور دیگر شاعروں کے نظم کئے ہوئے ہیں جو سلطنتِ بہمنیہ کے خاتمے تک موجود تھے۔ بعض خود پرست شعرا نے یہاں تک اس کتاب میں تغیر کیا ہے کہ خطبۂ کتاب کے چند شعروں میں رد و بدل کر کے تمام کتاب کو اپنی ہی تصنیف قرار دے دی ہے۔ لیکن ان اشعار کے حُسن و خوبی میں اختلاف ہے جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ تمام اشعار ایک شاعر کی فکر کا نتیجہ نہیں ہیں۔ یہ رائے فرشتہ نے اپنی تاریخ میں ظاہر کی ہے۔

فرشتہ نے شیخ آذری کے مزید حالات یہ بیان کئے ہیں کہ شیخ اپنے وقت کا مشہور شاعر اور فہم و فراست اور ذکاوت میں مشہورِ آفاق تھا۔ ایک وقت شیخ آذری، شیخ صدرالدین کے ساتھ الغ بیگ مرزا کی ملاقات کو مشہدِ مقدس گیا۔ مرزا نے شیخ صدرالدین سے دریافت کیا کہ تمہارا تخلص رواسی سین سے ہے یا ثے سے۔ شیخ نے جواب دیا کہ رواص ہے جس کا املا صاد سے ہے۔ مرزا نے جواب دیا کہ تم وہ نہیں ہو، اس لیے کہ یہ لفظ صاد سے کلامِ عرب میں منقول ہے۔

---

[1] برہان مآثر۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ آپ نے اس کو سفر خرچ کے لیے بیس ہزار تنگے عنایت فرمائے تھے۔

[2] برہان مآثر۔ فرشتہ نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔

[3] یہ بہت بڑا شاعر اور لایق شخص گزرا ہے۔ اس کو ملک الشعراء کا خطاب تھا۔ محمود گاوان کی یہ بڑی عزت کرتا تھا، اور ان کو اپنا بزرگ سمجھتا تھا۔

[4] یہ بڑا زبردست شاعر اور علامہ وقت گزرا ہے محمود گاوان کا مصاحب اور اس کا مداح تھا۔ اس کے تفصیلی حالات کسی تاریخ میں نہ مل سکے۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے زمانے کے صوفیا، علما، شعرا اور سلاطین

اس کے بعد الغ بیگ مرزا نے شیخ آذری سے دریافت کیا کہ تمہارا تخلص آذری کس مناسبت سے ہے! شیخ نے جواب دیا کہ، فقیر ماہ آذر میں پیدا ہوا ہے، اس لیے اس کا تخلص آذری ہے! مرزا نے جواب دیا کہ تم شاعر پیشہ نہیں ہو جس آذر کا تم ذکر کرتے ہو، اس کے اوّل حرف کو ضمہ ہے نہ کہ فتح! شیخ نے فی البدیہ یہ جواب دیا کہ، ماہ آذر کی ذال عرصے تک ذلت و خواری کے عالم میں رہی۔ یہاں تک کہ اس کی پیٹھ دوتا ہو گئی۔ لیکن پھر اسے ادراک و شعور حاصل ہوا، اور سیدھی قایم ہو گئی! مرزا شیخ کے جواب سے بہت خوش ہوا، اور اُن کو اپنے مصاحبوں میں داخل کر کے انعام و اکرام سے ہمیشہ سرفراز کیا کرتا تھا۔ ضعیفی میں شیخ پر تصوف کا رنگ غالب آگیا تھا، وہ اسفراین سے حجاز چلا گیا۔ حج اکبر اور زیارت آستانۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فیض یاب ہو کر آپ کے ہاں بیدر حاضر ہوا۔ شیخ نے آپ کی مدح میں بہت سے قصاید لکھے جن کے صلے میں انعام و اکرام اور خطاب ملک الشعرا سے سرفراز ہوا، اور ایک عرصے تک بیدر میں رہنے کے بعد وطن کی محبت میں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا شہزادہ علاء الدین کی کوشش اور سفارش سے اسفراین روانہ ہوا۔ اسفراین میں اس نے خیر خیرات بہت کی اور پھر اپنے وطن میں جا کر بہت سی سرائیں تعمیر کرائیں اور عبادتِ الٰہی میں مشغول ہوا، یہاں تک کہ بیاسی ۸۲ سال کی عمر میں ۸۶۶ھ م ۱۴۶۲ء میں فوت ہوا۔ شیخ کی تصنیفات میں دیوان آذری، تاریخ انسان، کتاب عجایب الدنیا، جواہر الاسرار مشہور ہیں۔[1]

ان کتب کے علاوہ شیخ آذری کے اشعار سے اس کے مذاقِ سلیم کا پتہ بھی چلتا ہے۔ یہ صوفیانہ نکات اور حکیمانہ نصایح سے اپنی شاعری کو زینت دیا کرتا تھا۔ یہاں چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں جن سے مذکورہ بالا خیالات کی بہ خوبی تصدیق ہوتی ہے۔

به مجلسے که درو گنج بے بہا بخشند — ہزار افسر شاہی بہ یک گدا بخشند
دلا، بہ میکدہ روز و شب گدائی کن — بود کہ دُردکشاں جرعۂ بما بخشند
شدیم پیر بہ عصیاں و چشم آں داریم — کہ جرمِ ما بہ جوانانِ پارسا بخشند
غلامِ ہمتِ آں عارفانِ باکرمم — کہ یک صواب بہ بینند و صد خطا بخشند
بہ کوئے میکدہ از مفلسی چہ غم دارم — کہ ساقیانِ ہمہ جامِ جہاں نما بخشند
بہ نیم ساعتِ ہجر آذری نمی ارزد — ہزار سال گرش در جہاں بقا بخشند

[1] فرشتہ۔

ان کے علاوہ مولانا محمد گازرونی[1]، ملا احمد قزوینی[2]۔ میر ابوالقاسم جرجانی[3]، مولانا عبدالغنی ماندوی[4]، سلطان احمد شاہ مولانا نجم الدین[5]، مولانا احمد مقبول[6]، مولانا قاضی نظام الدین شرقی[7]، مولانا میاں محمود نظام الملک[8] وغیرہ ولی بہمنی کے زمانے کے علماء، و فضلاء، بیدر میں جمع ہو گئے تھے۔ آپ نے انعام و اکرام اور عہدہ ہائے جلیل القدر سے صوفیا، علما، شعرا اور ہتباع ان کی اس قدر عزت افزائی کی کہ انھوں نے بیدر کو اپنا وطن ہی بنا لیا اور ان کی اولاد دکنی اور

۱۔ یہ فیروز شاہ بہمنی کے زمانے میں گلبرگہ تشریف لائے تھے، بڑے عالم و فاضل تھے۔ فیروز شاہ نے ان کو اپنا مصاحب بنایا تھا، اور آپ کے زمانے میں بھی مصاحب رہے۔

۲۔ یہ فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں قزوین سے گلبرگہ آئے تھے، فاضل متبحر تھے انھوں نے علماء کے جلسے میں آپ کے اور فیروز شاہ کے استفسار پر سلاطین اسلام کی ترقی و تنزل کے اسباب پر ایک عالمانہ تقریر کی تھی، ان کی رائے میں زوال کے اسباب قیام شخصی و موروثی حکومت، سلاطین کی عیش و عشرت و عیاشی، آپس کی خانہ جنگی، عہدہ داروں کی باہمی مخالفت، سلاطین کی خود غرضی، تعصب مذہب، اسلامی اصول پر قایم نہ رہنا، اعلیٰ خدمات پر جہلا کا تقرر، رعایا کی تالیف قلوب و ہمدردی نہ کرنا، دشمن نو مسلموں کا مسایل شرعیہ میں اختلاف پیدا کرنا ہیں آخر میں جمہوریت کی تائید کرتے ہوئے انھوں نے رائے دی کہ متعدد آراء کے مطابق اگر جمہوری اصول بنائے جائیں تو سلطنت کا قیام ممکن ہے، ورنہ نہیں۔

۳۔ یہ علم منطق میں کامل اور امام الوقت تھے آپ کے زمانے میں گلبرگہ آئے تھے۔

۴۔ یہ عالم تھے آپ کے زمانے میں گلبرگہ تشریف لائے تھے۔ آپ نے انھیں صدر مقرر فرمایا تھا۔

۵۔ یہ بھی آپ ہی کے عہد میں گلبرگہ آئے تھے، عالم تھے آپ نے انھیں مفتی مقرر کر کے عزت افزائی فرمائی تھی۔

۶۔ یہ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے، انھیں آپ نے ملک العلما، کا خطاب دے کر صدر جہاں کے عہدے پر مقرر فرمایا تھا۔ یہ آپ ہی کے عہد میں بیدر آئے تھے۔

۷۔ یہ نبیرۂ سید اشرف تھے، انھیں آپ نے شرف جہانی کا خطاب عنایت فرمایا تھا۔ یہ بھی آپ ہی کے زمانے میں بیدر آئے تھے۔

۸۔ یہ شیخ بزرگوار شیخ فرید شکر بار کی اولاد سے تھے، یہ اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم اور فاضل گذرے ہیں، آپ نے انھیں ملک التجار خلف حسن بصری کی جگہ وکیل السلطنت مقرر فرما کر عزت افزائی کی تھی۔ یہ آپ ہی کے آخری عہد میں بیدر آئے تھے۔

معزز شمار کی جاتی تھی۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے زمانے کے صوفیا، علما، شعرا اور سیاح

تذکرۃ الملوک کے مولف کا بیان ہے کہ خواجہ[1] عماد الدین محمود گاوان خراسان سے آپ ہی کے عہد میں بہ غرضِ تجارت بیدر آئے اور دربارِ شاہی میں داخل ہو کر اپنی قابلیت سے خدمتِ دیوانی پر مامور ہوئے اور چار بادشاہوں کی خدمت انھوں نے انجام دی۔ اور ہمیشہ خیرخواہی اور نیکی سے مہماتِ سلطنت انجام دیا کرتے۔ یہاں تک کہ آخر محمد شاہ بن ہمایوں شاہ بہمنی کے زمانے میں انھوں نے شہادت پائی اور اپنا نیک نام دنیا میں چھوڑا۔

غرض آپ کے مبارک عہد میں صوفیائے کرام، مشائخینِ عظام، بزرگانِ دین، علماء و فضلائے دہر، شُعرائے نام دار، اور سیاحوں کی وجہ سے دارالسلطنت بیدر علوم و فنون کا مرکز اور رشکِ فارس و عراق بن گیا تھا۔ دنیا کا کوئی اہلِ کمال ایسا نہ تھا جو بیدر میں موجود نہ ہو۔ اور وہ آپ کی نوازشوں سے سرفراز نہ ہوا ہو۔ آپ کے عہد کی مشہور تالیف صرف دو کتابیں "بہمن نامہ" اور "منہل الصافی شرح وافی" ہیں۔ آپ کے زمانے کی علمی ترقیوں پر دکن، جس قدر بھی ناز کرے کم تھا۔ کیوں کہ انھی ترقیوں کی وجہ سے دکن اور سلطنتِ بہمنیہ کا نام تمام اسلامی دنیا میں روشن ہو گیا۔ اور اسلامی ممالک میں آپ کی اور آپ کی سلطنت کی جو قدر و منزلت تھی اس کی مثال دنیا میں ملنی مشکل ہے۔

---

[1] تاریخ فرشتہ اور برہان مآثر کے بیان کے مطابق خواجہ عماد الدین محمود گاوان آپ کے ولی عہد سلطان علاء الدین احمد شاہ دوم بہمنی کے آخری عہد میں بہ غرضِ تجارت بیدر تشریف لائے تھے۔ اور چار سلاطینِ بہمنیہ یعنے سلطان علاء الدین احمد شاہ دوم، سلطان ہمایوں شاہ بہمنی، نظام شاہ بہمنی اور محمد شاہ بہمنی میں عہدۂ دیوانی پر مامور رہے اور بہت سے کارِ نمایاں سلطنتِ بہمنیہ کے قیام اور استحکام کے لیے انجام دیئے۔ آخر ۸۸۶ھ میں شہید ہوئے۔ تذکرۃ الملوک کا بیان ہے کہ وہ آپ کے عہد میں بیدر تشریف لائے اور چار بادشاہوں کے زمانے میں رہ کر شہید ہوئے، غلط ہے اگر آپ کو ملایا جائے تو محمد شاہ پانچواں سلطان ہے اگر سلطان علاء الدین احمد شاہ دوم سے شمار کیا جائے تو محمد شاہ چوتھا سلطان ہے۔ پس اسی کے بیان سے اس کی تردید برہانِ مآثر اور فرشتہ کی تائید ہوتی ہے۔ ان کے مفصل حالاتِ زندگی کتاب محمود گاوان میں لکھے گئے ہیں۔

باب دہم

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے عہد میں فنونِ لطیفہ کی ترقی

ہر قوم کے فنِ تعمیر سے اس کی ضروریات کا اظہار ہوتا ہے چنانچہ تیرھویں اور چودھویں صدی کے اسلامی فنِ تعمیر سے مذہبی اور عمرانی ضروریات کا پتہ چلتا ہے مسلمان دوسرے ممالک کی طرح جب ہندوستان آئے تو وہ اپنے ساتھ فنی روایات بھی لیتے آئے اور اس فن کے شوق کو نمایاں کیا۔ بادشاہوں اور امیروں نے اس کے ارتقا میں خاص دلچسپی لی چنانچہ ہندوستان آنے کے بعد سب سے پہلے مسلمان حکمرانوں نے بہترین معماروں اور ماہرین فن کی سرپرستی کی اور ہندوستان میں پہلے سے جو فن موجود تھا اُسے اپنے فن میں شامل کر کے ایک نئی چیز پیدا کی اور اس طور سے جو طرزِ تعمیر یہاں قایم ہوئی اس کی مثال ان کے دیگر مفتوحہ علاقوں میں نہیں ملتی۔ مسلمانوں کی ابتدائی جماعتی زندگی کا اقتضا یہ تھا کہ اپنے فنِ تعمیر کے ذریعے اپنے آپ کو ظاہر کریں چنانچہ انھوں نے اپنے فن کے ذریعے سے اپنی جماعتی زندگی کا اظہار کیا۔ ہندوستان میں ابتداءً مسلمان فاتح کی حیثیت سے آئے تھے اس لیے ان کی ابتدائی عمارات میں جماعتی زندگی کے ساتھ ساتھ قوت کا عنصر بھی پایا جاتا ہے چنانچہ قطب الدین سے لے کر سلطان التمش تک کے فنِ تعمیر میں یہ عنصر قایم رہا۔ مثال کے طور پر ان کے عہد کی مسجد قوت اسلام' اور قطب مینار پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد خلجی عہد شروع ہوا جس میں امن اور استقلال حاصل ہو گیا تھا، اس لیے اس زمانے کے فن میں قوت کے ساتھ آرایش کے عنصر کا بھی اضافہ کیا گیا تھا۔ لہٰذا اس زمانے کے فنِ تعمیر میں قوت اور آرایش کے

لطان احمد شاہ بہنی کے عہد میں ن لطیفہ کی ترقی

عنصر ملے ہوئے ہیں۔ اس عہد کی عمارتوں میں نقش و نگار دیواروں اور کمانوں پر کسی قدر پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد عہدِ تغلق شروع ہوتا ہے۔ محمد تغلق کی فتوحات کا سلسلہ بہت وسیع تھا، اس لیے اس کے عہد میں بہت کم عمارتیں تعمیر ہوئیں ہیں۔ اس کے بعد فیروز تغلق کے زمانے میں سلسلۂ فتوحات موقوف ہوگیا اور امن و امان رہا۔ لیکن اس نے اپنے زمانے کی ضروریات کو پورا کرنے کی غرض سے بہت سی کم خرچ عمارات بنوائیں، ان عمارات میں قوت اور آرایش کے ساتھ ساتھ جمالیات کے عنصر کا بھی اضافہ کیا گیا تھا جو نمایاں طور پر ظاہر ہے۔

دکن جب تک خاندانِ خلجی اور تغلق کے تحت رہا اس کے فنِ تعمیر میں ان ہی کی نقل کی جاتی تھی اور ان ہی کے وضع کی عمارتیں تعمیر ہوا کرتی تھیں۔ محمد تغلق کے ہاتھ سے جب دکن نکل گیا اور خود مختار سلطنتِ بہمنیہ قایم ہوگئی تو اس نے خاندانِ خلجی اور تغلق کے فنِ تعمیر کی نقل کرنی چھوڑ دی، اور دکن کی مقامی خصوصیات کو اس نے برقرار رکھا اور اپنے اثر اور اپنی فاتحانہ شان کو اس میں شامل کر کے ایک جدید طرز پیدا کی جو بہمنی طرزِ تعمیر کے نام سے ہندوستان میں مشہور ہوئی۔ ان کے فنِ تعمیر میں آرایشی اور جمالیاتی عنصر پایا جاتا ہے۔

بیدر کے اسلامی فنِ تعمیر کی ابتدا آپ ہی سے شروع ہوتی ہے جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ آپ خاندانِ بہمنیہ کے نویں بادشاہ تھے اور دکن میں سلطنتِ بہمنیہ کو قایم ہوئے کافی عرصہ گذر چکا اور استحکام بھی حاصل ہوگیا تھا، لیکن بیدر کو آپ ہی نے آباد کیا تھا چونکہ آپ اپنی کثیر فتوحات کی وجہ سے ایک فاتحانہ شان رکھتے تھے اس لیے بیدر کے فنِ تعمیر میں آرایشی اور جمالیاتی عنصر کے ساتھ ساتھ فاتحانہ شان کو بھی نہایت نمایاں طور پر ظاہر کیا آپ کے زمانے کے فنِ تعمیر میں ایک خاص خصوصیت یہ پائی جاتی ہے کہ آپ نے مقامی اور ایرانی فنِ تعمیر سے مدد لے کر اس کو ایک ایسا جامہ پہنایا کہ اُس میں تمام عہدوں کے فنِ تعمیر کی خصوصیات پائی جاتی ہیں، لیکن وہ کسی سے نہیں ملتا، کیوں کہ اس کا طرز بالکل جدا اور نیا ہے، اس لیے وہ احمد شاہ کے زمانے کا بیدری فنِ تعمیر کے نام سے مشہور ہے۔

جس شخص نے یورپ کے قرونِ وسطٰی کے فوجی فنِ تعمیر کا مطالعہ کیا ہوگا وہ بیدر کے قلعے کو دیکھ کر کہے گا کہ یہ یورپ کے فنِ تعمیرِ قلعہ کی نقل، یا یوروپین معماروں اور انجینیروں کی

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے عہد [میں] فنونِ لطیفہ کی تر[قی]

مدد سے تعمیر کروایا گیا ہوگا۔ لیکن ان دونوں باتوں کا بھی پتہ کسی تاریخ سے نہیں چلتا۔ البتہ اس کا پتہ چلتا ہے کہ آپ کی قدر دانی سے اہلِ فن و کمال بیدر میں جمع ہو گئے تھے اور ترکستان، قسطنطنیہ، بغداد، ایران، عرب، روم اور شمالی ہندوستان کے نامی گرامی کاری گر بیدر میں آپ کے ہاں موجود تھے۔ آپ نے ان کے صلاح اور مشورے سے ان چیزوں کو اپنے ہاں کے فنِ تعمیر میں شامل کیا جو مقامی حالات و روایات کے لحاظ سے قلعوں کی تعمیر کے لیے ضروری تھیں۔ آپ نے اپنے فنِ تعمیر میں جہاں قوت کے اظہار کی ضرورت تھی وہاں اس کا اظہار کیا ہے، اور جہاں غیر ممالک کے فنِ تعمیر کے نقل کی ضرورت تھی اس کو اپنی خاص وضع میں ڈھال کر شامل کیا ہے۔ اس طرح پورے فنِ تعمیر کو ایسا بہتر بنایا کہ وہ خاص دکنی فن معلوم ہوتا ہے۔

غرض آپ نے قلعوں، عمارتوں اور گنبدوں کی تعمیر کی۔ ان میں ایک خاص طرز پیدا کی اور اس کے تحت اپنی تمام عمارات کو تعمیر کرایا۔ آپ کے زمانے کی عمارتوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں خاص کر ایرانی اثرات بہت ہیں اور وہ ایرانیوں کی بنائی ہوئی ہیں۔

فنِ تعمیر کے علاوہ آپ نے فنِ نقاشی اور خوش نویسی کی بھی سرپرستی کی اور اس کو اس قدر ترقی دی کہ اس کی مثال دکن میں ملنی مشکل ہے۔ اسلامی دنیا، اور خاص کر ایران کے اکثر مشہور خوش نویس اور نقاش آپ کی قدر دانی کا شہرہ سُن کر بیدر میں جمع ہو گئے تھے، ان کی وجہ سے بیدر میں ایسے ایسے نقاش پیدا ہوئے جن پر دکن جس قدر بھی ناز کرے کم ہے۔ آپ کے زمانے کا مشہور نقاش شکر اللہ قزوینی[1] اور مشہور خوش نویس ملا شرف الدین مازندرانی ہے۔ آپ نے اپنی داد و دہش اور قدردانی سے ان کا دل بڑھایا تھا۔

آپ نے ۸۲۹ھ سے ۸۳۰ھ م ۱۴۲۵ء سے ۱۴۲۶ء تک ایلچپور میں ایک سال قیام کر کے قلعۂ گاویل از سرِ نو تعمیر کرایا اور قلعۂ نرنالہ کے حصار کی مرمت کرائی جو گجرات، خاندیس اور مالوہ کی سرحد پر واقع تھے۔[2]

---

[1] اس نقاش کا نام آپ کے گنبد میں لکھا ہوا ہے اور گنبد کے اندر کی تمام نقاشی اسی کی کی ہوئی ہے۔

[2] فرشتہ۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے عہد میں فنون لطیفہ کی ترقی

بیدر کا مشہور و معروف قلعہ آرک کہلاتا ہے۔ یہ نہایت ہی مستحکم اور خوش نما عمارت ہے۔ مشہور معماروں اور لائق کاری گروں نے اسے اس طرح سے نہایت ہی محفوظ اور آپ کی قابل قدر یادگار بنانے کے لیے چھ[1] سال لگاتار کوششیں کیں۔ یہ قلعہ نہایت مستحکم و پائیدار اور سیاہ پتھر اور چونے سے تیار کیا گیا ہے۔ اس کا دور تین میل اور حصار کی بلندی پچاس فٹ ہے۔ اس کی خندق بہت ہی عریض یعنے پچھتر فٹ چوڑی اور پینتالیس فٹ عمیق ہے، اور اس میں یہ جدت کی گئی ہے کہ قلعے کے دروازے اور اکثر ان برجوں کے سامنے جن پر حریف کے حملے کا خوف ہو خندق میں بعض جگہ ایک ایک اور بعض جگہ دو دو مستحکم دیواریں ایسی بنائی گئی ہیں کہ ان سے خندق دو تین حصوں میں منقسم اور محصور ہو گئی ہے۔ ان دیواروں کا ابتدائی اور انتہائی حصہ حصار قلعہ سے ملا دیا گیا ہے۔ اور ان میں پانی کی آمد و رفت کے لیے دروازے بنا دیئے گئے ہیں۔ اس لیے قلعے کے اطراف دو دو اور تین تین خندقیں معلوم ہوتی ہیں۔ ان دیواروں پر اکثر چھوٹے چھوٹے بُرج بھی بنا دیئے گئے ہیں اور قلعے سے وہاں آمد و رفت کے لیے بہ قدر ضرورت راستے بھی تیار کیے گئے ہیں۔

قلعے کے دروازے کے سامنے تھوڑی دور تک اس قسم کی تین خندقیں ہیں اور ان کی درمیانی دیواروں پر کئی بُرج ہیں، اور ہر بُرج پر توپیں موجود ہیں۔ قلعے کا حصار نہایت ہی پختہ ہے، اس میں بیدر کا نرم پتھر نہیں لگایا گیا ہے بلکہ دور دراز مقامات سے بہ صرف زر کثیر صاف، سیاہ پتھر منگوا کر اس کی تعمیر کی گئی ہے۔ حصار کنگرہ دار ہے اور اس پر برج اور تلبریاں بہت خوش نما بنائی گئی ہیں۔ ان کی بلندی پندرہ گز ہے۔ قلعے کے تین دروازے ہیں، پہلا دروازہ گو اونچا اور پائیدار بھی ہے مگر اس پر کسی قسم کا نقش و نگار نہیں ہے، اور نہ چینی کے حروف میں کسی قسم کی تحریر ان پر نمایاں ہے۔ البتہ اس کی دائیں پشت پر آہنی تختی کا ایک کتبہ ہے جو اورنگ زیب کے زمانے کا لکھا ہوا ہے، اس دروازے تک پہنچنے کے لیے اسی سابق الذکر خندق پر سے گزرنا پڑتا ہے، یہاں اس پر پختہ پل بنا ہوا ہے۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی

---

[1] تاریخ خورشید جاہی میں ڈھائی سال لکھا ہے جو غلط ہے۔ فرشتہ اور برہان مآثر کی روایت صحیح معلوم ہوتی ہے۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے عہد میں فنونِ لطیفہ کی ترقی

دو طرف پختہ کمرے ہیں جو غالباً جوانانِ پہرہ کی نشست گاہ ہونگے[1] ان کے ساتھ ہی قلعے کا دوسرا دروازہ نظر آنے لگتا ہے، یہ دروازہ بھی شان دار ہے۔ اس پر شرزہ کی دو مورتیں ہیں۔ اور یہ چینی کے نقش و نگار ہیں، بالائی حصے پر چینی سے خطِ طغرا میں کتبہ لکھا ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محمود شاہ بن محمد شاہ بہمنی کے زمانے کا بنایا ہوا ہے۔ اس دروازے کے دونوں پٹ علٰحدہ ہوگئے ہیں۔ پہلا دروازہ "شرزہ دروازہ" کہلاتا ہے، حالانکہ مورتوں کے لحاظ سے دوسرا دروازہ اس نام کا مستحق تھا۔

دوسرے دروازے سے برجوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جن میں سے بعض ایسے ہیں جو خندق کی درمیانی دیواروں پر بنائے گئے ہیں، اور اُن کے نیچے سے خندق کا کچھ حصہ کاٹ کر نکالا گیا ہے، یہاں سے تیسرا دروازہ کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ یہ دروازہ بھی مثل دوسرے دروازوں کے شان دار ہے اور اس پر ایک بہت بڑا اور نفیس گنبد بنا ہوا ہے جس کی مناسبت سے یہ "گنبد دروازہ" کہلاتا ہے، مگر اس پر نقش تحریر وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ اس کے متصل اسی وضع کی تین خندقیں ہیں، اور اسی تراش و خراش کی سنگی حصار ہے جیسا کہ پہلے دروازے کے پاس ہونا بیان کیا گیا ہے، گویا اصل قلعہ اسی دروازے سے شروع ہوتا ہے۔ پہلا اور دوسرا دروازہ اصل قلعے میں داخل نہیں ہے، بلکہ قلعے کی محافظت کے لیے سنگی حصار[2] اور

---

[1] ۔ آج کل ان کمروں میں غریب لوگ رہتے ہیں۔

[2] ۔ حصارِ قلعہ پر اور اس کے کثیر التعداد عظیم الشان برجوں پر پانچ پانچ، چھ چھ گز کی توپیں رکھی ہوئی ہیں۔ ایک جگہ سات گز کی بھی توپ موجود ہے، ان تمام توپوں پر آدھے آدھے انچ کے موٹے حروف میں قرآن پاک کی آیتیں و کلمات طیبات بادشاہِ وقت کا القاب، تاریخ بنا، گولے کی مقدار اور ہدایتیں خطِ طغرا میں کندہ ہیں، اور ان میں عمدہ سونا بھرا گیا ہے۔ زیادہ نگرانی نہ رہنے کی وجہ سے بعض خود غرض اور ناعاقبت اندیشوں نے اکثر جگہ کا سونا نکال لیا ہے خصوصاً حروف کے اطراف جو موٹی جدول اور نقش و نگار تھے ان میں اب مطلق سونا باقی نہیں رہا ہے۔ باقی چھوٹے چھوٹے برجوں پر ہر قسم اور ہر وضع کی چھوٹی توپیں رکھی ہوئی ہیں، یہ توپیں آپ کے بعد کے زمانے کی معلوم ہوتی ہے۔ یہ جو مشہور ہے کہ قلعہ بیدر کی بعض بڑی بڑی توپوں میں گدھا جاتا ہے اور پھر واپس آجاتا ہے، یا یہ کہ آدمی اس کے اندر بیٹھ کر شملہ باندھ سکتا ہے، محض لغو ہے۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے عہد میں فنونِ لطیفہ کی ترقی

خندق ول کے ساتھ بنایا گیا ہے اس دروازے کے ساتھ ہی شاہی محلات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو بعد کے تعمیر شدہ معلوم ہوتے ہیں۔

ان محلات کے قریب ایک شان دار اور خوش نما وسیع مسجد واقع ہے اس کو "سولہ کھم کی مسجد" کہتے ہیں، اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ محراب اور منبر کے دونوں بازو دو طویل دالان ہیں اور ان میں پختہ اور بالکل مقررہ فاصلے پر سولہ کھم نصب ہیں۔ ان میں سے ہر ایک گول کھم کا قطر چار فٹ تین انچ ہے، اور کل مسجد ۲۹۵ فٹ لمبی اور ۷۷ فٹ چوڑی ہے۔

مسجد کا عرض چار دالان در دالان پر ختم ہوتا ہے، مگر ہر دالان اس عظیم الشان عمارت کے پیش دالان سے زیادہ وسعت نہیں رکھتا۔ محراب والا حصہ گنبد نما اور زیادہ تر بلند ہے، اور اس کی وسعت عرض میں دو دالان اور طول میں چار کھم کے برابر ہے۔ اب صرف یہی حصہ آباد ہے جو پیش دالان کے ساتھ بقیہ مسجد سے علٰحدہ کر لیا گیا ہے۔ اس غرض کے پورا ہونے کے لیے پیش دالان میں جو دیواریں بنائی گئی ہیں، حال کی ہیں، اور ان میں کئی عالم گیری عمارات کے کتبے نصب کر دیئے گئے ہیں۔ بازو کے دالان ویران چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ ستون اس صنعت سے بنائے گئے ہیں کہ جس پہلو سے دیکھا جائے وہ ایک ہی شمار اور ایک ہی قطار میں نظر آتے ہیں۔ مسجد کی چھت پر نہایت عالی شان گنبد بنا ہوا ہے جس پر چڑھنے کے لیے سیڑھیاں موجود ہیں۔ گنبد نما حصے کے سامنے موذن کے لیے ایک جگہ بنا دی گئی ہے، اور وضو کرنے کے لیے آہنی خزانہ نصب کر کے اس میں ٹوٹیاں لگا دی گئی ہیں جو حال کی معلوم ہوتی ہیں۔

اس مسجد کے قریب ہی آپ کا عظیم الشان "تخت محل" جس کو آپ نے اپنی نشست اور دربار کے لیے بنایا تھا عبرت کی مجسم تصویر بنا ہوا ایک کھنڈر کی صورت میں ہے اور اس کے ساتھ ہی بے ثباتیٔ عالم کے نقشے صفحۂ دل پر کھنچ جاتے ہیں اور وہ لازوال قوت یاد آجاتی ہے جس نے عشرت کدے کو عبرت کدہ بنا دیا ہے۔ اس محل کی ٹوٹی پھوٹی دیواروں اور گری ہوئی چھتوں کا ڈھیر اب تک اس عظمت و شوکت کا ضامن بنا ہوا ہے، اور قسم قسم کی رنگین دیواروں کی محفوظ مٹی اس کی رعنائی کا پورا پورا ثبوت دے رہی ہے۔ بعض دیواریں اور کمرے اب تک بھی باقی ہیں، مگر بے حد شکستہ حالت میں ہیں۔ محل کا عظیم الشان دروازہ

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے عہد میں فنون لطیفہ کی ترقی

ان کی رفاقت کر رہا ہے، اور آپ کی سلطنت کی عظمت وسطوت کی بولتی ہوئی تصویر ہے۔ اس کی شان دار اور بلند کمان اپنے طرز میں ایرانی شان لیے ہوئی ہے، اور اُن ماہرین تعمیر کی یاد دلاتی ہے جو آپ کے زمانے میں دور دراز ممالک اور خصوصاً ایران سے آکر اپنی کاری گری کی یادگار بن سرزمین بیدر پر چھوڑ گئے تھے! اس محل میں متعدد چیزیں ایسی موجود ہیں جن سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں بیدر اور سرزمین دکن پر ایرانی اثرات مختلف شکلوں میں بہ خوبی قایم ہوئے تھے، چنانچہ کارکاشی کے نمونے اب بھی اس محل کے مختلف حصوں میں جگہ جگہ باقی ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ عمارت بوقلمون رنگوں کے روغن دار اینٹوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ روغن کی چمک اور جلا ابھی تک اس طرح قایم ہے کہ دیکھنے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ کاری گر ابھی کام کر کے گیا ہے۔

یہ وہی عمارت ہے جو ۸۳۶ھ م ۱۴۳۲ء میں تیار ہوئی تھی، اس پر ایک جگہ شیخ آذری کا حسب ذیل قطعہ کندہ ہے جو اس نے اس کی تعریف میں کہہ کر مورد الطاف شاہی ہوا۔

حبذا قصر مشید کہ ز فرط عظمت　　آسماں سدہ از پایۂ ایں درگاہ است
آسماں ہم نہ تواں گفت کہ ترک ادب است　　قصر سلطان جہاں احمد بہمن شاہ است

اور دوسری جگہ ایک شیر بنا ہوا ہے، جس کے پیچھے سے آفتاب نمودار ہو رہا ہے۔ یہ شیر اور آفتاب بالخصوص ایرانی علامات ہیں اور یہ بھی ایرانی اثر کو صاف صاف نمایاں کرتی ہیں۔

تخت محل اور اس کے اطراف میں عمارات کے نشانات بہ کثرت پائے جاتے ہیں، کچھ عرصہ قبل اس کے اطراف کا تمام حصہ ناگ پھنی سے ڈھکا ہوا تھا، لیکن سر رشتۂ آثار قدیمہ کی توجہ سے تمام قلعے کو ناگ پھنی اور خود رو پودوں سے پاک وصاف کر دیا گیا ہے۔ نیز تخت محل اور اس کے اطراف میں اکتشافی (کھدائی) کام کیا جا رہا ہے جو نہایت مفید ثابت ہوا ہے۔ مختلف مقامات پر زمین میں سے بڑی بڑی عمارتوں کی دیواریں اور بڑے بڑے ہالوں کے کھنڈر نکلے ہیں جو غالباً شاہی دربار کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ تخت محل اور اس کے اطراف میں اعلےٰ قسم کی شاہی عمارات تھیں۔

تخت محل کے عقب میں ایک مقام ہے جو "ہزار کوٹھڑی" کے نام سے مشہور ہے

لطان احمد شاہ بہمنی کے عہد میں ن لطیفہ کی ترقی

یہ سطح زمین سے بہت بلند ہے، اور کچھ عجب نہیں کہ اس کے نیچے بڑے بڑے تہ خانے ہوں۔ اس مقام پر جدید اکتشافات میں دیواروں کے جو حصے برآمد ہوئے ہیں ان پر بھی کارکاشی کے بہترین نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ اگر ملک میں تاریخی تحقیقات اور قدیم آثار سے دلچسپی کی رفتار یہی رہی تو قریب ہی میں کچھ عجب نہیں کہ آپ کے اور بہمنیوں کے متعلق اس قلعے اور اس کے اطراف وجوانب میں معلومات کا نہایت مفید انکشاف ہوگا۔

قلعے میں متعدد باولیاں اور ایک تالاب بھی ہے، جس کو تالاب بمکندہ[1] کہتے ہیں۔ اس کے اطراف ترکاریوں وغیرہ کی کاشت ہوتی ہے۔ یہاں کی ہوا بہت ہی صاف اور یہاں کا نظارہ بہت ہی دل خوش کن ہے۔ اس کے قریب ایک چھوٹی سی آبادی ہے جس کو

---

[1] اس تالاب کو آپ نے قلعے کی تعمیر کے ساتھ بنوایا تھا۔ اس کی مفصل تفصیل میں نے پایہ تخت کی تبدیلی میں بیان کی ہے۔

اس تالاب کے کنارے شمالی حد پر ایک قدیم مگر چھوٹا سا دیول ہے اس کو "دیول و بر سنگپا" کہتے ہیں۔ راجہ امر سنگھ والیِ ورنگل جس کے زیر حکومت بیدر تھا، سال میں ایک مرتبہ ضرور یہاں پوجا کے لیے آتا تھا۔ دیول کے عقب میں گو کوئی برج نہیں، مگر نو گز کی توپ رکھی ہوئی ہے۔ اس کا قطر صرف ڈیڑھ گز ہے۔ تالاب کے شرقی کنارے پر ایک چھوٹا سا پرانا قلعہ ہے، اس کی بنا داسی راجہ امر سنگھ نے ڈالی تھی، جب آپ نے بجائے گلبرگے کے بیدر کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا تو اسی چھوٹے قلعے سے متصل یہ عظیم الشان قلعہ ارک تعمیر کرایا۔ اسی راجہ امر سنگھ کے زمانے کی دوسری یادگار وسط شہر بیدر میں ایک قدیم بینار قایم ہے جس کے چاروں طرف کشادہ سڑکیں ہیں اور یہ نام "چوبارہ" موسوم ہے اس مینار پر سے بیس بیس کوس تک کا جنگل نظر آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مینار ایک بہت بڑے عالی شان مندر کا چراغ دان تھا جس کو راجہ نے بہ صرف کثیر تیار کرایا تھا۔

بادشاہانِ اسلام کی بے تعصبی کی یہ ایک اعلیٰ نظیر ہے کہ آپ نے اس چھوٹے سے قلعے اور مینار کو قایم اور برقرار رکھا۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے عہد میں فنونِ لطیفہ کی ترقی

"ڈال ڈھوڑی" کہتے ہیں۔

بیدر سے دو تین میل کے فاصلے پر آپ کا آباد کردہ قریہ نعمت آباد واقع ہے۔[1] آپ نے یہاں ایک مسجد اور قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ یہ قلعہ نامکمل حالت میں اب تک موجود ہے، اس مقام کے قلعہ اور مسجد کے متعلق مشہور ہے کہ یہاں آپ نے تمام شہزادوں اور امیروں کے ساتھ آکر میر نور اللہ بن شاہ خلیل اللہ کا استقبال کیا، اور ان کو نہایت تعظیم و تکریم کے ساتھ شہر میں لے آئے اور اس مقام پر جہاں شاہ صاحبؒ سے ملاقات ہوئی تھی شاہ نعمت اللہ ولی کرمانی کے نام پر قریہ موسوم بہ "نعمت آباد" آباد کر کے ایک مسجد اور قلعے کی بنا ڈالی جو آپ کے زمانے میں تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔

آپ کا گنبد بیدر سے ایک کوس کے فاصلے پر موضع اشٹور کے میدان میں واقع ہے، یہ گنبد گلبرگہ شریف کے گنبدوں کے مشابہ ہے لیکن ان سب سے عالی شان اور نہایت خوش نما ہے۔ اس کی کرسی ہر ایک جانب پانچ فٹ ہے، اس کی ہر ایک دیوار بارہ فٹ موٹی ہے اور اور اس میں چار چار کمانیں ۲۷، ۲۷ فٹ اونچی ہیں۔ گنبد کی رفعت زمین سے ایک سو بیس فٹ ہے اور طول اور عرض ساٹھ ساٹھ فٹ ہے۔ اس کے اندر رنگ بہ رنگ کے نقش و نگار ہیں جو ایرانی طرز کے ہیں اور اپنی بہترین طرز اور عمدہ رنگ کی وجہ سے ہندوستان میں لاثانی ہیں، طلائی طغرے قابلِ دید ہیں۔ فارسی اشعار اور عربی آیات نہایت خوش خط تحریر کی گئی ہیں۔ یہ تمام نہایت چمک دار، سرخ یا گہرے نیلے رنگ کی زمین پر ہیں۔ فارسی اشعار اور عربی آیات نہایت خوش خط دنیا کے تمام معلومہ طرزِ تحریروں میں یعنی خطِ کوفی، طغرا اور نسخ وغیرہ میں لکھی ہوئی ہیں۔ اوپر کے حصے یعنی چھت میں جہاں خطِ کوفی میں آیاتِ قرآنی طلائی حروف میں لکھے ہوئے ہیں، وہاں بہ جائے نقطوں کے ہیرے نصب ہیں جو تاریکی میں یا دھوپ کے وقت مانند آئینے کے چمکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، ان جواہرات اور کتبوں کی جلا امتدادِ زمانہ کی وجہ سے کچھ مدھم سی ہو گئی ہے، لیکن اب بھی دیکھنے والوں کی آنکھوں کو خیرہ کرتی اور حیرت میں

---

[1] فرشتہ۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے عہد میں فنونِ لطیفہ کی ترقی

ڈالتی ہے ۔اس گنبد کے عالی شان دروازے پر بھی یہی آیاتِ قرآنی خطِ طغرا میں لکھی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ گنبد کے باہر جہاں چونے کے پھول اور نقش و نگار ہیں ان میں بھی آیاتِ قرآنی تحریر ہیں۔اندرونِ گنبد کا تمام کام آپ کے زمانے کے مشہور نقاش شکر اللہ قزوینی کا کیا ہوا ہے۔ یہ کام آپ کے عہد کی نقاشی اور خوش نویسی کا بہترین نمونہ ہے، جس کی مثال دکن میں نہیں ملتی۔اس نقاشی اور تحریروں میں ایک طرف شاہ خلیل اللہ کا شجرۂ خلافت اس طرح پر لکھا ہے:۔

"محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔علی مرتضی بن ابی طالب۔حسن بصری۔حبیب عجمی۔داؤد طائی۔
معروف کرخی۔سر سقطی۔جنید بغدادی۔ابو علی رود باری۔ابو علی الکاتب۔ابو عثمان المغربی۔
الشیخ ابوالقاسم۔ابو بکر انشاخ۔احمد الغزالی۔ابوالفضل البغدادی۔ابو برکات۔ابو سعید الاندلسی۔
ابو مدین المغربی۔الفتوح السعیدی۔کمال الدین الکوفی۔صلح البربری۔عبداللہ الیافعی۔
شاہ نورالدین نعمت اللہ ولی۔شاہ خلیل اللہ۔سلطان احمد شاہ ولی البہمنی۔"

اس کے علاوہ دوسری طرف آپ کا سنِ و تاریخ وفات ۲۹ رذ لحجہ ۸۳۹ھ نقاش شکر اللہ قزوینی کا نام اور حسب ذیل فارسی اشعار لکھے ہوئے ہیں۔اس کے علاوہ صدہا آیات قرآنی اور فارسی اشعار ہیں جو بلندی اور امتدادِ زمانہ کی وجہ سے پڑھے نہیں جاتے:۔

تا محیط دیدہ برز موج عشق ہفت دریا را چو سیلی دیدہ ام
نعمت اللہ یافتم در ہر وجود با ہمہ عشقی و میلی دیدہ ام
نعمت اللہ در ہمہ عالم یکیست لا تجد مثلی و مثلی لا یجد

اس گنبد کی تیاری کے متعلق دو روایات مشہور ہیں۔ایک یہ کہ آپ نے اس کو اپنے زمانے میں تعمیر کروایا تھا۔دوسرے یہ کہ آپ کے انتقال کے بعد آپ کے ولی عہد سلطان علاء الدین احمد شاہ دوم نے تختِ سلطنت پر جلوس فرماتے ہی آپ کے گنبد کی تعمیر شروع کرائی تھی، مگر تاریخ و سنہ وفات گنبد کے اندر تحریر ہونے سے یہ یقینی معلوم ہوتا ہے کہ اندر کا تمام کام اور نقاشی علاء الدین احمد شاہ دوم نے کرائی تھی، کیوں کہ تاریخ و سنہ وفات انتقال کے بعد تحریر کی جاتی ہے، نہ کہ پہلے، اور یہ خیال بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ تمام نقش و نگار اور

کام آپ ہی نے کروائے ہوں گے، اور اس میں آپ کے انتقال کے بعد علاءالدین احمد شاہ دوم نے سلطان احمد شاہ تاریخ و سنہ وفات کا اضافہ کرایا ہوگا۔

ولی بہمنی کے عہد میں فنونِ لطیفہ کی ترقی

غرض یہ گنبد اس وقت تیار ہوا جب بیدر شباب پر تھا، اور شاہانہ بہمنیہ اپنے نشۂ سلطنت میں سرشار تھے، اور تہذیب و تمدن کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ اس کی تیاری میں لاکھوں روپیے صرف کیے گئے اور زمانے کی صناعی اور اعلیٰ کاریگری اس میں ختم کی گئی۔

چنانچہ یہ گنبد بیدر کے کل گنبدوں میں جو بادشاہوں نے بنوائے ہیں نہایت ممتاز اور قابلِ دید شمار کیا جاتا ہے۔ اکثر سیاحوں اور ماہرین کا بیان ہے کہ ایسا لاجواب اور خوش نما کام ہندوستان بھر میں کسی عمارت میں نہیں ہے، اس کی رفعت و شان اور سنہری نقش و نگار اس کے بانیوں کی ترقی و ہنرمندی اور کمال کو یاد دلاتے ہیں گو امتدادِ زمانہ نے ان عالی مقام بادشاہوں کی یاد دل سے بھلا دی ہے لیکن اب بھی یہ گنبد اُن کے عظمت و جبروت اور کارہائے نمایاں کی یاد تازہ کرتا ہے۔

دنیا میں بہت سے آثارِ قدیم کس مپرسی کا شکوہ کرتے کرتے ویران اور بے نشان ہو چکے ہیں، لیکن اقبال خداوندی آقائے ولی نعمتی حضرت اقدس و اعلیٰ کی وجہ سے جب سے کہ سررشتۂ آثارِ قدیمہ قایم فرمایا گیا ہے یہاں کے کل گنبدوں کی ترمیم و درستی ہونے لگی ہے، اور اُن کو محفوظ اور برقرار رکھنے کی تجاویز عمل میں لائی جا رہی ہیں۔

آپ کے زمانے کی دیگر مشہور عمارتوں میں حضرت بندہ نواز گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور عالی شان اور قابلِ دید گنبد گلبرگہ میں ہے اس گنبد شریف کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے دو سال بعد آپ نے تعمیر کرایا تھا جو سات سال کی مدت میں مکمل ہوا تھا۔ یہ گنبد بھی بہت بڑا اور بلند ہے، لیکن آپ کے گنبد کے جیسا بلند نہیں ہے۔ اس کے اندر طلائی کام اور آیاتِ قرآنی لکھی ہوئی ہیں، لیکن یہ کام آپ کے گنبد کے کام کے جیسا نہیں ہے۔

یہ تمام حسب بالا عمارات اور قلعے آپ ہی کے عہد میں تعمیر ہوئے تھے، اور ان میں آرائش اور نمائش کے وہ تمام عنصر بہ درجۂ کمال پائے جاتے ہیں جو ابتدا میں بیان کیے گئے ہیں، اور یہ تمام دکن کی بہترین صناعی کا نمونہ ہونے کے علاوہ مسلمانوں کے عماراتی مذاق کی

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے عہد میں فنون لطیفہ کی ترقی

ترجمان اور ملکِ دکن کے گذشتہ عظمت و جلال کے نشان ہیں۔ یہ وہ مایۂ ناز باقیاتِ سلف ہیں جن کی خوبیاں مغربی سیاحوں اور آثارِ قدیمہ کے مبصروں کو دکن کی پُر اسرار سرزمین میں ایک زمانے سے کھینچ کھینچ کر لا رہی ہیں۔ چونکہ یہ یادگارِ سلف آثار ایک عظیم الشان قومی میراث کی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے ان کی حفاظت و صیانت کی تدابیر میں سرکار عالی کی قابل تحسین فیاضیاں کارفرما ہیں۔

باب یازدہم

بہ حیثیت ولی ہونے کے سلطان احمد شاہ ولی بہمنی سے دکنیوں کی عقیدت

آپ کے گنبد[1] کے خادموں کو متعدد گاؤں بہ طور جاگیر دیے گئے تھے۔ لیکن اب کوئی گاؤں خادموں کے پاس نہیں ہے۔ امتداد زمانہ اور تغیر حالات کے سبب کے سبب گاؤں شریک خالصہ ہوگئے ہیں، اب صرف چند بیگے زمین باقی ہے جو چھ خادموں میں باہم منقسم ہے۔ یہاں سرکار سے ایک داروغہ اور چھ خادم مقرر ہیں اور سالانہ عرس کے لیے ایک سو تیس روپیے عطا ہوتے ہیں۔ داروغہ کو ماہانہ دس روپیے اور چھ خادموں کو ماہانہ چار چار روپیے تنخواہ بہ مد یومیہ جو ماہا صدر خزانہ بیدر سے ملتی ہے اور روشنی کے لیے ماہانہ چھ روپیے ملتے ہیں۔ شب میں گنبدوں میں روشنی اور روزانہ صفائی کی جاتی ہے۔ یہاں ان خادموں کی اولاد وغیرہ کو ملاکر تقریباً سو نفوس کی آبادی ہے، اس قلیل تنخواہ پر ان لوگوں کی گذر نہیں ہوتی ہے اس لیے پیٹ پالنے کے لیے اکثر اور پیشے کرتے ہیں۔ بعض ملازم ہیں، اور بعض گنبد کے آستانے پر سر لگائے پڑے رہتے ہیں۔

---

[1] گنبد کے مفصل حالات ”سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے زمانے کا فن تعمیر“ میں بیان کیے گئے ہیں۔

بہ حیثیت ولی ہونے کے خاص و عام میں آپ کا گنبد نہایت عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے جو عہدہ دار یا
سلطان احمد شاہ امیر یا سیاح بیدر آتا ہے وہ آپ کے گنبد میں ضرور حاضر ہوتا ہے۔ اورنگ زیب جیسے
ولی بہمنی سے اولوالعزم اور زبردست بادشاہ کو بھی اس گنبد ذی شان کے آستانے پر سرِ نیاز
دکنیوں کی عقیدت جھکانے میں کوئی عار نہیں ہوا۔ قلعہ دارانِ بیدر اور تعلقدارانِ ضلع دل سے آپ کے
ارادت مند اور معتقد اور ہمیشہ ادب سے فاتحہ پڑھتے اور نذریں چڑھایا کرتے رہے ہیں۔

عرس آپ کا سال بھر میں ایک دفعہ ہولی کے بعد ہوتا ہے۔ آپ کی وفات بہ اعتبارِ روایت مقامی ۲۸ رجب ۸۳۹ھ کو ہوئی، اس لیے آپ کا صندل ہر سال اسی تاریخ کو ہوتا ہے، اس کو صندلِ خاص کہتے ہیں۔ مگر عرس اس تاریخ کو نہیں ہوتا، کیوں کہ مسلمانوں کے قمری مہینے کبھی کسی موسم میں آجاتے ہیں اور کبھی کسی موسم میں، اور اس طرح زایرین اور مسافرین کو جو اضلاع اور دیہات سے آتے ہیں اور جو خاص کر زراعت پیشہ ہوتے ہیں سخت تکلیف ہوتی ہے۔ اس لیے یہ قرار پاگیا ہے کہ عرس ہر سال ہولی کے بعد ہوا کرے، کیوں کہ ان دنوں میں زایرین زراعت کا کام ختم کرکے فارغ ہوتے ہیں۔ پس جس قمری مہینے میں ہولی آتی ہے اس مہینے کی بیس تاریخ کو عرس کے رسومات کا آغاز ہوتا ہے، یعنے اس تاریخ کو گنبد پر روشنی کرنے کے لیے چڑھنے کو سول یعنے موٹا رسا ڈالا جاتا ہے۔ سول ڈالے جانے کی تاریخ سے دور و نزدیک سے لوگوں کی آمد شروع ہوتی ہے اور دکانیں بھی قایم ہونی شروع ہوتی ہیں۔

موضع ماڈھیال ضلع گلبرگہ سے ایک جنگم[1] دو تین سو آدمی، کئی اونٹ اور کئی گھوڑوں

---

[1] ۔ قوم لنگایت کے مذہبی پیشوا کو جنگم کہتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ موضع ماڈھیال میں آپ کا چلہ ہے جہاں یہ جنگم یہاں سے جانے کے بعد عرس کیا کرتا ہے۔ اس کو اس کے لیے زمینات اور رسوم بھی سرکار سے مقرر ہیں۔

کے ساتھ اسی تاریخ کو آتا ہے۔ یوں تو رسومات عرس کا آغاز اس کے نہ آنے سے رکتا نہیں بہ حیثیت ولی ہونے کے لیکن جب تک یہ نہ آئے ہنود نہیں آتے، اس کے آتے ہی ہر طرف سے سلطان احمد شاہ ہزار ہا مخلوق زیارت اور حصول مراد کے لیے آتی ہے۔ یہ جنگم لوازم شاہی ولی بہمنی سے یعنی ماہی مراتب، آفتاب گیروں اور جھنڈے اور باجے سے یہاں آکر ہر روز دکنیوں کی عقیدت درگاہ میں سنکھ پھونکنا، ناریل پھوڑنا، اور درگاہ شریف کے اندر مزار پر پھول چڑھاتا اور فاتحہ پڑھتا ہے۔ اس جنگم کی ظاہری حالت ایک صوفی منش کی سی ہے۔ سر پر کلاہ مشائخی اور جُبّہ پہنے ہوئے، پیر میں کھڑاویں، ہاتھ میں عصا اور کاندھے پر کمبل رکھتا ہے، اور ڈاڑھی شریعت اسلامی کے بہ موجب بڑی سی اور لبیں تراشیدہ بالکل مسلمان شیخ بنا ہوا، کروفر سے آتا ہے۔ مسلمان تو اس کے چنداں معتقد نہیں لیکن ہنود اس سے بہت اعتقاد رکھتے اور ہندوؤں سے اس کو بہت آمدنی ہوتی ہے، ہر ہندو مرد یا عورت اپنی حسب حیثیت پیسہ، دو پیسے نذر کر کے اس کی قدم بوسی حاصل کرتا ہے اور یہ ۲۶ر تاریخ کو واپس چلا جاتا ہے۔ اس کے جانے کے دوسرے روز سے عرس کا اختتام شروع ہو جاتا ہے۔ یہ ایک قدیم سلسلہ ہے جو اس کے آبا و اجداد سے چلا آتا ہے، لیکن اس کی اصلیت کیا ہے اور کیوں یہ دستور قدیم سے ہے اس کا کچھ پتہ کسی تاریخ سے نہیں چلتا ہے۔ لوگوں کے اس کے متعلق مختلف بیانات ہیں لیکن چونکہ وہ سب پایۂ اعتبار سے گرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اس لیے میں ان کو یہاں تحریر کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔

۲۲ر تاریخ کو سرکاری صندل قلعۂ بیدر سے نکل کر جلوس کے ساتھ درگاہ پر آتا ہے۔ جمعیت پولیس و نظم، بیانڈ باجہ اور عہدہ داران سرکاری وغیرہ صندل کے ساتھ رہتے ہیں۔ مالی، کوتوالی اور عدالتی عہدہ داران تو قبل عرس کے لحاظ سے اختتام عرس تک حوالیٔ گنبد میں خیمہ جات نصب کرا کر قیام پذیر رہتے ہیں، اور پولیس کا خاص انتظام ہوتا ہے، رات اور دن سپاہی گشت کرتے رہتے ہیں، اگر کوئی قصور یا شرارت کے باعث قابل سزا ہوتا ہے تو اس کا چالان کر کے سزا دلائی جاتی ہے۔

بحیثیت ولی ہونے کے سلطان احمد شاہ ولی بہمنی ہے گنبد کی عقیدت

۲۲ سے ۲۵ تاریخ تک عرس نہایت دھوم دھام سے ہوتا ہے۔ ہر طرف سے خلقت اس کثرت سے آتی ہے کہ جس کا کچھ حد و حساب نہیں۔ ہر قسم کی دکانیں اور ہر قسم کا سودا اور تفریحی سامان نہایت افراط سے مہیا ہوتا ہے۔ عرس میں چار روز تک میلہ نہایت دھوم دھام سے ہوتا ہے، درگاہ سے لے کر سلطان محمود شاہ بہمنی کے گنبد تک دونوں طرف دکانیں قرینے سے لگتی ہیں اور چار پانچ روز تک رونق رہتی ہے۔ ان تاریخوں میں ہر رات چراغان ہوتا ہے جس سے گنبد کا احاطہ اور اوپر کا حصہ جہاں روشنی کی جاتی ہے جگمگ جگمگ کرتا ہے۔ اس روشنی سے جو کیفیت اس مقام کی ہوتی ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، رات کو دن کا سماں نظر آتا ہے۔ ۲۴ اور ۲۵ تاریخ کی شب میں علاوہ چراغوں کے آتش بازی بھی ہوتی ہے، اس لیے ان راتوں میں اژدحام کثیر ہوتا ہے۔ گنبد کے باہر دور دور تک فرش یعنی صحنِ درگاہ پر ان کا جمع ہونا ایک قابلِ دید اور عالی شان نظارہ پیش کرتا ہے۔ یہ شخص عقیدت کے متوالے کیا ہندو، کیا مسلمان، مزار پر آکر ہر قسم کی شیرینی اور خاص کر مالیدہ فاتحہ دلواتے اور نذر چڑھا کر باہر یا تو خرید و فروخت میں مشغول ہوتے ہیں، یا سیر اور تماشے میں۔ عام لوگوں کے علاوہ ابتدائے عرس سے لے کر کل بیدر کے فقرا درگاہ کے آستانے پر آخر عرس تک جمع رہتے ہیں، ان سب کو بدھو یعنی چاول اور آٹا وغیرہ دیا جاتا ہے۔

اس درگاہ کو جس طرح مسلمان متبرک سمجھتے ہیں اسی طرح ہندو بھی اس کی عزت کرتے ہیں، بلکہ مسلمانوں سے بڑھ کر آپ کا ادب کرتے ہیں، اور آپ کی زیارت کو اپنا مذہبی فریضہ خیال کرتے ہیں اور آپ کو ولی کامل مانتے ہیں، حصول مراد کے لیے بڑے اعتقاد سے مزار پر حاضر ہو کر جھولے اور نقرئی اشیاء وغیرہ چڑھاتے ہیں۔ یہاں رسومات ادا کرنے والے ہندو مسلمانوں میں اس بات کے سوا اور کوئی تمیز معلوم نہیں ہوتی ہے کہ ہندو دعا مانگتے اور اظہار مطلب کے وقت عالم پربھو، اور مسلمان حضرت سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کہتے ہیں۔ مسلمانوں کے جس قدر

عقاید اور رسومات ہیں ہندو ان کا پورے طور پر تتبع کرتے ہیں۔ ہندو لوگ یہاں پوجا کرتے بہ حیثیت ولی ہونے اور اپنی مرادیں مانگتے اور چڑھاوا چڑھاتے ہیں۔ ہندو عورتیں یہاں قدم قدم پر سلطان احمد شاہ سجدہ کرتی ہوئی آتی ہیں، اور اسی طرح گنبد کا طواف کرتی ہیں، اور ولی بہمنی سے ہاتھ جوڑکر دروازۂ درگاہ پر کھڑی ہو کر مراد مانگتی ہیں۔ ان عورتوں کا اس بات پر دکنیوں کی عقیدت کامل یقین ہوتا ہے کہ آپ کی درگاہ میں جو دعا مانگی جائے وہ کبھی رد نہیں ہوتی، ضرور بہ ضرور قبول ہوجاتی ہے۔ عرس میں اُن ہندو مرد اور عورتوں کا جن کی مرادیں پوری ہوجاتی ہیں باجے اور چڑھاوے کے ساتھ درگاہ پر آنا ایک نہایت دلچسپ نظارہ ہوتا ہے اور اس وقت ان کا عقیدہ اور جوشِ مسرت قابلِ دید ہوتا ہے۔

ہجوم عرس میں مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کی تعداد ہوتی ہے، ان کا اس قدر جوشِ عقیدت اور قلبی ارادت کی نسبت ہندوؤں سے دریافت کیا گیا کہ آپ نے اپنے عہدِ حکمرانی میں بڑے بڑے راجاؤں کو شکستیں دیں اور کئی بت خانے تڑواکر وہاں مسجدیں بنوائیں، زندگی بھر بت پرستی کی بجائے خدائے واحد کی پرستش کی نشر و اشاعت میں کوشاں رہے۔ یہ سب باتیں ہنود کے خلاف تھیں پھر ہندو اس کثرت سے درگاہ پر عقیدت مندانہ کیوں جمع ہوتے ہیں؟ اس کا جواب انھوں نے یہ دیا کہ یوں تو یہ ایک رسم قدیم سے چلی آتی ہے، لیکن آپ کا فیض عام جو بہ منزلہ خرق عادات و کرامات ہے کیا ہندو اور کیا مسلمان سب پر یکساں محیط ہے!

زندگی میں آپ کا دل روحانی نعمتوں سے آسودہ تھا، اب بھی وہی روحانی فیض آپ کا سب پر عام ہے۔ یہ درست ہے کہ جو تصرفات اولیاء اللہ سے ظاہر ہوتے ہیں وہ اُن کی پُر زور روحانی طاقت سے ظہور میں آتے ہیں جو بشری یعنے مادّی طاقت سے افضل و اعلےٰ ہے بلکہ اس کو الٰہی طاقت سمجھنا چاہیئے۔ پس یہ بھی آپ کی کرامت ہے کہ آپ کے

بہ حیثیت ولی ہونے کے سلطان احمد شاہ ولی بہمنی سے دکنیوں کی عقیدت

مزار پر ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتفاق و اعتقاد یکساں نظر آتا ہے۔ ایک ملکی ہم درد کے لیے یہ نہایت طمانیت بخش بات ہے۔ ہر ہندو جو گنبد میں داخل ہوتا ہے وہ اپنے ساتھ مٹی کی ایک ایسی پیالی یا کُلیا بھی لاتا ہے جس میں تیل بھرا ہوا ہوتا ہے، یہ تیل چراغوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ مزار کے چار طرف چار پتلی چراغدان ہیں اور سامنے عود دان اور اس کے بازو غلے کا صندوق رہتا ہے۔ جو آمدنی آتی ہے وہ اس صندوق ڈالی جاتی ہے۔ عرس میں یہ غلہ آمدنی سے پُر ہوتا ہے۔

مزار پر تین شامیانے استادہ ہوتے ہیں جن پر ریشم کی گل کاری ہوتی ہے۔ شامیانے کے نیچے مزار پر زردوزی پنکھے شتر مُرغ کے انڈے آویزاں ہیں۔ یہ عقیدت مندوں کے نذرانے ہیں، اور بہت سی تحریری درخواستیں لٹکی ہوئی نظر آتی ہیں، ان میں یہ التجائیں لکھی ہوتی ہیں کہ "اگر میرے حسب منشاء شادی ہو جائے تو مزار پر ایک بکرا نذر چڑھاؤں گا۔" ایک کہتا ہے کہ "اگر میرا گُم شدہ بیل واپس آجائے یا مقدمے میں کامیابی ہو تو اس قدر مالیدہ کی نیاز گزرانوں گا۔" غرض کوئی اولاد کا خواستگار ہے، کوئی اپنے مرض کی شفا چاہتا ہے۔ اور کوئی قید سے رہائی مانگتا ہے۔ اور جب آپ کے کشف و کرامات اور وسیلۂ دعا سے خدا اُن کی مرادیں اور خواہشیں پوری کرتا ہے تو وہ علاوہ نقدی کے بنی مانی ہوئی منتیں چڑھا جاتے ہیں۔

آپ کے مزار پُر انوار پر ایک شان جمال برستی ہے۔ مزار پر نظر پڑتے ہی زایرین باعقیدت کے قلب کی ایک عجیب حالت ہوتی ہے۔ ورجو بیٹھ کر مراقبہ کریں تو اُن پر وہ کیفیت طاری ہوتی ہے جس سے دق و شوق بڑھتا ہے، اور وجد و سرور حاصل ہوتا ہے، اور لی خلوص اور عقیدت سے جو معروضہ آپ کی بارگاہ میں بہ غرض

استمداد و دعا گزرانا جاتا ہے وہ کبھی خالی نہیں جاتا۔ یہ خدا کی قدرت کا ایک روشن کرشمہ بہ حیثیت ولی ہونے کے
اور آپ کے ولیٔ کامل ہونے کی ایک بیّن دلیل ہے۔ عام لوگوں کا عقیدہ ہے کہ آپ کے سلطان احمد شاہ
مزار کے مرجھائے پھول اور عودی کھانے سے بیماروں کو شفا حاصل ہوتی ہے، اس طرح ولی بہمنی سے
ہزاروں مریض شفایاب ہوئے اور لاکھوں اپنی مراد سے فیض یاب ہوئے، اور دکنیوں کی عقیدت
ہو رہے ہیں۔ جس طرح آپ نے اپنی زندگی میں خلق اللہ پر رحم و کرم سے بادشاہی کی
اسی طرح اب آپ کا روحی فیضان بھی جاری ہے۔

اس میں شک نہیں کہ آپ بڑے کامل بزرگ اور صاحبِ حال تھے۔ علمِ ظاہری و باطنی میں کامل تھے۔ آپ کے حالات سے واضح ہوگا کہ آپ کو حضرت سید محمد بندہ نواز حسینیؒ سے کیسی عقیدت تھی۔ حضرت کی بیعت نے آپ کو فقر کا وہ درجہ عطا کیا کہ آپ ولیٔ کامل ہوگئے۔ آپ صرف بادشاہ ہی نہیں تھے بلکہ صاحبِ کشف و کرامات بھی تھے۔ جب آپ کی دعا سے رفع امساکِ باراں ہوا تو آپ کی ولایت کی شہرت دور دور تک پھیلی، اب تک بھی آپ کی کرامتیں برابر جاری ہیں، اور سب آپ کو ولیٔ کامل مانتے ہیں۔ دور، دور سے ہزاروں زایرین اور معتقدین آپ کے گنبد پر آتے ہیں اور دامنِ مقصود گلِ مراد سے بھر کر واپس جاتے ہیں۔

آپ کا گنبد اور دیگر گنبد ہائے سلاطینِ بہمنیہ ایسے پُرفضا مقام میں واقع ہیں جہاں کا منظر نہایت ہی خوش نما ہے۔ ہر طرف سبز کھیت ہیں۔ قرینے سے جو درخت نصب ہیں وہ اپنی بہار الگ دکھا رہے ہیں اور پانی کے نالوں اور چشموں کے بہتے رہنے سے بیدر بھر میں اس سے بہتر مقام نہیں ہے، کیوں کہ بیدر میں پانی کی قلت ہے اور یہاں چشمہ ہائے آب اور سرسبز میدان و اشجار سے جو رونق اور سہانا پن ہے وہ کسی دوسرے مقام پر بیدر بھر میں نہیں ہے۔ عرس میں تو کوئی جگہ آدمیوں سے خالی نہیں ہوتی۔ جس قدر زایرین دور دور سے آتے ہیں وہ سب میدانوں میں درختوں کے نیچے اترتے ہیں یا نہر کے بازو۔ سب لوگ یہاں کے چشموں کا پانی استعمال کرتے ہیں جو مزے میں نہایت شیریں، مفرح اور صحت بخش ہے۔

بہ حیثیت ولی ہونے کے سلطان احمد شاہ ولی بہمنی سے دکنیوں کی عقیدت

یوں تو بیدر اولیائے کرام اور فقرائے عظام کا مخزن ہے، مگر ہندو اور مسلمانوں کو ارادت قلبی اور گرویدگی جس طرح آپ سے ہے اور کسی درگاہ سے نہیں ہے، اس وجہ سے آپ کا گنبد زیارت گاہِ خلق اللہ ہے، اور عام وخاص آپ کے فیض سے بہرہ یاب ہوتے ہیں آپ کے ولی کامل ہونے کو سب تسلیم کرتے ہیں۔

شہریت کے لیے قومی اشتراکی تعلیم

فرانتس شلتسکی

اگر کوئی شخص کسی قوم کی دولت کا حساب لگانے کی کوشش کرے، اور دولت کے ذریعے اس کی حیثیت کا اندازہ قایم کرنا چاہے تو یہ ناممکن ہے کہ وہ ایک عنصر کو نظرانداز کر دے، یعنے "نوجوان" کو۔ ایک حکومت جو صرف رائے دہندہ شہری کی فلاح و بہبود کی پرواہ کرتی ہے اور نوجوان نسل کا خیال نہیں رکھتی، تاریخ ضرور ان کے کھو دینے کا الزام اس پر عاید کرے گی۔ کسی قوم کی آیندہ قسمت کا انحصار کلیتاً اس کے نوجوانوں کی صحت اور اُن کے اعلیٰ نصب العین پر ہے۔ اسی لیے قومی اشتراکی حکومت نے تعلیم کو اپنے نظام العمل میں بہت زیادہ اہمیت دی ہے تاکہ باقاعدہ طور پر اس کی تعمیر ہو۔ حکومت کا نصب العین باشعور اور باعمل جرمن شہری ہے۔

تعلیم کے نئے طریقے میں، گھر اور مدرسہ کے ماسوا، سب سے اہم چیز "ہٹلر نوجوان" "دل" کی تخلیق ہے۔ جسے دو بڑے گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کم سن (۱۰ سے ۱۴ برس تک) "ڈائیچے یونگ فوک" (المانی بچے) کہلاتے ہیں۔ بڑی عمر والے (۱۴ سے ۱۸ برس تک) حقیقی "ہٹلر نوجوان" "ہٹلر یوگینڈ" کہلاتے ہیں۔ اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ بیرونی یا سابقہ نوجوان تنظیموں کے مقابلے میں "ہٹلر نوجوان" کی امتیازی خاصیتیں کیا ہیں۔ اولاً ساری مملکت میں اپنی نوعیت کی یہی ایک تنہا اور عدیم النظیر تنظیم ہے۔ اور نوجوانوں کی ایک حکومتی تنظیم ہونے کی وجہ سے خانگی یا دوسری مذہبی جماعتوں کے مقابلے میں اس میں زیادہ تعلیمی امکانات ہیں۔ اس کی دوسری خصوصیت اس اصول پر عمل ہے کہ "نوجوانوں کی قیادت نوجوانوں ہی کو کرنا چاہیئے۔" "ہٹلر نوجوان" جماعتوں کے قائدان لڑکوں سے برابر عمر کے

کچھ زیادہ عمر کے ہوتے ہیں جن کی وہ قیادت کرتے ہیں۔ وہ اپنے سن کی وجہ سے قیادت نہیں کرتے بلکہ اپنے کردار اور اپنے عمل کے بل بوتے پر۔ میرا یہ خیال ہے کہ یہ اصول ان امتیازی خاصیتوں میں سے ایک ہے جو ہٹلر نوجوان (دل) کو دوسرے ممالک کی نوجوان فوجی تنظیموں سے ممیز کرتے ہیں جن کی قیادت جزوی طور پر فوجی افسر اور جزوی طور پر پیشہ ور استاد کرتے ہیں۔ یہ اصول، نوجوان کی تخلیقی قوتوں کو بیدار کرنے کے لیے ایک دعوت اور اس کے کردار اور احساس ذمہ داری کو مستحکم کرنے اور قومی بنانے کا ایک طریقہ ہے۔ کیونکہ جس قائد میں یہ خوبیاں نہ ہوں گی بہ حیثیت قائد کے وہ زندہ نہ رہ سکے گا۔ کردار اور احساس ذمہ داری، کیا یہ دونوں تعلیمی مقاصد برطانوی مقاصد کے مماثل نہیں ہیں؟ جو لوگ کشاف رہ چکے ہیں بہ آسانی یہ سمجھ سکیں گے کہ "ہٹلر نوجوان" ایک سادہ اور کارآمد لباس کیوں پہنتا ہے۔ یہ لباس ہر عمر کے بچوں کے لیے نیز غریب اور دولت مند دونوں کے لیے یکساں ہے اور اُن میں حقیقی ضبط اور اشتراکی اسپرٹ پیدا کر کے اُن کو متحد کرتا ہے۔ وہ ایک شخص کی جانچ اس کی قابلیتوں کے ذریعے کرنا سیکھتے ہیں نہ کہ دولت کے ذریعے۔ "ہٹلر نوجوان" کے جوشیلے قائد مزدور پیشہ جماعتوں کے نوجوانوں سے اسی طرح نکلتے ہیں جس طرح کہ فوقانی مدارس کے طلباء کی صفوں سے۔

اس میں اور دیگر نوجوان سبھاؤں سے ممیز کرنے والا فرق یہ ہے کہ "ہٹلر نوجوان دل" میں اسلحہ کا استعمال نہیں ہوتا۔ حقیقی فوجی تعلیم سے قبل اسلحہ کے استعمال کی تعلیم ہماری رائے میں بہت کم مفید ہوتی ہے بلکہ برعکس اس کے یہ حقیقی خطرے کا باعث بن سکتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ بیرونی اخبارات وثوق کے ساتھ یہ لکھتے ہوں کہ "ہٹلر نوجوان" اسلحہ رکھتے ہیں لیکن جرمنی کے خلاف یہ محض ایک پروپگنڈا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ننانوے فی صد ناظرین اخبار کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ دوسرے ممالک میں خود جا کر صحیح حالات معلوم کریں۔ نیز وہ اخبارات کی سچائی اور دیانت داری پہ اندھا ایمان رکھتے ہیں۔ شاید یہ ایک نہایت ہی قدیم جرمن عقیدہ ہے کہ ہتھیار کا رکھنا آزاد اور خود دار مردوں کا فرض تو کیا اُن کا حق ہے۔ چھوٹی عمر والوں کو یہ ثابت کرنا چاہیئے کہ وہ درحقیقت ہتھیار رکھنے کے اہل ہیں۔ ہم نوجوانوں کے اپنی قوتوں کو ترقی دینے کے حق کو تسلیم کرتے ہیں لیکن صرف چند حد تک تاکہ وہ آئندہ چل کر خطرناک نہ بن جائیں۔

"ہٹلر نوجوان" کو، جو مستقبل کی ریاست کا معمار ہے، اسی نصب العین کی روشنی میں تعلیم دینا چاہیئے۔ حال اور مستقبل کے شہری کو سیکڑوں باتیں جاننی چاہیئے تاکہ وہ اپنی قوم کے مسایل میں ایک مفید اور

دانشمندانہ حصہ لے سکے۔ اس لیے "ہٹلر نوجوان دَل" کے بچوں کو سیاسی تعلیم دی جاتی ہے اور نسلی نظریہ اور اُن خیالات کی تعلیم بھی جنھوں نے ہمیں آج اس مقام پر پہنچا دیا ہے۔ ہر لڑکے کو سیاسیات اور ثقافتی و معاشی امور کے متعلق بحث ومباحثہ لازماً کرنا پڑتا ہے تاکہ وہ جرمنی کی حکمت عملی (پالیسی) کو سمجھ سکے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں پر مدارس اور "ہٹلر نوجوان" کے وظایف کے درمیان ایک خطِ فاصل کھینچنا مشکل ہوجاتا ہے۔ ایسے وظایف جن کی اہمیت کے متعلق ایک طاقتور اور مرکزی حکومت میں مبالغہ نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں تک ثقافتی تعلیم کا تعلق ہے یہ واضح ہے کہ مدرسے کے مقابلے میں "ہٹلر نوجوان دَل" کئی اور مختلف قسم کے امکانات رکھتا ہے۔ محض اس لیے کہ لڑکے اپنے ہم عمر ساتھیوں میں زیادہ جوشِ عمل دکھلاتے ہیں۔ میں ثقافتی تعلیم کی دو مثالیں پیش کروں گا: "ہٹلر نوجوان" کے زیرِ اہتمام جرمنی کے مختلف حصوں کے سفر کے ذریعے ایک لڑکا یہ سیکھتا ہے کہ ایک قدرتی منظر کو کس زاویۂ نگاہ سے دیکھنا چاہیئے اور اسے کس طرح سمجھنا چاہیئے۔ یہ سفر ثقافتی تعلیم کے ساتھ ساتھ جسمانی تربیت کے لیے بھی مفید ہوتے ہیں۔ دوسری مثال موسیقی کی ہے جو جرمن ثقافت کا ایک اہم جزو ہے۔ بچوں ہی کی مرضی سے منعقد کردہ موسیقی کے جلسے گھریلو گانوں کی تجدید اور نئے گانوں کی تخلیق کے لیے بہت کچھ کرسکتے ہیں۔

اب یہ ایک قدرتی بات ہے کہ "ہٹلر نوجوان" کھیلوں میں ایک خاص دلچسپی لیتا ہے، تاکہ جرمن نوجوان کے معیارِ صحت کو دوبارہ حاصل کرسکے یا اسے قایم رکھ سکے۔ ہر لڑکے کی صحت پر باقاعدہ قابو رکھنے کے لیے خاص اطبّا متعین ہیں۔ بہ ہر صورت چند لڑکوں کے حیرت انگیز کارناموں کے مقابلے میں عام صحت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس لیے ہم انفرادی مقابلوں کے برخلاف جماعتی مقابلوں کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ اور ہمارا نصب العین کھیلوں میں چند نہایت ہی اعلیٰ کامیابیوں کی بجائے ایک اچھا اوسط حاصل کرنا ہے۔ "ہٹلر نوجوان" کے ان تمام وظایف پر غور کرتے ہوئے کوئی یہ پوچھ سکتا ہے کہ آیا حقیقت میں ان نوجوان بچوں کو اپنے پیشہ ورانہ کام کے انجام دینے کے لیے کافی وقت بھی مل سکتا ہے؟ اور آیا وہ اس میں کافی دلچسپی بھی لے سکتے ہیں؟ "رائشں بیروفس ویٹ کامپف" ایک سرکاری پیشہ ورانہ اور تجارتی سالانہ مقابلہ ہے جو "ہٹلر نوجوان" کے زیرِ سرپرستی ہر قسم کے پیشہ ورانہ اور تجارتی شعبوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

اُن امید داروں کو جو اس مقابلے میں بہترین نتایج حاصل کرتے ہیں، سفر وغیرہ کی شکل میں انعامات دیئے جاتے ہیں۔ طلبار بھی اس مقابلے میں حصہ لیتے ہیں۔ طلبار اور امیدوار بہتیرے سفر باہم کرتے ہیں اور اکثر بیرون ملک بھی جاتے ہیں۔ اعداد و شمار پر نظر کرنے سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ گذشتہ سالوں میں "ہٹلر نوجوان" کی سرپرستی میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے گروہوں نے بیرونی ممالک کے کئی سفر کیے ہیں۔ لڑکیوں کا اپنا ایک سیاسی نظام ہے جو ب۔ د۔ م (بونڈ ڈائچر میڈل) کہلاتا ہے اور "ہٹلر نوجوان" تنظیم کے مماثل ہے لیکن یہاں پر تعلیمی نصب العین بالکل جداگانہ ہے۔ اگرچہ سیاسی اعتبار سے وہ بالکل ایک ہی ہیں۔ لڑکیوں کو اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ آیندہ زندگی میں اپنے خاوند کی حقیقی مدد کرنا اور اس کی حقیقی رفیقۂ حیات بننا سیکھیں۔ ب۔ د۔ م۔ لڑکیوں کے لیے مناسب کھیلوں کا بھی انتظام ہے اور کئی ایسی عمل طلب سماجی دلچسپیاں ہیں جنکے ذریعے عورتوں کی ضروری خوبیوں میں سے کم از کم ایک کی تربیت ہوتی ہے، یعنے بے غرضانہ اور سمجھدارانہ اعانت کے جذبے کی۔

ہماری نوجوان سبھاؤں کے یہ اصلی مقاصد اور وظایف ہیں۔ جرمن نوجوان کی تعلیم کے سلسلے میں حکومت کا ایک اور فریضہ ہے جو نہایت اہم بھی ہے۔ یعنے لیبر سروس مزدور خیمہ گاہیں یا پڑاؤ یا مزدورگاہیں جرمنی کے تمام حصوں میں موجود ہیں۔ آلپس میں سمندر کے کنارے اور میدانوں میں ہر جگہ۔ ہر جرمن کو، اپنے والدین اور مقام پیدایش کے دور یہاں چھ ماہ لازماً کاٹنے پڑتے ہیں۔ ہر طالب علم کو پڑھائی شروع کرنے سے قبل یہ چھ مہینے گذارنے پڑتے ہیں۔ ایسے مزدور پڑاؤ (مزدورگاہ) کے جملہ مشاغل حیات کا بیان امر مشکل ہے۔ اس سے کماحقہٗ واقف ہونے کے لیے وہاں رہنے کی ضرورت ہے تاکہ گندمی جسموں کو کھلے میدان میں کھیلتے ہوئے یا کام کرتے ہوئے دیکھ سکیں۔ وہاں ضرورت اس بات کی ہے کہ طلوعِ شمس سے قبل جاگیں، تمام دن وہاں کی حیات پرور، منضبط فضا میں رہیں اور شام میں قدرتی تکان کا لطف محسوس کریں۔ میں برلن میں پیدا ہوا اور دیہات کے متعلق میری معلومات بہت ہی معمولی تھیں تاآنکہ میں جرمنی کے شمالی میدانوں میں ایک مزدورگاہ میں آیا جہاں سیاہ پس منظر کے مقابل نفیس باڑھ لگی ہوئی تھی، اور وسیع، ہموار، گنبد نما صنوبری جنگل تھے

بارکیں صاف، ستھری اور تکلفات و سامانِ تعیش سے بے نیاز تھیں، لیکن لڑکوں کے اپنے ہاتھوں سے رنگی ہوئی یا تراشی ہوئی تصویروں اور جہازوں کے نمونوں کی سادہ مگر دلکش آرائش نے ایک خوش گوار اور یگانت آمیز کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔ ایک خوب صورت کمرۂ طعام، ایک کتب خانہ، سبزہ زار اور پاکیزہ، نفیس باغات جو کھلے ریتیلے میدانوں پر بڑی محنت و مشقت کے ساتھ بنائے گئے ہیں، روح پرور مناظر پیش کرتے تھے، بگل ہر صبح پانچ بجے ہوتا ہے جولائی اور آگست میں چار بجے، تب ہم فوراً کھلی ہوا میں نکل کر تقریباً دس منٹ تک ورزش کرتے، اس طرح اعصاب کھل جاتے اور خوابیدہ اعضا بیدار ہو جاتے۔ فوراً ہر شخص منہ ہاتھ دھوتا، بستہ لپیٹتا، اور ناشتہ کرتا، یہاں تک کہ ایک گھنٹے کے بعد پورے خیمہ گاہ ہی "لیبر سروس" جھنڈے کو جب کہ وہ چڑھایا جاتا، سلامی دینے کے لیے استادہ رہتے۔ ہمارے کام کے مقامات کا راستہ بذریعۂ سیکل چھ یا دس میل تک شاداب لیکن گھنے خطرناک صنوبری جنگل میں سے گزرتا تھا۔ ہم بالعموم زمین کھود کر گڑھے بناتے جس سے زمین بہت زیادہ اچھی ہو جاتی۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ لیکن کسی کو بھی اپنی محنت کا پورا صلہ نہ ملتا۔ طاقتور لڑکے اکثر کمزور لڑکوں کی مدد کیا کرتے۔ یہ کام ایک بہترین قسم کی تربیت ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے طلبا اور امیدوار اپنے ملک کی ایک ہی قسم کی خدمت انجام دینے کے لیے باہم کام کرنے ایک جا اکٹھے ہوتے ہیں۔ کیمپ کو لوٹ کر ہم اپنا سادہ لیکن غذائیت دار کھانا کھاتے اور ایک دو گھنٹے آرام کرتے۔ سہ پہر میں اکثر ہمیں سیاسیات، تاریخ، آگ بجھانے کی ترکیبوں اور کھیلوں کے متعلق تعلیم دی جاتی۔ شام میں ہم آزاد رہتے۔ موسیقی کے جلسے کرتے یا اپنی بارکوں میں ایک ساتھ ٹھیرتے اور تراشنے یا لکھنے کا کام کرتے یا پھر گاتے رہتے۔

کھلے میدان میں ہمارے لیے ایسے کام کا انتخاب کیا جاتا کہ اس سے کسی شخص کی روزی پر اثر نہ پڑتا۔ گڑھے ایسی سڑکوں کی جانب بنائے جاتے جہاں معمولی حالات میں اُن کا بنایا جانا نفع بخش ثابت نہیں ہو سکتا۔ بایں وجہ کہ اخراجات بہت زیادہ ہو جاتے۔ اگرچہ "لیبر سروس" کا کام معمولی حالات میں اقتصادی نقطہ نظر سے قابلِ عمل نہیں ہو سکتا لیکن وہ ایک نہایت ہی مفید کام ہے۔ سیلیبیا، اور المیس لانڈ میں ہمارے کام کرنے والے نوجوانوں کی جدوجہد سے نئے دیہات

آباد ہوگئے ہیں، جن میں سیکڑوں صحت ور خاندان بسائے گئے ہیں اور ان کی ترقی کی راہیں ایسے رقبہ جات میں نکالی گئی ہیں جن کے بنجر پن سے نو وارد پہلے بہت دور بھاگتے تھے۔ اس قسم کے کام کرنے والے نوجوان اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ملک کی پوری تاریخ میں انھیں یہ پہلی مرتبہ اہمیت دی گئی ہے اور ان کا ملک اُن سے اپنے فرائض انجام دینے کی توقع رکھتا ہے۔

اکثر لوگ یہ اعتراض کریں گے کہ یہ صرف بے روزگاری دور کرنے کا ایک طریقہ ہے اور بس۔ لیکن یہ امر واقعہ نہیں ہے اس کے وظایف اس سے بہت زیادہ ہیں۔ یہ ایک جدید اقتصادی نقطۂ نظر کی ابتدا ہے اور یہ سرمایہ دارانہ تفکر کو بالکلیہ بدل رہا ہے۔ اس میں اہم نکتہ یہ ہے کہ بے روزگار ہی نہیں بلکہ ہر ایک کو "لیبر سروس" کے لیے جانا ضروری ہے۔ باستثنا اُن لوگوں کے جو جسمانی اعتبار سے اس کے قابل نہیں ہیں اس طرح چھ ماہ کے دوران میں ہر شخص کام کرتا ہے اس سے آمدنی حاصل کیے بغیر (چونکہ تین پنس فی یوم کی آمدنی آمدنی نہیں کہلائی جاسکتی)۔ گویا ایک نیا اقتصادی زاویہ نگاہ رونما ہو رہا ہے۔ ہم اپنا پسینہ بہاکر محض روٹی کمانے کی خاطر کام نہیں کر رہے ہیں بلکہ اپنی قوم اور انسانیت کی بہبودی کے لیے "قدروں" کی تخلیق کرنے اور نئے معیار پیدا کرنے کے لیے ازمنہ وسطیٰ میں یہ ایک حُسن کار کا فلسفہ تھا جو اپنے پیشے کو ایک مقدس خدمت سمجھتا تھا اور یہ اس زمانے کے بعد سے تمام بڑے آدمیوں کا فلسفہ رہا ہے۔ لیکن پھر سرمایہ داری میں یہ اکثریت کا نقطہ نظر نہ تھا۔ لیکن اب "لیبر سروس" اس رائے کو تقویت بخشے گی کہ عمدگی سے کیا ہوا کسی قسم کا کام معیار شرافت ہے نہ کہ موجب سزا۔

"لیبر سروس" کا دائمی تعلق "زمین" سے ہے؛ وہ شخص جس نے کئی مہینوں تک اپنے وطن کی زمین پر کام کیا ہو ہرگز اُس سے (وطن سے)؛ اور اُن کے اسلاف سے جو اس پر رہے ہوں، بے تعلق نہیں رہ سکتا، نہ ہی وہ اپنے وطن کے ساتھ دغا کر سکتا ہے۔ گویا اس طریقے سے "لیبر سروس" ایک ایسی تنظیم پیدا کر رہی ہے جو ایک مشقت طلب، ترقی پرور اسپرٹ کے ذریعے متحد ہے۔

مزدور پڑاؤ (خیمہ گاہوں) کے ساتھ ساتھ، اس تعلیم کے فوائد کو بھی نہیں بھلایا جاسکتا جو فوجی خدمت کی مدت کے دوران میں دی جاتی ہے جس کا نصب العین جرمنی میں ہمیشہ

تعلیمی رہا ہے۔

جامعاتی تعلیم کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب تک اکثر امور نے قطعی صورت اختیار نہیں کی ہے۔ کیوں کہ "روایتی" جرمن طالب علم اب "پرانا" ہو گیا ہے، نیز چونکہ نئے طالب علم کی تعلیم میں وہ روایات اور پختگی اور تجربہ موجود نہیں ہیں جن کی خواہش کی جاتی ہے۔

نتیجتاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے طلباء "لیبر سروس" میں سے گذرنے کے بعد آج سابقہ نسل کی فرقہ وارانہ حقوق طلبی اور فرقہ وارانہ جماعتوں کی مطلق پروا نہیں کرتے بلکہ برخلاف اس کے وہ اب سیاسی اور حکمیاتی (سائنٹیفک) مشاغل میں زیادہ دلچسپی اور حصہ لیتے ہیں۔

مترجمہ **محمد علی** بی ایس سی ایم اے (عثمانیہ)

ناول اور افسانے

بنی اسرائیل کا چاند: مصنفہ رائڈر ہیگرڈ مترجمہ عبدالمجید حیرت بی، اے علیگ۔ فرعون کا دورِ حکومت شہزادہ سیتی ولیعہد سلطنت کی عدل وانصاف کے لیے معزولی عبرانیوں پر مظالم ایک عبرانی لڑکی میرآپی کے حیرت انگیز کارنامے مصر پر خدائے بنی اسرائیل کی طرف سے پے درپے مختلف قسم کی وبائیں۔ بنی اسرائیل کی آزادی فرعون کا معہ لشکر غرقابی۔ سیتی و میرآپی کے تعلقات کی دلگداز داستان قیمت مجلد عہ

میدانِ عمل: ملک کے مشہور و معروف ادیب منشی پریم چند کا بے نظیر ناول میدانِ عمل ہیں ملک کی موجودہ بیداری بے چین روح کی ایک جھلک ہے اس ناول کے افرادِ ملک کے وہ زندہ انسان ہیں جو محبت کرنے اور محبت کی آگ میں اپنا سب کچھ جلا کر خاکستر کر دینے کے اہل ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں ہندوستان کا مستقبل ہے اور ان کے کارناموں پر کروڑوں انسانوں کی فلاح کا بار۔ قیمت مجلد عہ

بیوہ: منشی پریم چند آنجہانی نے ایک بیوہ کے حالات دردناک پیرایہ میں لکھے ہیں۔ ایک بیوہ کی ترغیبات اس کی الجھنوں اور ان سے حاصل کرنے کی کوششوں کو بہترین پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے کہ ایک بیوہ کو کیسی زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ قیمت مجلد عہ

واردات: منشی پریم چند جادو نگار قلم کے ۱۳ تازہ ترین افسانوں کا مجموعہ۔ یہ افسانے ہماری معاشرت اور سماج کی تصویر ہیں جو افسانوں کی شکل میں منشی صاحب آنجہانی نے پیش کی ہیں۔ کاغذ، طباعت اعلیٰ تقریباً ۲۰۰ صفحات قیمت مجلد عہ

کیمیا گر: پروفیسر محمد مجیب صاحب بی، اے آکسن کے مختلف افسانوں کا مجموعہ طباعت وغیرہ خوبصورت۔ یہ افسانے اعلیٰ اور ستھرے مذاق کے طبقے میں عموماً پسند کیے گئے ہیں قیمت عہ

دامنِ باغبان: مشہور ادیب صحافت نگار جناب ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی کے منتخب اصلاحی افسانوں کا نہایت قابلِ قدر مجموعہ۔ ہر افسانہ ایک مستقل پیام ہے اور ہر لحاظ سے کامیاب طباعت وغیرہ عمدہ و نفیس۔ قیمت عہ

اصنامِ خیالی: جلیل احمد صاحب قدوائی کے افسانوں کا مجموعہ مغربی افسانہ نگاروں کے بعض چیدہ چیدہ افسانوں کا تراجم قیمت عاہ

ادھورا خواب و دوسرے افسانے: مشہور ادیب سید سجاد حیدر صاحب یلدرم کے دلفریب افسانوں کا مجموعہ قیمت ۸؍

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور